خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

ستمبر 2020

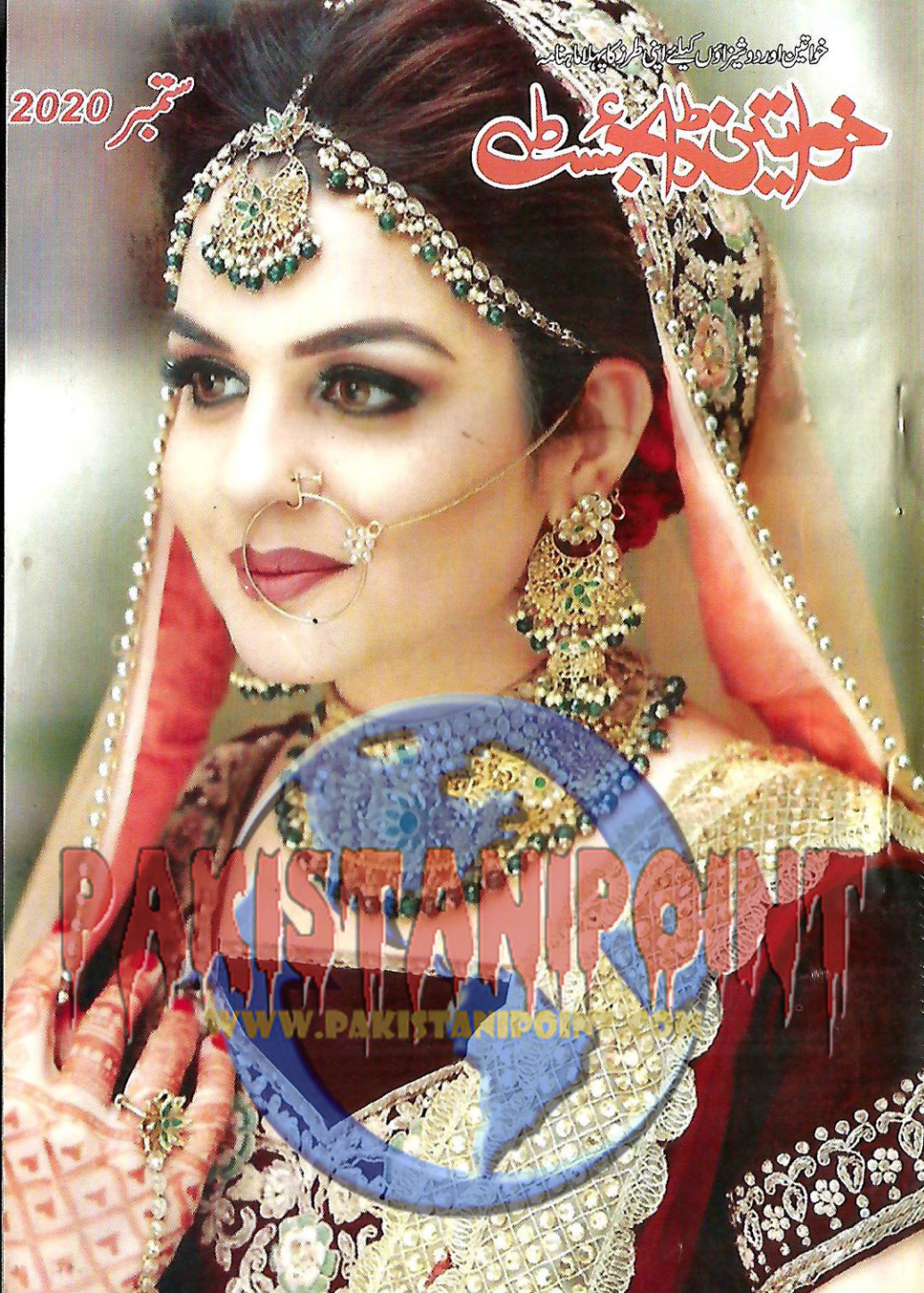

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

ستمبر 2020
کے شمارے کی ایک جھلک

ستمبر 2020
کا شمارہ شائع ہو گیا

- ''چھاؤں جیسے لوگ'' شفق افتخار کا مکمل ناول،
- ''سفر'' ماریہ نواز کا مکمل ناول،
- ''وہ نازنین'' فرح بخاری کا ناولٹ،
- ''خلش'' عائشہ نصیر احمد کا ناولٹ،
- زرقا سکندر، جویریہ مریم، حمیرا عروش، شازیہ الطاف اور راؤ سمیرا ایاز کے افسانے،
- ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' قارئین کے تجربات،
- ''خط آپ کے'' آپ کے دلچسپ تبصرے اور ہمارے جواب،
- ''بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا'' آمنہ زرین کا تبصرہ،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں'' احادیث کا سلسلہ،
- تاریخ کے جھروکوں سے، باتوں سے خوشبو آئے، آئینہ خانہ میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع ستمبر 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

بانی و مدیر اعلیٰ ــــ محمود ریاض

مدیرہ ــــ نادرہ خاتون

مدیر ــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ــــ عدنان

اشتہارات ــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ــــ نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

ستمبر 2020

جلد 48 شمارہ 5

قیمت 70 روپے

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 840/- روپے

ایشیاء، افریقہ، یورپ .... 7000/- روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. 8000/- روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

کہنی سُننی — مدیر 10
کرن کرن روشنی — ادارہ 11
ہمارے نام — نادرہ خاتون 29

آپ سے کیا پردہ

خاموش رہو — انشاجی 16

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور 236

مجھ سے ملئے

باتیں احمد طہٰ غنی سے — شاہین رشید 17

انٹرویو

خرم سہیل سے ملاقات — شاہین رشید 24
خواتین رائٹرز کی کہانی — عمار مسعود 22
خامشی کو زباں ملے — ادارہ 248

ناول

تتلی جیسا پیار — راحت جبیں 32
حالم — نمرہ احمد 192

مکمل ناول

من کا پپیہا — گل ارباب 120
خواب، سیراب، گلاب — نسیم سحر قریشی 88

ناولٹ

ہارے بھی تو بازی — شازیہ جمال طارق 66
انوکھا لاڈلا — حنا بشریٰ 164

افسانے

قصہ ایک ساون کا — فاخرہ جبیں 162
خواب سفر — شازیہ الطاف ہاشمی 52
تلافی — حمیرا عروش 62
خستہ جگر — شمیم رانی 84
بیٹی کے نام — فائزہ بھٹی 159
شرمندگی — منزہ بھٹی 117
قصہ کہانی کا — جویریہ مریم 226

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ — شگفتہ حیاء — 232

خبریں و بریں — واصفہ سہیل — 250

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 135

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — 252

موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 254

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 256

نظمیں غزلیں

غزل — عرفان ستار — 230

غزل — اتباف ابرک — 230

نظم — ن۔م — 231

غزل — احمد سلمان — 231

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 258

PAKISTANIPOINT

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیرہ

خواتین ڈائجسٹ ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اس بار کراچی میں گرمی معمول سے زیادہ پڑی۔ گرمی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ کراچی کی سمندری ہوائیں بھی ساکن تھیں، حبس کا تو وہ عالم تھا کہ لوگ بارش کی دعا مانگ رہے تھے۔ لوڈ شیڈنگ کا عذاب جھیلتے ہر لب پر یہی دعا تھی کہ باران رحمت برسے اور اس گرمی سے نجات ملے۔

بارش جو اللہ کی رحمت ہے۔ اہل زمین کے لیے زندگی کی نوید ہے۔ بارش نہ ہو تو زمین سے حیات ختم ہو جائے۔ قدرت مہربان ہوئی۔ باران رحمت برسا اور خوب برسا۔ پیاسی دھرتی سیراب ہوئی۔ درخت، پھول، پتے، سبزہ بارش میں نہا کر نکھر گئے۔ پرندے جو گرمی سے نڈھال تھے، ان میں زندگی لوٹ آئی۔ لیکن ہمارے اداروں کی نااہلی اور ناقص کارکردگی نے قدرت کی اس مہربانی، اس رحمت کو ہمارے لیے زحمت بنا دیا۔

محکمہ موسمیات کی جانب سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس بار بارشیں معمول سے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کے باوجود انتظامات نہیں کیے گئے۔ نالوں کی صفائی پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ بہت سے نالوں پر تعمیرات بھی ہو چکی ہیں۔

ابتدائی پندرہ منٹ کی بارش میں ہی شہر کی سڑکیں تالاب کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ نالوں کا سارا کچرا سڑک پر تھا۔ آدھا شہر پانی میں ڈوبا نظر آیا۔ آدھا اس لیے کہ ابتدا میں بارش آدھے شہر میں ہوئی تھی۔ کراچی اتنا پھیل چکا ہے کہ یہاں پورے شہر میں ایک ہی وقت میں بارش نہیں ہوتی اور بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی بجلی کا غائب ہو جانا تو معمول کی بات ہے اور کراچی کے شہری اس کے عادی ہیں۔

بارشوں سے شہر کا نظام زندگی تقریباً ایک ہفتہ معطل رہا۔ سڑکوں پہ پانی جمع ہو جانے سے لوگ گھروں میں محصور رہے۔ بہت سے علاقوں میں تو اب بھی پانی کھڑا ہے اور بجلی اب تک غائب ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ کراچی کے عوام کے ووٹوں سے منتخب شدہ میئر کراچی اس دوران کہیں نظر نہیں آئے۔ اطمینان سے گھر بیٹھے رہے۔

کراچی پاکستان کا معاشی حب ہے۔ اس کے شہری سب سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں۔ بارشوں سے ان کو ناقابل تصور نقصان پہنچا ہے۔ گھروں اور گوداموں میں پانی داخل ہونے سے ان کا کروڑوں کا نقصان ہو گیا ہے۔

اس خرابی کی بڑی وجہ نکاسی آب کے نظام کا نہ ہونا ہے۔ شہر میں نکاسی آب کے نظام پر کبھی توجہ ہی نہیں دی گئی۔ عام حالات میں گٹر ابلتے رہتے ہیں تو غیر معمولی صورت حال میں تو یہ ہونا ہی تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کراچی کے شہری اب سنجیدگی سے سوچیں کہ ان کے شہر کے ساتھ پچھلی تین دہائیوں سے جو ہو رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ اس مسئلے کو کراچی کے عوام ہی حل کر سکتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں قائداعظم محمد علی جناح کی برسی ہے۔ 11 ستمبر 1948ء میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے ہمیں پاکستان کا تحفہ دیا۔ جو ہمارے لیے جائے پناہ ہے۔ ہمیں آج قائداعظم جیسے لیڈر کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- گل ارباب کا مکمل ناول۔ من کا پپیہا،
- نسیم سحر قریشی کا مکمل ناول۔ خواب، سراب، گلاب،
- شازیہ جمال طارق اور حنا بشریٰ کے ناولٹ،
- راحت جبیں اور نمرہ احمد کے ناول،
- فاخرہ جبیں، شازیہ الطاف ہاشمی، حمیرا عروش، شمیم رانی، منزہ بھٹی، جویریہ مریم اور فائزہ بھٹی کے افسانے،
- باصلاحیت صحافی اور میزبان خرم سہیل سے ملاقات،
- معروف فنکار احمد طہٰ غنی سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حدود الٰہی میں سفارش کرنے کی حرمت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''بدکار عورت اور بدکار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور ان دونوں پر اللہ کے دین کی تعمیل میں تمہیں رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔'' (النور 2)

فائدہ آیت:

(1) اس آیت میں جن بدکار مرد و عورت کا ذکر ہے، غیر شادی شدہ ہیں کیونکہ شادی شدہ بدکار مرد اور عورت کے لیے حد ''رجم'' ہے۔ زنا کی اس سزا اور شادی و غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا میں فرق پر تمام صحابہ اور فقہائے امت کا اتفاق ہے، یعنی امت کا اجماع ہے۔

(2) اس سزا کے نفاذ میں نرمی اور مداہنت ایمان کے منافی ہے، جب ایسا ہے تو جو لوگ سرے سے ان اسلامی سزاؤں کو (نعوذ باللہ) وحشیانہ قرار دیتے ہیں، ان کے دلوں میں ایمان کس درجے میں باقی رہے گا۔ بہرحال ایمان، دین میں صلابت و استقامت اور نفاذ احکام اسلام میں مخلصانہ وصدق دلانہ کوششوں کا متقاضی ہے۔

چوری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کی ایک مخزومی عورت (کے معاملے) نے، جس نے چوری کا ارتکاب کرلیا تھا، پریشانی میں مبتلا کردیا تو انہوں نے (آپس میں) کہا ''کون ہے جو اس عورت کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرے؟''

چنانچہ انہوں نے کہا کہ ''اس کی جرأت تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی کرسکتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت اسامہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(اے اسامہ!) کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا۔

''تم سے پہلے لوگوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں کوئی بلند رتبہ آدمی چوری کر لیتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور کوئی کمزور آدمی چوری کر لیتا تو اس پر حد قائم کر دیتے تھے، اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو ضرور میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔'' (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا۔

''کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟''

تو حضرت اسامہ نے کہا ''اے اللہ کے رسول! میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے۔''

راوی حدیث بیان کرتے ہیں ''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی بابت حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔''

فوائد و مسائل:۔

(1) حد، وہ سزا ہے جو شریعت کی طرف سے مقرر ہے، اس میں کسی کو کمی بیشی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، جیسے چوری کی حد، قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے۔ زنا کی حد سو کوڑے یا رجم ہے۔ شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہے، وغیرہ۔

(2) ان میں کسی کو سفارش کرنے کا بھی شرعاً حق حاصل نہیں ہے اور نہ سفارش سے ان کی معافی ہی ممکن ہے۔

(3) نفاذ حدود میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ جو بھی قابل حد جرم کا ارتکاب کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت، اس پر حد کا نفاذ ہوگا۔

(4) کوئی کتنا بھی بلند رتبہ ہو، حد سے مستثنیٰ نہیں، اقامت حد میں ادنیٰ و اعلا کی کوئی تمیز نہیں۔

(5) گزشتہ امتوں کے احوال و وقائع سے عبرت و موعظت حاصل کرنی چاہیے تاکہ ایسے افعال سے اجتناب کیا جا سکے جو ان کی تباہی کا باعث ہوئے۔

(6) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کا مقام و مرتبہ ثابت ہوتا ہے۔

راستے، سایہ دار جگہ، پانی کے گھاٹوں اور اس قسم کے دیگر جگہوں میں قضائے حاجت کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں، پس تحقیق، انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔'' (الاحزاب۔58)

فائدہ آیت:۔

مذکورہ جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنا یقیناً ایذا کا باعث ہے اور مومنوں کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے۔ اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ جس طرح گرمی میں سایہ دار جگہ کی اہمیت ہے، سردی میں دھوپ والی جگہ کو وہی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے موسم کے اعتبار سے ان جگہوں کا غلط استعمال گناہ کا باعث ہوگا بشرطیکہ وہ دھوپ والی جگہ لوگوں کے لیے بیٹھنے کے لیے ہو یا ان کی گزرگاہ ہو۔

دو کام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''دو لعنت کا سبب بننے والے کاموں سے بچو۔''

صحابہ نے عرض کیا۔ ''وہ لعنت والے دو کام کون سے ہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''وہ شخص جو لوگوں کے راستے میں یا ان کی سایہ دار جگہ میں قضائے حاجت کرے۔'' (مسلم)

فائدہ:۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کاموں سے اجتناب ضروری ہے جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچے۔ مذکورہ جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے تکلیف کے علاوہ یہ اندیشہ بھی ہے کہ ایسی جگہوں پر غلاظت یا نجاست سے وبائی امراض پھوٹ پڑیں، اس لیے نظافت کے اعتبار سے بھی مذکورہ کاموں سے بچنا ضروری ہے۔

باپ کے، اپنی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کراہت کا بیان

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور جا کر عرض کیا کہ ''میں نے اپنے اس بیٹے کو بطور عطیہ ایک غلام دیا ہے جو میرا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔ ''کیا تو نے اپنی سب اولاد کو اس کی مثل عطیہ دیا ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''نہیں۔''

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تب اسے اس سے واپس لے لو۔''

ایک اور روایت میں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

''کیا تو نے ایسا اپنی تمام اولاد کے ساتھ کیا؟''

انہوں نے کہا۔ ''نہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔''

چنانچہ میرے باپ واپس آئے اور وہ دیا ہوا صدقہ (عطیہ) واپس لے لیا۔

ایک اور روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

''اے بشیر! کیا اس کے علاوہ بھی تیری اولاد ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''ہاں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''کیا تو نے ان سب کو اس کی مثل عطیہ دیا ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''نہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تب تو مجھے اس پر گواہ مت بنا، اس لیے کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔''

ایک اور روایت میں ہے۔

''تو مجھے ظلم پر گواہ مت بنا۔''

ایک اور روایت ہے۔

''تو میرے علاوہ کسی اور کو اس پر گواہ بنا۔''

پھر فرمایا۔ ''کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ ساری اولاد تیرے ساتھ نیکی کرنے میں برابر ہو؟''

انہوں نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''پھر یہ کام نہ کر (یعنی صرف ایک بیٹے کو عطیہ نہ دے) (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:۔

(1) ہر اقدام کی بابت اہل علم اور ماہرین شریعت سے دریافت کیا جائے۔

(2) والدین کو چاہیے کہ وہ اولاد کے درمیان عدل و مساوات کا اہتمام کریں۔ کسی ایک بچے کے ساتھ ترجیحی سلوک سے دوسرے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور بعض دفعہ وہ اس ناانصافی سے تنگ آ کر گھر چھوڑ جاتے ہیں جس سے وہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں۔ والدین کے لیے بھی یہ چیز پریشانی کا باعث بنتی ہے اور خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

(3) یہ حدیث ان علماء کی بھی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اولاد میں کوئی فرق نہ کرے بلکہ سب کو برابر کا حصہ دے۔

تین دن سے زیادہ میت پر سوگ

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس، جس وقت کہ ان کے والد حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی وفات ہوچکی تھی، حاضر ہوئی۔ انہوں نے ایک خوشبو منگوائی، جس میں زرد رنگ کی خلوق یا کوئی اور خوشبو ملی ہوئی تھی۔ اس میں سے کچھ ایک لونڈی کو لگائی، پھر اسے اپنے رخساروں پر مل لیا اور کہا۔

''اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی کوئی حاجت نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا ''کسی عورت کے لیے، جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہے، جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، مگر خاوند پر چار مہینے دس دن سوگ کرنا جائز ہے۔''

حضرت زینب فرماتی ہیں کہ میں پھر حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس گئی جب کہ ان کے بھائی وفات پاگئے تھے۔ انہوں نے خوشبو منوائی اور اس میں سے کچھ لگائی، پھر فرمایا۔

''خبردار! اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی کوئی حاجت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا۔

''کسی عورت کے لیے، جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہے، جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، مگر خاوند پر چار مہینے دس دن سوگ کرنا جائز ہے۔'' (بخاری و مسلم)

اذان دینے والے کی فضیلت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''اذان دینے والے قیامت کے دن دیگر تمام لوگوں سے لمبی گردن والے ہوں گے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

اس سے اذان کی فضیلت واضح ہے۔ اذان، اللہ کی عبادت اور خیر کی طرف بلانے کا نام ہے۔ جتنے لوگ موذن کی اذان سن کر نماز پڑھنے آئیں گے، موذن کو بھی ان سب نمازیوں کی نمازوں کے برابر ثواب ملے گا۔ کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''جو خیر کی طرف رہنمائی کرے گا تو اس کو بھی اس خیر کے عمل کرنے والے کی مثل اجر ملے گا۔'' (صحیح مسلم، الامارۃ، حدیث: 1893) اسی لیے میدان حشر میں وہ تمام لوگوں میں ممتاز ہوگا کہ اس کی گردن سب سے لمبی ہوگی۔

اذان کی اہمیت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان ہوا خارج کرتا ہوا پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے تاکہ اذان کی آواز نہ سنے اور جب اذان پوری ہوجاتی ہے تو (واپس) آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تکبیر کہی جاتی ہے تو پھر پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے پھر جب تکبیر پوری ہوجاتی ہے تو (پھر) آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اور اس کے نفس کے درمیان وسوسے ڈالتا ہے۔ کہتا ہے: فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر۔ وہ چیزیں جو اس سے پہلے اسے یاد نہ تھیں، یہاں تک کہ آدمی کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ اسے پتا نہیں چلتا کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور اذان سے کراہت شیطان کا فعل ہے۔

2۔ دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ نماز میں خشوع و خضوع کا اہتمام ضروری ہے تاکہ شیطان

لی [illegible] اندازی کونا کام بنایا جا سکے۔

اذان کا جواب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جس طرح موذن کہتا ہے پھر مجھ پر درود پڑھو، اس لیے کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر تم اللہ سے میرے لیے وسیلے کا سوال کرو۔ بے شک یہ جنت میں ایک بلند درجہ ہے۔ یہ اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ چنانچہ جو شخص میرے لیے وسیلے کا سوال کرے گا، اس کے لیے (میری) شفاعت حلال ہو جائے گی۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس وقت اس کے معنی رحمت و مغفرت کے، فرشتوں کی طرف ہو تو مغفرت طلب کرنے کے اور بندوں کی طرف ہو تو دعا [illegible] کے ہوتے ہیں۔

2۔ [illegible] لغوی [illegible] قرب [illegible] کے ہیں، یا وہ [illegible] اور [illegible] اذان [illegible] تک [illegible] لیکن یہاں اس [illegible] اللہ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جائے گا۔

3۔ [illegible] کے معنی ہوتے ہیں۔ خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر کرنے کے یا کسی سے کسی کے لیے خیر کی درخواست کرنا۔ حدیث میں اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حق شفاعت ہے جس کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی مغفرت کی درخواست کریں گے جن کی بابت اللہ کی طرف سے اجازت ملے گی۔

4۔ اس میں ایک تو اس امر کی ترغیب ہے کہ اذان سننے والا بھی کلمات اذان ادا کرتا رہے، البتہ حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ دوسرے، اذان کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور پھر دعائے وسیلہ، تو ایسے شخص کے لیے شفاعت واجب ہو جائے گی، بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان و توحید پر ہو۔

اذان کا جواب

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جس طرح موذن کہتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

گناہوں کی معافی

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس شخص نے اذان سن کر کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ کے رب ہونے پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں تو اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس میں دعائے وسیلہ کے علاوہ ایک اور دعا ہے، اسے بھی پڑھنا چاہیے۔

دعا کی قبولیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اذان اور تکبیر کے درمیان کی گئی دعا رد نہیں جاتی۔'' (اس روایت کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

☆☆

خاموش رہو

انشاجی

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ، کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو، ہاں اے لوگو خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں، زہر کا اک پیالا بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا، پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پر چڑھو، خاموش رہو

ان کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو، خاموش رہو

محبس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگھیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشاجی، لو دھاگا اور لب سی لو، خاموش رہو

معروف فنکار

باتیں احمد طہٰ اغنی سے

شاہین رشید

1۔اصلی نام؟
احمد طہٰ اغنی۔
2۔پیار کا نام؟
کوئی نہیں۔
3۔تاریخ پیدائش/سال؟
28 جولائی/1990۔
4۔قد/ستارہ؟
پانچ فٹ گیارہ انچ/LEO(اسد)۔
5۔مادری زبان؟
پنجابی۔
6۔بہن بھائی/آپ کا نمبر؟
ہم دو بھائی اور ایک بہن ہے اور میرا نمبر آخری ہے۔
7۔شادی؟
جی۔ہو چکی ہے۔
8۔تعلیم؟
بیچلر آف مینجمنٹ و دمیجران فنانس۔
9۔شوبز میں آمد؟
بچپن سے شوق تھا۔ اس فیلڈ میں مجھے ''حسن وقاص رعنا'' لے کر آئے اور یوں فلم ''یلغار'' سے فنی زندگی کا آغاز ہوا اور گھر والوں کی فل سپورٹ تھی۔
10۔پہلا ڈرامہ/شہرت؟
''جان ہتھیلی پر''، ''جو تو چاہے'' نے مجھے شہرت دی۔
11۔پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟
پہلی کمائی 475 آسٹریلین ڈالر تھے۔ جس سے اپنی ماں کے لیے گولڈ کا بریسلیٹ لیا تھا۔
12۔شوبز کے علاوہ آپ کی مصروفیات؟
شوبز کے علاوہ میں اپنی تین کمپنیز کا چیف فنانس آفیسر بھی ہوں۔
13۔آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟
صبح نو بجے۔
14۔صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟
دہی۔
15۔کیا برداشت نہیں ہوتا۔ بھوک یا غصہ؟
نیند برداشت نہیں ہوتی۔ باقی دونوں چیزوں میں بہت صبر ہے، الحمدللہ۔
16۔پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟
ایک خوش حال ملک جس میں عدل اور انصاف سب سے زیادہ ضروری ہو اور سب برابر ہوں۔

17۔سیاست میں کون پسند ہے؟
میں اینٹی پولیٹیکل ہوں۔ سیاست سے بہت دور رہتا ہوں۔
18۔کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟
کسی کی نہیں۔ مجھے اپنا ملک بہت عزیز ہے اور ساری زندگی یہاں ہی رہنا چاہتا ہوں۔
19۔لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟
لاک ڈاؤن بہت اچھا تھا۔ فل فیملی ٹائم تھا۔ گھر والوں کے ساتھ گزارا۔
20۔شوبز میں کیا اچھا اور کیا برا ہے؟
ہماری انڈسٹری ابھی بھی وہاں نہیں ہے جہاں اس کو ہونا چاہیے تھا۔ اگر ہم صلاحیت اور گنجائش کی بات کریں، بہت ٹیلنٹ ہے مگر کوئی پراپر اسٹرکچر نہیں ہے انڈسٹری کا۔ بس پلس پوائنٹ ہمارے فینز کا ہم سے پیار ہے۔
21۔کھیلوں سے لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟
مجھے ایکسرسائز کرنا بہت پسند ہے اور مجھے اسپورٹس میں کرکٹ بہت پسند ہے۔
22۔زندگی سے کیا سیکھا؟
کہ فیملی سے زیادہ اہم کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

23۔ایک نصیحت جو اپنے ہم عمروں کو کرنا چاہیں گے؟
زمانے کی پروا مت کریں، وہ موسم کی طرح بدلتا ہے۔
24۔گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ سیریل بہت پسند آیا؟
انگلش سیریز Breaking Lead۔
25۔پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟
بالکل نارمل سا تجربہ تھا۔ کچھ اسپیشل نہیں لگا۔
26۔تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟
مجھے اکیلے رہنا اچھا لگتا ہے۔
27۔دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟
جب بھی میں اللہ پاک کے سارے نام سنتا ہوں۔
28۔کیا مارننگ شوہوتے چاہئیں؟
بالکل ہونے چاہئیں۔
29۔گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ اور پیار کس سے ملا؟
سب ہی بہت پیار کرتے ہیں لیکن مما سب سے زیادہ کرتی ہیں اور ڈانٹ بھی ان ہی سے زیادہ پڑی ہے۔ مگر میں نے ڈانٹ کے موقع کم دیے ہیں۔
30۔بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟
بالکل بھی نہیں..... لیکن چونکہ گھر میں سب سے چھوٹا ہوں تو خیال بھی ایکسٹرا رکھا جاتا ہے۔
31۔اب تک کیے گئے ڈراموں اور فلموں کی تعداد؟
میں نے ابھی بہت زیادہ کام نہیں کیا۔ لیکن جتنا کیا وہ تقریباً چھ سے آٹھ مہینے اسکرین پر آن ایر رہا۔ ان میں ''جان ہتھیلی پر''، ''جو تو چاہے'' اور ''قربتیں'' جو آن ایر ہے اور ایک فلم کی ''یلغار'' کے نام سے۔
32۔رومانٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا نگیٹو؟
دونوں ہی آسانی سے کر لیتا ہوں مگر زیادہ شوق سے میں نگیٹو رول کرتا ہوں۔
33۔ادب سے لگاؤ ہے؟ کس کو زیادہ پڑھتے

ہیں؟

زیادہ ٹائم نہیں ملتا...... مگر میں زیادہ تر سائنس فکشن پڑھتا ہوں اور مجھے George Orwell کی کتابیں پسند ہیں۔

34۔کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟

اللہ کا شکر ہے ابھی تک تو نہیں...... آئندہ کے لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

35۔کچن سے لگاؤ...... کیا اچھا پکا لیتے ہیں؟

کوکنگ کا ہلکا پھلکا شوق ہے اور اسنیکس اچھی بنا لیتا ہوں۔

36۔رونا آتا ہے: جب؟

جب میں زندگی کے اصل مقصد کے بارے میں سوچتا ہوں۔

37۔ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟

فوج میں جانے کی خواہش۔

38۔کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟

اپنی فیملی کے لیے۔

39۔ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟

کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی آخری اور مستقل جگہ کے بارے میں ضرور سوچ لینا۔

40۔آپ کو نفرت ہے؟

ان لوگوں سے جو بچوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

41۔ڈنر پر گئے، بل کی ادائیگی پر والٹ غائب؟ کیا کریں گے؟

فون کر کے ڈرائیور سے منگوا لوں گا۔

42۔ڈرائیونگ کے وقت کون سا گانا زیادہ سنتے ہیں؟

مجھے آر اینڈ بی اور Soul میوزک کار میں سننا بہت پسند ہے۔

43۔ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک، کس پہ زیادہ یقین ہے؟

ڈاکٹرز پہ۔

44۔پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟

کھانے پینے کی چیزیں۔

45۔کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟

نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں لوگوں کو صرف ایک موقع دیتا ہوں۔

☆ محفل میں بیٹھ کر موبائل استعمال کرنے والوں کو کیا کہیں گے؟

میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں تو خود ان میں سے ایک ہوں۔

46۔موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟

بالکل بھی نہیں۔

47۔ملک سے باہر جانے کی آفر آئے تو؟

تو ضرور کروں گا۔

48۔غصے میں آپ کا رویہ؟

خاموش ہو جاتا ہوں۔

49۔ٹی وی ٹاک کے بہترین اینکر؟

کامران خان۔

50۔ نصیحت جو بری لگتی ہے؟
اپنی نیند کم کریں۔
51۔ جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل..... کیا بہتر ہے؟
سنگل اکاؤنٹ سیف ہوتا ہے۔
52۔ ایک ڈیٹ جو آج تک یاد ہے؟
ایک نہیں، مجھے اپنے گھر والوں کی سالگرہ کی سب تاریخیں یاد ہیں۔
53۔ ایک کھانا جو اپنی ٹائم کھا سکتے ہیں؟
بریانی۔
54۔ اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟
اردو وکیبلری پہ بہت کام کرنا ہے۔ اردو کمزور ہے میری۔
55۔ اپنا ڈراما دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟
کہ یہ سین اور اچھا ہو سکتا تھا۔
56۔ کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے
ڈسکوری چینل۔
57۔ پہلی فلم جو سینما ہاؤس میں دیکھی؟
الہ دین اینی میٹڈ۔
58۔ پکانا یا کھانا..... کیا پسند ہے؟
کھانا کھانا پسند ہے۔
59۔ کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟
بیٹ مین کا۔
60۔ آپ کا ناقابل فراموش کردار؟
کیپٹن آصف فلم یلغار۔
61۔ کسی رول کو کرنے سے انکار کیا؟
فلم میں سائیڈ رول کرنے سے انکار کیا۔ دو فلم میں سائیڈ رول کی آفر تھی۔
62۔ کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟
جنرل ایوب خان کا رول۔
63۔ چاند پر پہنچ کر دنیا میں سب سے پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟
نریندر مودی کو۔
64۔ آپ کی فیوچر پلاننگ؟
فیوچر تو صرف اللہ ہی جانتا ہے لیکن میں لوگوں کی فلاح کے لیے بزنس آرگنائزیشن بنانا چاہتا ہوں۔
65۔ بچوں کے ہاتھوں میں موبائل، لمحہ فکریہ یا وقت کا تقاضا؟
اگر فزیکل ایکٹیویٹی اور ورچوئل ایکٹیویٹی بیلنس رہے تو دونوں مفید ہیں۔
66۔ پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟
Andoor لاہور والی۔
67۔ آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟
کام کی وجہ سے زیادہ دینا پڑتا ہے۔
68۔ کیا شادی کرنا ضروری ہے؟
جی بالکل۔ مگر صرف اس شرط پر کہ دونوں پارٹنرز میں انڈرسٹینڈنگ بہت زیادہ ہونی چاہیے، ورنہ صحیح پارٹنر کے انتظار میں زندگی گزاری جائے تو وہ بھی منظور ہے۔
69۔ اپنا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟
ویسے تو کل کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مگر یہ احساس ضرور ہوا کہ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت والدین ہوتے ہیں۔
70۔ سگنل پر کھڑے ہو کے کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟
کہ ہم بہ حیثیت قوم کہاں کھڑے ہیں۔
71۔ بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے۔ فلم یا، ٹی وی کے؟
معین اختر۔
72۔ خواتین رائٹرز میں کون پسند ہیں؟
بہت ہیں۔ نام نہیں لوں گا، جانب داری ہو جائے گی۔
73۔ بچپن میں کون سے گیمز کھیلتے تھے؟

بیس بال، باسکٹ بال، کرکٹ، ٹینس اور اسکوائش کھیلتا تھا۔

74۔شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو پہلے کس کا خیال آتا ہے؟

والٹ کا۔

75۔کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟

نہیں.....کبھی نہیں۔

76۔کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟

نہیں۔میں دوسروں کی پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا ہوں۔

78۔کبھی تنہائی میں کسی کو یاد کر کے روئے؟

نہیں۔الحمدللہ ایسا موقع زندگی میں نہیں آیا۔

79۔کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟

جی بالکل۔مگر کبھی بھی کسی نے مطمئن نہیں کیا۔

80۔اگر آپ کو کسی سیلیبریٹی کا انٹرویو کرنا پڑے تو کس کا کریں گے؟

Al Pacino (ال پکینو) کا۔

81۔نیند کتنی پیاری ہے؟

سب سے زیادہ۔

82۔آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں ہے یا آنا چاہتا ہے؟

کوئی بھی نہیں اور نہ ہی کسی کو شوق ہے اس فیلڈ میں آنے کا۔

83۔بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟

پراپرٹی۔جائیداد۔

84۔شادی میں کس رسم کے خلاف ہیں؟

مجھے سب رسمیں پسند ہیں۔کیونکہ سب کی اپنی خاص کلچرل ویلیو ہے۔

85۔ٹی وی کا کوئی ایسا پروگرام جو بند ہو جانا چاہیے؟

میرے خیال میں کوئی نہیں۔سب کی اپنی پسند ہے، ہر پروگرام کو دیکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔

86۔آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟

دونوں کی نہیں۔مگر فیصلہ کرنا ہو تو مجھے کل کی ہی فکر زیادہ ہوتی ہے۔

87۔فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟

بڑے بھائی۔

88۔کس عمر میں موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی؟

ویسے استعمال کرنے کی اجازت تو شروع سے ہی تھی مگر اپنا فون چودہ سال کی عمر میں ملا۔

89۔غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟

میں تو خاموش رہتا ہوں۔

90۔مرنے کے سین کرنے کیسے لگتے ہیں؟

ابھی تک کیے نہیں۔

91۔اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟

دونوں سے سیکھتا ہوں۔

92۔کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟

چائے۔

93۔دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟

دماغ کی۔

94۔کیا لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

والٹ۔

95۔کھانا کھانا کہاں پسند کرتے ہیں؟

ڈائننگ ٹیبل پر۔

96۔بی پی ہائی ہو جاتا ہے جب؟

نہیں۔کبھی نہیں ہوا۔

97۔اچھی بری خبر سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟

اپنی بیگم کو۔

98۔اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟

تو کچھ نہیں۔زندگی میں اور بھی بہت سے کام ہیں کرنے کے لیے۔

*

خواتین رائٹرز کی کہانی

عمار مسعود

ہر کہانی کی اپنی ایک داستان ہوتی ہے۔ ہر داستان کا ایک پس منظر ہوتا ہے اور اس پس منظر میں ایک اہم کردار ہوتا ہے جو اس کہانی کے جنم کا باعث ہوتا ہے۔

پاکستان میں بالعموم ڈائجسٹ رائٹرز کے ساتھ متعصبانہ رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ نہ ان کو ادبی سطح پر شناخت ملتی ہے نہ ادبی رسالے ان کی تخلیقات کو چھاپنے کی زحمت کرتے ہیں، ان کی سرکاری سطح پر کوئی پذیرائی ہوتی ہے نہ ان کو معاشرے میں ایک مصنف کی سی اہمیت ملتی ہے۔ ڈائجسٹ رائٹرز کے حوالے سے نہ کوئی تحقیقی مواد ہمیں ملتا ہے نہ ان کہانی کاروں پر کبھی کسی نے سنجیدہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر کرن نذیر احمد نے پہلی بار اس اہم موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں بات کی ہے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ امریکہ کی یونیورسٹی آف ٹیکساس ایٹ آوسٹن (Texas at Austin) کے تعاون سے مکمل ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ ان کے مقالے پر بات کی جائے کچھ تعارف کرن نذیر احمد کا ہو جائے۔ اس وقت وہ قائداعظم یونیورسٹی میں جینڈر اسٹڈیز کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ذمہ داریاں سر انجام دے رہی ہیں۔ اس سے پہلے وہ اینتھروپولوجی فلاسفی اور بین الاقوامی تعلقات عامہ میں پاکستان، کینیڈا اور امریکا سے ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے زیر بحث مقالے کا عنوان ہے Stories With Oil Stains جس کا اردو ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ ''میلے ہاتھوں سے لکھی روشن کہانیاں''۔ اس پنج سالہ تحقیقی پروجیکٹ میں ڈاکٹر کرن نذیر احمد نے پاکستان کے دو صوبوں کے کئی شہروں اور گاؤں میں جا کر ان کہانی کاروں سے ملاقات کی، کچھ کے گھر قیام کیا، کچھ سے گھنٹوں فون پر بات کی، پبلشرز سے ملاقات کی۔ اس نوع کی کہانیوں کے قارئین سے گفتگو کی اور پھر اس مقالے کو تحریر کیا۔ ان کی تحقیق میں کچھ انوکھی باتیں دریافت ہوئیں جن پر بات کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر کرن اپنے مقالے میں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ڈائجسٹ رائٹرز کو اس معاشرے میں ہم وہ مقام نہیں دے سکے جو ان کا حق بنتا ہے۔ وہ صرف یہ گلہ ہی نہیں کرتیں بلکہ اس رویے کی کچھ وجوہات بھی بیان کرتی ہیں کہ جن کی بنا پر یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے بہت محنت سے ان ڈائجسٹوں کی لکھی کہانیوں کی نوع اور موضوع پر بھی گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق ابتدا میں ان کہانیوں کے موضوعات بالی عمر کے رومان کے گرد ہی گھومتے رہے۔ رفتہ رفتہ ان موضوعات میں تنوع آتا گیا ہے۔ محبت کے موضوع کے علاوہ اب ان کہانیوں میں عورت کے حوالے سے معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ خواتین کے حقوق پر بھی بات ہوتی ہے۔ بیٹی کی پیدائش کے حقوق پر بھی بات ہوتی ہے۔ بیٹی کی پیدائش کو باعث شرمندگی سمجھنے والے رویے کو بھی موضوع بنایا گیا۔ ڈائجسٹ رائٹرز نے مذہب کو بھی موضوع بنایا اور معاشرت کو بھی، سیاست کے حوالے سے ان کی تحریریں بے توجہی کا شکار رہیں۔ ان رائٹرز نے خواتین کے حقوق کے حوالے سے تو بات کی ہے مگر سیاسی شعور بیدار کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ عام خیال یہی ہے کہ چونکہ خواتین کی زندگی کا

زیادہ تر حصہ گھر کی چار دیواری میں گزرتا ہے، اس لیے یہ کہانیاں گھروں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی اسلوب میں لکھی جاتی ہیں۔ اسی سوچ کو فروغ دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کا ہیرو بھی بدلتا رہا ہے۔ لمبے تڑنگے جاگیردار یا یونیفارم آفیسر کی جگہ اب ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والے ہیرو نے لے لی۔

تحقیق کے مطابق یہ کہانیاں۔ بے پناہ اثر آفرینی رکھتی ہیں۔ لاکھوں خواتین یہ کہانیاں ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں۔ ڈائجسٹ میں لکھنے والی خواتین کا حلقہ اثر بے حد وسیع ہوتا ہے۔ ان کہانیوں پر ردعمل ملک بھر سے مدیران کو موصول ہوتا ہے۔ کشمیر کی خواتین، گلگت کی عورت، کراچی کی ورکنگ وومن، لاہور کی استانی اور اسلام آباد میں این جی او میں کام کرنے والی خواتین ان ڈائجسٹوں کی کہانیوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ مڈل کلاس گھرانے کی خواتین بھی یہ کہانیاں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں اور ارب پتی خواتین بھی ان ہی کرداروں میں کھوئی رہتی ہیں۔ سندھ کی ایک ایسی فیملی کا بھی اس ریسرچ میں تذکرہ ہے کہ جن کی چار نسلیں اس تخلیقی کام سے وابستہ ہیں مگر ان کو وہ قبولیت عام نصیب نہیں ہوئی جو ایک ادیب کے حصے میں آتی ہے۔ ہر تحقیق کرنے والے کی تحقیق میں خود اس کی ذات بھی عیاں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کرن نذیر احمد چونکہ خواتین کے حقوق کی بڑی علمبردار ہیں، اس لیے ان کی تحقیق کا نتیجہ یہی ہے کہ ہر کہانی کی اپنی ایک داستان ہوتی ہے۔ ہر داستان کا ایک پس منظر ہوتا ہے اور اس پس منظر میں ایک پراسرار اور مرکزی کردار ہوتا ہے جو اس کہانی کے جنم کا باعث ہوتا ہے عموماً یہ پراسرار کردار خود کہانی کار ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر کرن نذیر احمد کے ہم بھلے ان تحریروں کو ادبی شاہکار کی منزلت نہ دیں لیکن کم از کم ایک تخلیق کار کی عزت اور احترام ان ڈائجسٹ رائٹرز کا استحقاق ضرور ہے۔

☆☆

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب-/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ-/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

اعتذار

تاخیر سے موصول ہونے کے باعث اس ماہ عفت سحر طاہر کے ناول ''رنگ ریز میرے'' کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ آئندہ ماہ نہیں عفت سحر طاہر کے ناول کی قسط پڑھ سکیں گی۔

بہت سی خوبیوں کے مالک اور اینکر پرسن

خرم سہیل سے ملاقات

شاہین رشید

خرم سہیل صحافتی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ یہ پیشے کے اعتبار سے صحافی، محقق، مترجم، نقاد اور براڈ کاسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور ان کا قلم موسیقی اور شعر و ادب پر زیادہ روانی سے چلتا ہے۔ خرم سہیل آج کل ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات اور مختلف ویب سائٹس کے ساتھ منسلک ہیں اور فری لانس صحافی کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

''کیا حال ہیں خرم صاحب؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''جہلم کا مضافاتی علاقہ میرے آباؤ اجداد کا مسکن رہا ہے، آباؤ اجداد مولوی کہلاتے تھے۔ خاندان کے افراد کی اکثریت امامت اور تدریس کے شعبوں سے وابستہ رہی۔ ہماری مادری زبان پنجابی ہے لیکن میں اپنی قومی زبان اردو سے بھی بہت عشق کرتا ہوں۔ میری پیدائش گوجرانوالہ شہر کی ہے۔ ہم تین بھائی ہیں۔ میں سب میں بڑا ہوں۔ میں نے جامعہ کراچی سے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے اور پھر عملی طور پر صحافت سے وابستہ ہو گیا۔ والدین نے محنت مزدوری کر کے ہماری پرورش کی اور آج ہم جس مقام پر ہیں ان ہی کی وجہ سے ہیں۔ پھر زندگی میں کچھ ایسے اساتذہ بھی ملے جنہوں نے ہماری تعلیمی بنیاد بھی مضبوط کر دی۔ اس کا ثمر آج تک مل رہا ہے۔

میں نے 2006ء میں جب میں جامعہ کراچی میں زیر تعلیم تھا ایک ڈرامہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی، جس کا نام ''راوی'' رکھا۔ اس کے تحت خود بھی اور مختلف یونیورسٹیز کے اشتراک سے اسٹیج ڈرامے تخلیق کیے۔ 2007ء میں ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کی اور اگلے ہی برس اس ادارے کے چینل ایف ایم 101 سے وابستہ ہو گیا۔ کئی برس اس چینل کے ساتھ گزارنے کے بعد اسی کے ایک اور چینل ایف ایم 94 سے بھی کچھ عرصہ منسلک رہا۔ جامعہ کراچی میں جب تجرباتی طور پر ریڈیو کی نشریات کا آغاز ہوا تو اس کی ابتدائی ٹیم کا حصہ بھی رہا..... بی بی سی اردو سروس کے معروف براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کی سوانح حیات بھی قلم بند کی۔''

''آپ مختلف اخبارات سے بھی تو منسلک رہے اس کے بارے میں بتائیے؟''

''جی جی..... عملی صحافت میں قدم رکھا تو 2007ء میں انگریزی اخبار ڈیلی ٹائمز کے ادارے

سے شروع ہونے والے نئے اخبار روزنامہ ''آج کل'' سے وابستہ ہوا، گزشتہ 15 برسوں میں جن اخبارات میں فرائض انجام دیئے ان میں روزنامہ ''ایکسپریس۔ نوائے وقت۔ دنیا۔ جہان پاکستان۔ جناح نگار'' اور دیگر اخبارات و جرائد شامل ہیں اور آج کل روزنامہ جنگ کے لیے سلسلہ وار کالم اور ڈان اردو آن لائن ایڈیشن کے لیے بھی لکھنے کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک ٹی وی چینل GTV سے ثقافتی پروگرام کی میزبانی بھی کر رہا ہوں۔ پروگرام کا نام ''چائے خانہ'' ہے ..... پاکستان، جاپان لٹریچر کا بانی بھی ہوں الحمدللہ اور دونوں ممالک کی ثقافت کو روشناس کرانے کے لیے دو کتابیں ''سرخ پھولوں کی بند خوشبو'' اور ''خاموشی کا شور'' مرتب کر چکا ہوں۔ جبکہ معروف جاپانی ناول ''کچن'' کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح ناول نگاری پر ایک تحقیقی کام ''ناول کا نیا جنم'' بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ صحافتی کیریئر میں کئے گئے انٹرویوز کے دو مجموعے ''باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے'' اور ''سرمایا'' بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور انٹرویوز کا انگریزی انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میں نے پاکستان، جاپان، انڈیا، امریکہ، انگلینڈ سمیت مختلف ممالک کی علمی و ثقافتی شخصیات کے انٹرویوز بھی کیے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ آج کل میں پہلا ''طبع زاد ناول'' بھی لکھ رہا ہوں اور مختلف موضوعات پر دس کتابیں بھی زیر ترتیب ہیں۔''

''بچپن میں کیا خواب دیکھتے تھے کہ بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟''

''میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔ یہ میں نے بچپن میں تو کبھی نہیں سوچا تھا لیکن جب کالج آیا تو صحافت کا شوق ہوا اور صحافت میں بھی رسائل و جرائد کی صحافت کیونکہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں شاعروں، ادیبوں، اداکاروں، موسیقاروں اور اسی طرح کے دیگر لوگوں

سے ملوں۔ تو اس کا میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں صحافی بن جاؤں پھر میں اپنے دل کی باتیں بھی بتانا چاہتا تھا اس کا بھی واحد حل صحافت تھا جس کے ذریعے میں اپنے خیالات لکھ سکتا تھا اور بتا سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میری ایک کتاب کا دیباچہ معروف بھارتی فلم ساز اور شاعر گلزار صاحب نے لکھا ہے انہوں نے اس میں لکھا خرم کو سوال بہت تنگ کرتے ہیں۔'' تو میں ایک لکھنے پڑھنے اور روشن دماغ والا انسان بننا چاہتا تھا۔ اور وہ میں شاید کسی حد تک بن چکا ہوں۔''

''صحافت میں بالخصوص میگزین کے شعبے میں کیسے آئے اور شوبز میں کیوں کہ دلچسپی ہوئی؟''

''میں بچپن سے ہی ناول اور فلم سے جڑا ہوا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے نتھی ہیں مجھے ناول پڑھتے ہوئے فلم کا احساس ملتا ہے اور فلم دیکھتے ہوئے ناول پڑھنے جیسی کیفیت کو محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے صحافت میں میگزین سیکشن پسند تھا کہ

یہاں دونوں شعبوں میں کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے میں جب بھی اخبار لیتا اس کی میگزین سیکشن کا مطالعہ پہلے کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ڈائجسٹ بھی مجھے بہت پسند تھے۔ میری کزنز خواتین، شعاع، کرن اور دیگر ڈائجسٹ کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی تھیں تو میں بھی ان میگزین سے آشنا ہوا۔ صحافت میں شوبز ہو یا میگزین کا کوئی شعبہ، چاہے ریڈیو ہو یا ٹی وی ان سب میں میرا ابتدائی کام انٹرویو کرنا ہوتا ہے۔ یہ انسپائریشن مجھے دو لوگوں سے ملی۔ ایک نعیم بخاری اور دوسرے انور مقصود ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ دونوں سے میرا نیاز مندی کا رشتہ بھی ہے دونوں نے میری کتابوں پر اپنی رائے بھی لکھ کر دی۔''

''خود کو منوانے کے لیے تگ و دو کی یا سب راستے آسانی سے کھلتے چلے گئے؟''

''میں اپنے بارے میں اکثر ایک جملہ کہتا ہوں کہ میں گمنامی کے ملبے تلے سے نکلا ہوا شخص ہوں۔ میں نے جب صحافت میں قدم رکھا تو اس کام کے لیے ترسا ہوا تھا کہ میں بہت سارا پڑھوں لکھوں اپنی مین پسند شخصیات سے مکالمہ کروں۔ کام کی تڑپ اتنی تھی کہ اپنے کیریئر کے ابتدائی دنوں میں بھی عید کے دن کام کرتا رہتا تھا تو اس مقام کو پانے کے لیے بہت زیادہ محنت کی اور ابھی تک کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے کام سے عشق ہے۔''

''آپ بیک وقت ریڈیو، ٹی وی اخبارات اور ویب سائٹ کے لیے کام کرتے ہیں۔ سب کو وقت کیسے دے پاتے ہیں؟''

''میں نے کہا نا کہ میرا کام میرا عشق ہے جنون ہے۔ اس لیے کسی بھی کام کے لیے وقت نکالنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کی عادت تو بچپن سے ہی تھی اور وہی عادت میرے کام آئی۔''

''آپ کے کام میں تنوع ہے اور کئی جہتیں بھی۔ لیکن آپ کو سب سے زیادہ عزیز کون سا کام ہے؟''

''مجھے لکھنا بے انتہا پسند ہے۔ اس کے بعد بولنا۔ مگر شرط یہ ہے کہ موضوعات میری پسند کے ہونے چاہیں۔ لکھنا مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ بولنے میں مجھے ٹی وی سے زیادہ ریڈیو متاثر کرتا ہے۔ اس میں شاید موسیقی بھی شامل ہوتی ہے۔ انٹرویو کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔''

''کتنے سال ہو گئے اس دشت کی سیاحی میں کیا کچھ کر چکے ہیں۔ کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں گزشتہ پندرہ سال سے صحافت سے وابستہ ہوں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 500 انٹرویوز اور 1000 تحریریں لکھ چکا ہوں۔ سات کتابیں لکھی ہیں اور مرتب کی ہیں اور دس کتابیں زیر ترتیب ہیں اور یہاں ایک بات اور شیئر کرنا چاہوں گا کہ میرے کام کا احاطہ صرف پاکستان تک محدود نہیں ہے بلکہ میں بین الاقوامی سطح کے موضوعات انٹرویوز اور تحقیق کا کام بھی کرتا ہوں مجھے انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے مگر میں لکھتا اور سوچتا اردو میں ہی ہوں۔ میں نے بے شمار ملازمتیں بھی کی ہیں اور کیا کرنا چاہتا ہوں تو میرے بہت سے مشن ہیں۔ جس کا تذکرہ ابھی کرنا نہیں چاہتا۔''

''کبھی ایسا وقت آیا کہ صحافت کو خیر باد کہنے کو دل چاہا ہو یا کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو؟''

''جی ہاں کئی بار ایسا ہوا، صحافت میں سب سے بڑا مسئلہ وقت پر تنخواہ نہ ملنے کا ہے۔ خواہ بڑا اشاعتی ادارہ ہو یا چھوٹا سب کا ایک جیسا حال ہے میرے پاس صرف ایک ہی حل تھا کہ میں جز وقتی صحافت کروں اس میں پیسے وقت پر مل جاتے تھے۔ مگر ان سے گھر داری نہیں چل سکتی تھی۔ اس لیے ساتھ ساتھ کہیں نہ کہیں نوکری بھی کرتا تھا۔ کئی بار سخت تنقید کی وجہ سے مجھے پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر میں وہی لکھتا ہوں جو مجھے ٹھیک لگتا ہے میں نے کراچی آرٹس کونسل کی عالمی اردو کانفرنس، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کانفرنس کے تحت ہونے والا کراچی لٹریچر فیسٹیول، موسیقی کا بہت بڑا ایونٹ کوک اسٹوڈیو اور ہماری فلمی صنعت سمیت بہت سارے معاملات پر

تنقیدی پہلوؤں سے بھی لکھا جس میں مجھے کافی دباؤ اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر میرا ضمیر مطمئن ہے۔ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر زوال پذیر ہے اس کے ہر شعبے میں مسائل ہیں جس پر متعلقہ لوگوں کو لکھنا چاہیے مگر اکثریت نہیں لکھتی کیونکہ وہ یا تو مجبور ہیں یا منافق ہیں۔''

''آپ GTV سے وابستہ ہیں یہ چینل بھی دیکھا جاتا ہے۔ مگر جو بہت مشہور چینلز ہیں اس کو کیوں نہیں جوائن کیا؟''

''میرے لیے کسی چینل کا نام پرکشش نہیں ہے بلکہ معیار معانی رکھتا ہے تو جی چینل اس معیار کو پورا کرتا ہے اور کر رہا ہے تو اسی لیے میں اس چینل پہ کام کرتا ہوں۔''

''آپ کو کہیں اور سے آفر آئی اور اس فیلڈ میں سب سے مشکل اور سب سے آسان کام کون سا لگا؟''

''آفرز کا سلسلہ تو جاری رہتا ہے، سب سے پہلے مجھے معروف اینکر وصحافی شاہ زیب خان زادہ نے پیشکش کی تھی اور میرے لیے کوشش کی کہ میں ٹیلی وژن سے کوئی ثقافتی پروگرام کروں۔ اس وقت ''بزنس پلس'' اور ''ڈیلی ٹائمز'' جیسے ادارے میں ہم ایک ساتھ کام کرتے تھے، مگر وہ بات کہیں ادھر ادھر ہوگئی۔ پھر محمود شام نے اے آر وائی سے کوشش کی کہ میں ان کے ساتھ معاون ومیزبان بن کر پروگرام میں شرکت کروں۔ پھر میری اپنی بھی کچھ شرائط ہوتی ہیں۔ جس کے لیے ڈان نیوز اور ''جی ٹی وی'' نے اس معیار کو چھوا جس کی وجہ سے میں نے کامیاب پروگرام کیے چاہے وہ بطور مہمان کے ہوں یا میزبان کی حیثیت سے کیے ہوں..... ٹی وی پہ سب سے پہلا پروگرام مشکل تھا۔ جولائیو تھا پھر اس کے بعد لحہ بہ لحہ ہر پروگرام آسان ہوتا گیا۔ مجھے ہر اس پروگرام یا مکالمہ میں بہت دقت پیش آتی ہے جب سامنے والے کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہو یا اسے اپنی بات ڈھنگ سے کہنی نہ آتی ہو۔''

''جاپان اور جاپانی ثقافت کی طرف کیسے راغب ہوئے؟''

''یہ بھی جامعہ کراچی کے دنوں کی بات ہے جب میں تھیٹر کے لیے کام کرتا تھا۔ ہمیں اپنے ناٹک کے لیے اسپانسر کی تلاش رہتی تھی۔ کسی نے بتایا کہ کراچی میں قائم جاپانی قونصل خانہ ایک جاپانی ڈرامہ اردو میں کروانا چاہتا ہے۔ اسکرپٹ بھی وہ مہیا کردیں گے۔ میں اس سلسلے میں اس وقت کے ڈپٹی قونصل جنرل سے ملا اور یوں ایک رابطہ قائم ہوگیا ہم نے وہ ڈرامہ بھی کیا جو کہ فاطمہ ثریا بجیا کا لکھا ہوا تھا تو ہم نے جس جاپانی شخصیت کی مدد لی تھی ان کا نام ''لوشی کازوایسومورا'' تھا اب وہ اس وقت کراچی میں قائم جاپانی قونصل خانے کے قونصل جنرل ہیں میری ان سے شناسائی کا عرصہ گیارہ بارہ سالوں پر محیط ہے جس میں انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا اور میں نے جاپان کے بارے میں بہت کچھ جانا اور سیکھا۔ بس ان کی محبت میں مجھے جاپان سے محبت ہوگی اور میں اپنے شوق کی تکمیل کے لیے جاپانی ثقافت پر بھی کام کرتا ہوں۔''

اب کچھ نجی سوال بھی ہو جائیں..... ''اپنی شادی اور بچوں کے بارے میں بتایئے؟''

''میری شادی 2010ء میں کراچی میں ہوئی۔ میری شریک حیات کا نام ''صاخرم'' ہے میری دو بیٹیاں ہیں جن کے نام ''صلہ'' اور ''دعا'' ہیں اور ان کی عمریں باترتیب چھ سال اور سات سال ہیں۔

ماشاء اللہ میری بیٹیاں پڑھائی میں بہت اچھی ہیں اور انہیں مصوری اور موسیقی سے بھی شغف ہے بیگم کی خواہش تھی کہ بطور بیوٹیشن اپنا کیریئر بنائیں لیکن گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنے شوق پر توجہ نہ دے سکیں مگر فیوچر میں اس کام پر توجہ دینے کا ارادہ ہے۔ وہ میرے کاموں میں میرا بہت ساتھ دیتی ہیں اور میری تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے میرے لیے اچھے اچھے کھانے بھی پکاتی ہیں جس کی وجہ سے میرے کام اور صحت دونوں توانا ہوجاتے ہیں اور تھکاوٹ بھی دور ہوجاتی ہے۔''

''اچھا بہترین..... اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اور اپنی پسند ناپسند کے بارے میں بتایئے؟''

''میری ذاتی زندگی بہت سادہ ہے۔ میں سب کچھ شوق سے کھالیتا ہوں بس وہ پکا ہوا اچھا ہونا چاہیے۔ کھیلوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ بچوں کے ساتھ ''کورونا'' کے آنے سے پہلے تک ہر ہفتے ایک بار باہر کہیں جانا ہوتا تھا..... کھانے اور تفریح وطبع کے لیے..... میں پٹھان کے ہوٹل کی چائے اور جدید کافی شاپس کی کافی بہت شوق سے پیتا ہوں مجھے اچھی چائے پلا کر کوئی بھی اپنی بات منوا سکتا ہے۔''

''شاید اس لیے آپ نے اپنے پروگرام کا نام بھی چائے خانہ رکھا ہے؟''

''جی..... جی بالکل، میں محفل اور مجلس کا آدمی ہوں مگر سارے کام توازن کے ساتھ کرتا ہوں اگر کام بہت زیادہ ہوجائے تو پھر لازمی طور پر مجھے اپنا میل ملاپ محدود کرنا پڑتا ہے۔''

''بیگم تو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتی ہیں۔ آپ کو خود بھی شوق ہے کچن میں بیگم کا ہاتھ بٹانے میں؟''

''کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔ مگر اس کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا..... سوچتا ہوں کہ جب سارے ہنر آزما لیے ہیں تو اس کے لیے بھی وقت نکال ہی لوں۔''

''ملک سے باہر جانا ہوا؟''

''ملک سے باہر زیادہ تر جاپان ہی گیا ہوں۔ وہ بھی کام کے سلسلے میں لیکن ساتھ ساتھ سیر وتفریح بھی ہوجاتی ہے۔ کیونکہ میرے ڈھیر سارے جاپانی دوست ہیں جو بہت اچھی اردو بھی بول لیتے ہیں۔''

''آپ نے فلم، موسیقی اور شعر و ادب کے شعبوں میں بہت زیادہ کام کیا ہے۔ ان میں آپ کی پسندیدہ شخصیات کون کون سی ہیں؟''

''فلم کے شعبے میں پاکستانی فنکاروں میں مجھے راحت کاظمی اسلم پرویز، منور ظریف، سبحانی بایونس، ضمیر فاروقی، محبوب عالم، شان، فردوس جمال، فردوس، آسیہ، ممتاز، رانی اور روحی بانو پسند ہیں۔ موسیقی میں نور جہاں، نصرت فتح علی خان، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، عابدہ پروین، نصیبو لعل، تمام پوپ بینڈ اور کلاسیکی گائیکی والے پسند ہیں۔ خورشید انور اور رشید عطرے کی موسیقی، خواجہ پرویز کی شاعری بھی کمال ہے۔ وجاہت عطرے کی میوزک دال کو چھوتی ہے۔ عالمی موسیقی میں اینگما بینڈ، مائکل جیکسن، میڈی اڈو پسند ہیں۔ انڈیا سے کشور کمار، الکا، اودت نرائن، سونو نگم، ارجیت سنگھ، جون نوتھیال پسند ہیں اردو شعر و ادب میں میر، غالب، جون، فرحت عباس، پروین شاکر، سعادت حسن منٹو اور مظہر الاسلام پسند ہیں۔ میرے پسندیدہ لوگوں کی فہرست بہت لمبی ہے اس کو بہت جانیے۔''

''اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''آپ کے میگزین کا شکریہ کہ میرا انٹرویو لیا اور نوجوانوں سے یہی کہنا چاہوں گا کہ کامیابی ایک دم سے نہیں ملتی، مستقل مزاجی سے کام کرتے رہیں بڑے بڑے ادارے خود چل کر آپ کے پاس آئیں گے۔ بس زندگی میں وہ ضرور کریں جو آپ کا دل چاہتا ہے تب ہی آپ حقیقی معنوں میں زندگی بسر کر سکیں گے۔ اور رشتوں سے زیادہ توقعات نہ رکھیں تب ہی آپ زیادہ خوش رہ سکیں گے۔''

اس کے ساتھ ہم نے خرم سہیل سے اجازت چاہی۔

☆☆

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ' 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: Info@khawateendigest.com

ہاجرہ عمران......لاہور

فہرست پر نظر ڈال کر کہی سنی پر آئے، یہ مدیر اور قاری کے درمیان براہ راست گفتگو ہے۔ ہم اسے خاصی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ''عید آئی ہے'' سروے دیکھ کر اپنی عدم دستیابی پر خوب غصہ آیا، راحت جبیں کا ''تتلی جیسا پیار'' کامیابی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ صائم اور زوبار یہ کی محبت میچور اسٹیج میں داخل ہوگئی، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ نوجوانی کی محبت پر میچور اسٹیج محبت کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے، حالانکہ محبت تو محبت ہے، وہ کسی بھی عمر اور کسی بھی موسم میں ہوسکتی ہے۔ جیسے صائم اور سیماب کی پسندیدگی کو ہر طرف سے سپورٹ مل رہی ہے۔ حالانکہ اس عمر میں عقل سے فیصلے ہوتے ہیں جو صائم کر رہا ہے مگر ''محبت'' وہ تو عمر کی قیدی نہیں۔

ماضی کے فلیش بیک اور حال کی توڑ پھوڑ سے بھر پور عفت سحر کا ''رنگ ریز میرے'' بھی اچھا جا رہا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے میں اکثر سوچ میں پڑ جاتی ہوں کہ شاید ہمارے ہاں ''ہیروئین'' ابھی تک ویسی ہی اولڈ ماڈل ہے۔ پچھلے کسی خط میں آپ نے پوچھا تھا کہ ''رنگ ریز میرے'' میں یکدم دلچسپی بحال ہونے کی وجہ کیا ہے تو اس کا جواب ہے ''زیاد اور کینھی'' یعنی نئے کرداروں کی شمولیت نے ناول دلچسپ بنا دیا مگر پھر بھی ناولوں کا ٹیمپو سست روی کا شکار رہے۔

نعیمہ ناز سلطان کا ''ہنستے ہنستے'' ہلکا پھلکا اور مزیدار ناولٹ تھا۔ سعدی کی امی نے بڑے پتے کی بات کی ''پری سگھڑ ہونہ ہو، باادب اور تمیز دار ہے'' لڑکی اگر باادب اور عزت کرنے والی ہوگی تو وہ گھرداری سیکھنے میں بھی پس و پیش سے کام نہیں لے گی۔

فرزانہ کھرل کا ''اجنبی کون ہو تم'' سوپر ڈوپر، اعلا بلکہ بہت اعلا رہا۔ کچھ جملوں کی بنت اتنی اعلا تھی کہ نہ صرف کئی بار پڑھا بلکہ انڈر لائن بھی کر لیے۔ فرزانہ! جیسے شاہنواز ایکسیڈنٹ میں مارا گیا اسی طرح اس کی اماں کو بھی اگلے جہاں سدھار دیتیں۔ آیت کی زندگی اس کے محرم رشتوں نے مل کر جہنم بنائی تھی، اسے انجام پر کچھ تو سکھ سکون ملنا چاہیے تھا۔ نادیہ کا کردار بہت جاندار تھا۔ اسی ناول کا بہت جاندار جملہ (عورت کی مٹھی میں دریا نہیں، صرف وضو کے جتنا پانی ہوتا ہے۔) اس کے دل کے چشمہ زم زم میں۔

ماشاءاللہ بہت خوب لکھا۔ ناول کا نام ''اک ذرا سی محبت'' ہوتا تو اور بھی جچتا۔

چھ افسانوں سے مزین لسٹ دیکھ کر منہ میں پانی آ گیا۔ زوبی ظفر کا ''راجدھانی'' ہو بہو کہانی ہے ہمارے ذاتی تجربے کی......امیاں کہیں سے بھی گھر واپس آئیں انہیں ''ہو چکے'' کام کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی مگر جو نہ کیا گیا ہو، اس کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ صدف آصف کا ''گرہستی'' ہمارے گھریلو ردیوں کی عکاس کہانی ہے۔

ج: پیاری ہاجرہ! بے شک محبت کسی بھی عمر میں ہو سکتی ہے۔ لیکن کم عمری کی محبت میں لڑکے اور لڑکیوں کو اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ یہ جان سکیں کہ دراصل وہ خود چاہتے کیا ہیں۔ وہ زندگی میں کس کے ساتھ خوش رہ سکتے ہیں۔

عقل پر جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ جو پہلا بندہ اظہار محبت کرے، انہیں وہ اچھا لگنے لگتا ہے۔ جبکہ لڑکے کم عمری میں اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوتے، وہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے انہیں جو لڑکی اچھی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ وقت گزاری کرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس میچور ایج میں انسان مختلف تجربات سے گزر کر جان چکا ہوتا ہے کہ اسے زندگی کا ساتھی کیسا درکار ہے۔ وہ کسی لڑکی کو کچھ وقت گزارنے کے لیے نہیں ساتھ نبھانے کے لیے پسند کرتا ہے اور لڑکی صرف یہ دیکھ کر انتخاب نہیں کرتی کہ لڑکا اس سے اظہار محبت کر رہا ہے بلکہ وہ اس کی تعلیم، کیریر اس کے گھر کا ماحول سب کچھ سامنے رکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔

رہ گئی محبت تو ایک بات سمجھ لیں کہ خالص محبت کہیں نہیں ہوتی، یہ صرف کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

کوثر خالد سودا..... فیصل آباد

''کہنی سنی'' عید قرباں اور ہم''، ''کرن کرن روشنی'' محفوظ کرلیں گے ہم۔

''باتیں'' سلیمان سعید سے۔ حیرت ہے، بہت سے خیالات مجھ سے ملتے ہیں۔ لگتا ہے دعائیں قبول ہوگئیں۔ پنکی دیاں گلاں۔ آون آون ماشاء اللہ۔ فضول رسماں جاون جاون ان شاء اللہ۔

''ہمارے نام'' ریحانہ بدو کے افسانہ و غزل کرونا کی مبارک قبول کرو۔ تبسم کو دعائیں اور ماہا کو دعائیں زور سے برسیں۔ مما جی کو شفائیں آسماں سے اتریں۔ ''تتلی جیسا پیار'' کہیں کوئی کرنہ بیٹھے۔ ''رنگ ریز میرے'' دین سے دور ہو کر بہت پچھتائے ہم۔

''حالم'' جادو نگری کی داستاں، دیکھئے کہاں رکتی ہے۔

''چاند رات'' اچھی ساس قدرت کا قیمتی انعام ہے۔ ارے یاد آیا، کسی لڑکی نے لکھا تھا کہ وہ ساسیں کہاں ہیں جو سر میں تیل بھی لگاتی ہیں۔ بھئی ہم ہیں ناں۔ بہو کے پورے جسم پر مالش بھی کر دیتے ہیں۔ وہ سلائی کرتی ہے۔ تو مدد بھی کرتے ہیں۔ پوتوں کو بھی سنبھال لیتے ہیں۔ اور گھر کا سارا کام بھی خود کرتے ہیں۔ ٹوٹے پاؤں کی ہڈی سے پلستر میں بھی لگے رہے اور وہ آٹھ دن پہلے ہی اتارنا پڑا۔ الحمدللہ پاؤں ٹھیک ہو گیا اور ہاں یہ ہمت قرآن اور کتابوں سے ہی ملی ہے ورنہ اردگرد سب اور میرے بچے بھی جلد ہمت ہار جاتے ہیں۔

''بدگمان'' اچھی بہو بھی عرش کا تحفہ ہے۔ میری بہو بھی ہرفن مولا ہے۔ خوراک کم اور غصہ کی تیز ہے۔ غصہ تو کم کروالیا ہے مگر سبزیاں کھلانے کے لیے دعائیں جاری ہیں۔

''بیل'' ماں کی نظر عقاب سے بھی تیز ہونی چاہیے تاکہ بیٹی کی حفاظت کی جا سکے۔ پھر پسند ناپسند کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن رشتہ کرتے وقت بیٹی سے پاس کروانا بھی ضروری ہے۔

''خاتون کی ڈائری'' کس کس کی تعریف ہو بھئی یہ سلسلہ ہمیشہ ہی باکمال ہوتا ہے۔

ناہید اسماعیل تمہاری تحریر بھی اچھی ہوتی ہے فائزہ بھٹی کی طرح۔ بھئی مجھے تو سارے ہی نامے اچھے لگتے ہیں۔ فرزانہ انصاری تم بھی کمال کی ہو۔ صحت اور رزق کی دعا۔ اللہ قبول کرے۔ ''موسم کے پکوان'' ہم سے اگر کوئی کھانے کی ترکیب پوچھے تو ہم کہتے ہیں، مسالہ بھونو۔ سبزی ڈالو اور بھونو۔ یا پانی ڈال کر شوربا کرلو۔ لیموں ڈال کر کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ کیونکہ مزہ تو کھٹے میں ہے۔ ہماری خالہ تو ہانڈی کے سارے لوازمات اکٹھے ڈال کر ہلاتیں۔ تو مزیدار کھانا تیار۔ ہماری اماں مہینے بھر میں ایک کلو گھی سے گزارا کرتیں۔ مگر ہانڈی مزیدار۔ ہماری جٹھانی بھی پیاز، ٹماٹر اکٹھا ڈال لیتی ہے۔ اور مسالہ تو ڈالتی ہی نہیں، ہانڈی مزیدار۔ ارے بھئی، جب منہ میں ذائقہ ہو تو کاہے کو اتنی ترکیبیں یاد کریں۔ عید قرباں پر کسی کو پتا چلا کہ میں گھر بلا کر دس بندوں کو کلیجی کی دعوت کھلانے کے بجائے گھروں میں یا فقیروں کو کھلا دیتی ہوں تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''کام چور'' تمہاری دعوت کروں گی، دیکھنا! ہم بولے..... ہم دعوت کھانے بھی نہیں جاتے۔ بھئی جو کسی کو دو وہی لو۔ جس نے جو دینا ہے، گھر بھیجے ورنہ خود ہی کھالے۔ لیجیے لکھتے لکھتے دن چڑھ آیا ہمیں پتا ہی نہ چلا۔

ج: کوثر جی! خوب ہیں آپ۔ ہمارے قارئین ایسے ہی تو آپ کو یاد نہیں کرتے۔ بہت سادگی اور بے ساختگی ہے آپ کی تحریر میں بھی اور آپ کی شخصیت میں بھی۔ جتنی اچھی بہو تھیں، اتنی اچھی ساس بھی ہیں۔ کھانوں کی جو آسان سی ترکیبیں بتائی ہیں اگر سب اس پر عمل کریں تو زندگی کتنی آسان ہو جائے۔ خواتین کا آدھا دن کچن میں ہی گزرتا ہے۔ آپ کی ترکیبوں پر عمل

کرنے سے وقت کی بچت بھی ہوگی۔ لیکن ایک مسئلہ ہے۔ جن لوگوں کے منہ میں ذائقہ نہیں ہے انہیں تو یہ کھانے بالکل پسند نہیں آئیں گے۔ اس کے لیے بھی کوئی اچھی سی ترکیب بتادیں۔

زینب نور..... جہانیاں

واہ زینب نور کا باورچی خانہ لگ گیا، تھینک یو جی تھینک یو مگر کچھ آپی نے نشان دہی کی، کچھ خود پڑھ کے پتا چلا کہ میرے جوابات سے لگتا ہے جیسے ہمارے گھر پہ امی کی حکمرانی ہے مگر خدارا ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ابو کما کر امی کو دے دیتے ہیں، باقی سب گھر کے خرچ کس طرح پورے کرنے ہیں، یہ امی کا ہیڈک ہے۔ رشتہ داروں میں لینا دینا سب امی نے پورا کرنا ہوتا ہے۔ مگر امی ہر کام میں ابو سے صلاح مشورہ کرتی ہیں۔ ہر گھر کی طرح ہمارے گھر میں بھی ابو ہی سربراہ ہیں۔ اگر ابو نے کسی کام یا بات کے لیے ناں کہہ دیا تو امی انہیں پریشرائز کر کے ہاں نہیں کہلوا سکتیں۔

اور میرے پیارے ابو جان، کم گو، سنجیدہ اور غصیلے ہیں۔ مگر ہر باپ کی طرح بہت کیئر کرتے ہیں۔ ہماری امی کی دوائیوں تک کا خیال رکھتے ہیں۔ ویسے وقت کے ساتھ ساتھ ان کا مزاج بہت ٹھنڈا ہوتا جارہا ہے۔ اور یہ تبدیلی تب سے آنا شروع ہوئی جب آپیوں کی شادی ہوئی تھی۔

پکوڑے، سموسے اور دہی بڑے ہمارے ہاں رمضان میں ایک ایک بار بنتے ہیں۔ کیونکہ سارا دن پیٹ خالی رہتا ہے اور پھر یہ چیزیں نقصان دیتی ہیں۔ ہاں فروٹ جس کا جو دل کرے منگوالے۔ ہم بہن بھائی ویسے بھی ایسی چیزوں کے بالکل بھی شیدائی نہیں ہیں۔

''کرن کرن روشنی'' نے اردگرد کا سب کچھ روشن کردیا۔ مفید معلومات احادیث نبویؐ کی روشنی میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بخوبی ادا ہورہا ہے۔ اس کے لیے اللہ پاک آپ لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

سب سے پہلے ''تتلی جیسا پیار'' پڑھی، اس قدر انٹرسٹنگ اپنی سوڈھی کہ کیا بتاؤں۔ نعیمہ ناز کا ناولٹ بے حد خوب صورت اور جو سب سے زبردست تحریر تھی وہ پچھلے ماہ ''ہجر زدہ'' تھی۔ یہ تھی کس کی؟ شائلہ دالعباد یا عشرت دالعباد کی.....؟

افسانے سارے ہی پسند آئے۔ یعنی چاروں ہی اچھے لگے مگر ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ میمونہ صدف کا واپسی کب ہے؟'' اتنا پیارا لکھا ہے۔ باقی حمیرا عروش، عندلیب زہرا اور عنبرین ابدال کی کاوشیں بھی اچھی لگیں۔

جون میں شہناز لغاری کے انٹرویو نے بہت متاثر کیا۔ واقعی ایسا ہوسکتا ہے.....؟ اور ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہمارے جیسی پردہ دار لڑکیاں سوائے بھانڈے مانجھنے اور پوچا لگانے کے کچھ نہیں کرسکتیں۔ مگر سپورٹ بھی تو ہو۔ میرے میٹرک کے بعد ابو نے پڑھائی پہ پابندی لگادی فروری میں بھائی نے مجھے کتابیں لادیں کہ تمہارا ایڈمیشن بھیج دیا ہے میں نے، تیاری کرلو۔ بس کمر کس لی، یوں انٹر ہوگیا۔ آگے ابو نے سختی سے منع کردیا بھائی کو بھی کہ بارہ جماعتیں بہت ہوگئی ہیں۔ اور جس طرح سے میرا انٹر ہوا ہے، مجھے ہی پتا ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے ابھی تک بھی یہ نہیں پتا کہ الجبرا جیومیٹس کون کون سے ہیں۔ بس جو بکس بھائی نے لاکر دیں، پڑھ کے پیپر دے دیے۔

''ہمارے نام'' ناہید اسماعیل کو دیکھ کر اچھا لگا۔ زرتاشیہ نعمان کا خط مختصر تھا مگر پسند آیا۔

آخر میں بات کروں گی ''حالم'' کی کیونکہ میں یہ آخر میں ہی پڑھتی ہوں۔ (بھئی ٹائم لگتا ہے ناں سمجھنے میں) نمرہ جی.....؟ آپ کے پاس کوئی جادوئی قلم ہے کیا؟ ہر بات اس انداز میں لکھتی ہیں کہ حقیقت سے دور ہونے کے باوجود بھی ہم تردید نہیں کرسکتے۔ تالیہ تو بس تالیہ ہی ہے۔

ج: پیاری زینب! آپ کو غلط فہمی ہوئی، آپ کے جوابات سے ہرگز یہ تاثر نہیں جاتا تھا کہ گھر پر آپ کی امی کی حکمرانی ہے بلکہ ہمیں تو آپ کی امی بہت صابر اور قناعت پسند لگیں۔ ہاں آپ کے ابو قدرے سخت نظر آئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خطیب ہیں اور اردگرد کے ماحول کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے انہیں۔

آپ بہت اچھی، بہت پیاری بچی ہیں۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ آپ کو زندگی میں ڈھیر ساری خوشیاں ملیں۔ آمین۔

''ہجر زدہ'' شائلہ دالعباد نے لکھی تھی۔

فرزانہ انصاری عرف گڑیا..... کراچی

بقیہ صفحہ نمبر 238 پر

راحت جبیں

ستی جیسا پیار

اس گھر میں دو بھائی زبیر اور سرمد اپنی بیویوں ثمینہ اور ساجدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زبیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرمد اور ثمینہ کی دو بیٹیاں تھیں روشانے اور زوباریہ۔ روشانے کی منگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔

زوباریہ پورے گھر کی لاڈلی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا صائم، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زیبی اور صائم میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ فائقہ کو زیبی کا یوں چھت پھلانگ کر اپنے گھر آنا اور صائم سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا، ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زیبی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔

صائم کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زیبی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زیبی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا نمبر لے کر زیبی سے بات کرتا ہے۔ زیبی صائم کی غلط فہمی میں شہیر سے بات کرتی ہے اور تحفے وصول کرتی ہے، پتا چلنے پر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

پہچان ہوتی ہے۔ صائم کا شہیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔
زوباریہ کے کہنے پر صائم اپنا گٹار توڑ دیتا ہے۔ صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔ زیبی اس کے لیے اپنی پاکٹ منی سے گٹار خریدتی ہے۔ اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ دیتی ہے۔ صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔

صائم اور زیبی چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ فائقہ وہاں آجاتی ہیں اور زیبی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر ثمینہ کو کھری کھری سناتی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آجاتا ہے۔ فائقہ دانیال کو کہتی ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبھالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رائی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ ثمینہ زوبار یہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہیں۔

گھر پہنچنے پر صائم فائقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی فائقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوبار یہ کے گھر معافی مانگنے جاتا ہے مگر ثمینہ اسے سخت سست سنا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشانے کی شادی ہو رہی ہے زیبی اداس ہے کہ اس نے تو تمام پروگرام صائم کے ساتھ بنائے تھے۔

سب کے سونے کے بعد زیبی کھانا پلیٹ میں لے کر چپکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔ فائقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور مسیج کر کے دانیال کو اوپر بلاتی ہیں، دانیال دونوں کو آکر تھپڑ مارتا ہے اور زیبی کو لا کر روشانے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کمبائن اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو گولی لگی ہے۔ وہ ہاسپٹل جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زیبی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ فائقہ کے اصرار پر زیبی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دنگ رہ جاتا ہے۔

صائم فائقہ سے معافی مانگ کر کہتا ہے کہ وہ اب اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب فائقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیں گی۔

صائم ماں سے وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ ان کی بات مان کر پڑھائی پر توجہ دے گا اور زوبار یہ سے ملے گا نہیں ابراہیم صاحب کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ زوبار یہ کو صائم پر غصہ آتا ہے کہ اس نے ماں کی بات کیوں مان لی۔ فائقہ فون پر بات کی اجازت دے دیتی ہیں۔

روشانے اس بات پر بہت خوش ہوتی ہے کہ اب ان کے ملنے پر پابندی لگ گئی ہے اور صائم کا کمرہ نیچے شفٹ کر دیا گیا ہے۔

زوبار یہ ایک دن سب کی آنکھ بچا کر صائم کے گھر پہنچ جاتی ہے سرمد صاحب بخار کی وجہ سے گھر میں ہوتے ہیں۔ روشانے غصے میں دروازے کی کنڈی لگا دیتی ہے ارباب سے کہتی ہے گھنٹی بجے تو دروازہ آپ کھولیے گا۔ ثمینہ کو پتا چلتا ہے تو وہ دم بخود رہ جاتی ہیں۔ زیبی صائم سے مل کر واپس آتی ہے دروازہ بند دیکھ کر گھنٹی بجاتی ہے۔ دروازہ پر زرد چہرہ لیے باپ کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ وہ موبائل لے کر چند میسجز دیکھتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ صائم سے کس حد تک رابطے میں ہے۔

گھر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ صائم کا رشتہ زیبی کی مرضی سے آیا تھا۔ سرمد صاحب ابراہیم اور فائقہ کے پاس جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی یا رشتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے انکار پر وہ زوبار یہ کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ صائم کو نانا کے پاس دوسرے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔

منگنی کی رات سرمد بیٹی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ وہ باپ یا صائم میں سے کسے چنے گی۔ صبح وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ زیبی کی خوشی کا خیال کریں گے اس کی شادی صائم سے ہی کریں گے۔ زیبی صائم سے رابطہ کر کے اپنی منگنی کا بتاتی ہے دونوں بھاگ کر نانا کے پاس لاہور جا کر نکاح کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ زیبی اور صائم گھر چھوڑ دیتے ہیں۔

صائم اور زیبی رات کے دو بجے مراد کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہ انہیں اپنے سرونٹ کوارٹر میں رکھتا ہے۔ مراد کو زیبی بہت بری لگتی ہے جو اپنے گھر والوں کو یوں دھوکا دے کر آ گئی تھی۔ سرمد ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد انہیں دانیال اور ابراہیم اسٹیشن پر نظر آتے ہیں۔ وہ ٹرین سے اتر کر چھپ جاتے ہیں۔

زیبی اور صائم مسجد میں جا کر نکاح کرنا چاہتے ہیں لیکن مولوی صاحب منع کر دیتے ہیں کہ اتنی کم عمر لڑکی کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے۔ صائم اسے پیسے دیتا ہے وہ ان کا نکاح کروا دیتا ہے۔

پولیس اس کے گھر آ جاتی ہے۔ وہ دونوں وہاں سے بھی بھاگ جاتے ہیں۔

نویں قسط

محمود بابا کے گھر سے ستارہ خالہ کے گھر کا فاصلہ صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ اعصاب شل ہو گئے۔ پیروں سے تھکن لپٹنے لگی۔ فاصلہ سمٹنے میں نہ آ رہا تھا۔ وہ جیسے دائرے میں گھوم رہی تھی۔

یہ مکان تو پہلے بھی نظر سے گزرا تھا۔

اس دیوار سے لپٹی بیل نے تیسری بار اس کا رستہ کاٹا اور یہ موڑ...... یہ موڑ تو وہ کئی بار مڑی تھی۔ وہ جیسے راستہ بھول گئی۔ پھر جیسے بجلی کڑکی یا بادل گرجا...... یا اس کے اندر کوئی بھنور اٹھا تھا۔ زوباریہ نے رک کر، چونک کر سر اٹھایا۔

سارا چہرہ پانی سے شرابور ہو گیا۔

بادلوں نے اس کے آنسوؤں کی لاج رکھ لی تھی۔

لیکن وہ روئی کیوں؟ اس نے گلے میں لٹکتے اسکارف سے چہرہ رگڑ لیا۔

''خود کو سنبھالو ڈاکٹر زوباریہ! تم وہ ٹین ایجر زیبی نہیں ہو۔'' گھر کا گیٹ عبور کرتے ہوئے اس نے بار بار خود کو سمیٹا تھا۔

ستارہ اور فائقہ بچپن کی گوڑھی سہیلیوں کی طرح باتوں میں مگن تھیں۔

سیماب نے چور نظروں سے صائم کو دیکھا اور سرگوشی میں پوچھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''عجیب سی۔'' صائم کا جواب صائم کی طرح ہی عجیب تھا۔

''کیا مطلب؟'' سیماب کی آواز بلند تھی۔ ستارہ اور سیماب نے چونک کر دیکھا۔

''تمہیں اتنے معقول حلیے میں کبھی دیکھا نہیں ہے۔''

دونوں ماؤں نے مسکراہٹ دبائی۔ صائم دوبارہ بے نیازی سے شیشے کے پار دیکھنے لگا۔ برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی اور روشنی گھاس کے قطعے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے نم ہوتی ہریالی کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

عرصہ ہوا اسے بارش اچھی نہیں لگتی تھی۔

مگر سیماب تو دیوانی تھی۔ بارش کا نعرہ لگاتی کھڑی ہو گئی۔

''مما! ہم تھوڑی دیر باہر سے ہو آئیں۔''

فائقہ نے فکرمندی سے صائم کو دیکھا اور صائم شاید ان کی نظروں کی وجہ سے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

''مجھے تو سیماب بہت ہی پیاری لگی۔ کتنی ہنس مکھ اور سادہ مزاج ہے۔ پہلی بار مل کر احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ پہلی بار مل رہے ہیں۔'' فائقہ نے بہت پیار سے دونوں کو ساتھ ساتھ جاتے دیکھا۔ بوا سیماب کی تعریف سن کر ہی نہال ہو گئیں۔

''بہت ہی اچھی تربیت کی ہے ہماری ستارہ بی بی نے۔ عام لڑکیوں جیسی چنک مٹک نہیں ہے۔ جیسے نظر آتی ہیں ویسے ہی اندر سے ہیں ہماری بٹیا۔'' چائے کی ٹرے رکھتے بوا شروع ہو گئیں۔

''جس گھر جائیں گی اس گھر کو جنت بنا دیں گی ان شاءاللہ۔''

''ستارہ! میں نے دیکھتے ہی فیصلہ کرلیا تھا۔ میری بہو سیماب کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' فائقہ کی بات پر ستارہ اور بوا جی نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں نے تو صائم سے بھی بات کرلی ہے۔ وہ بھی بہت خوش ہے۔''

''صائم بہت ہی بھلا لڑکا ہے۔ پھر محمود صاحب کا نواسا ہے تو یقیناً بہترین انسان ہوگا۔'' ستارہ نے محتاط انداز میں اپنا عندیہ دیا۔ بیٹی کی ماں تھیں..... کھل کر تو نہیں کہہ سکتی تھیں کہ بیٹی آپ کے بیٹے پر جی جان سے فدا ہو رہی ہے۔ حالانکہ وہ اندر سے بہت پرسکون اور خوش تھیں۔ بیٹی نے جہاں دل لگایا وہیں گھر بسنے جا رہا تھا۔ ورنہ زوبار یہ کی حالت تو سامنے تھی ہی۔

''بس جاتے ہی ابراہیم سے مشورہ کروں گی۔ پھر ہم باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گے..... لیکن سچ تو یہ ہے کہ سیماب اب آپ کے پاس ہماری امانت ہے۔''

فائقہ نے نرمی سے ستارہ کا ہاتھ دبایا۔

''ہمیں تو وہ لڑکا ویسے ہی بہت پسند آیا تھا۔'' بوا جی جوش میں کھڑی ہوئیں۔ ''میں مٹھائی لے کر آتی ہوں۔''

☆☆☆

صائم رک گیا تھا۔ سیماب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ برآمدے کا اسٹیپ اتر گئی تھی اور تیز بارش اسے بھگو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی صائم کے ہاتھ میں تھا۔

''کیا ہوا؟''

''مجھے نہیں بھیگنا۔'' صائم نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ اسٹیپ عبور کر کے صائم کے مقابل آ گئی۔

''تمہیں بارش اچھی نہیں لگتی۔''

''نہیں.....'' وہ ہاتھ چھوڑ کر تھوڑا اور پیچھے دیوار کی طرف ہو گیا۔

''اس لیے تمہیں محبت بھی اچھی نہیں لگتی۔'' سیماب نے رخ اس کی طرف کیا۔ بارش اب اس کے عقب میں تھی۔

(''محبت اگر مجسم ہوتی تو پھانسی چڑھا دیتا'')

''تم سے کس نے کہا؟''

''محبت، بارش اور گلاب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' سیماب نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے۔

(محبت کی بربادی اور بارش کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور رہے گلاب تو وہ لہو رنگ ہو گئے تھے.....)

''وقت بدل گیا ہے سیماب بی بی! اب محبت، ایزی لوڈ اور مہنگی شاپنگ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' صائم نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکالی۔

''محبت کی سمجھ نہیں ہے تو اس کی توہین بھی مت کرو۔'' سیماب بگڑ کر بولی۔

صائم کا دل چاہا قہقہہ لگائے..... جو محبت کا آخری باب پڑھ چکے تھے، لوگ انہیں پہلا سبق پڑھا رہے تھے۔

''مذاق کر رہا تھا، تم تو سنجیدہ ہی ہو گئیں۔''

''تمہارے مذاق تمہاری طرح بے ہودہ ہیں۔'' سیماب نے اوک میں پانی بھرا اور صائم کی طرف اچھال

دیا۔ چند چھینٹے اس تک پہنچے۔ بالکل سیماب کی محبت کی طرح.....

''میں تو واقعی بہت سنجیدہ ہوں۔''

''سنجیدہ تو میری ماں بھی بہت ہے۔ تم انہیں اتنی پسند آئی ہو کہ بس نہیں چلتا آج ہی انگوٹھی پہنا جائیں۔''

سیماب کا دل بلیوں اچھلنے لگا مگر بظاہر بے نیازی سے گویا ہوئی۔

''تو تمہیں کیا پرابلم ہے؟''

''میں نے ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔'' دماغ کہتا تھا زندگی میں جو ہوا اسے بھول کر آگے بڑھ جاؤ.....اور کم بخت دل.....ایک قدم بھی اٹھانے نہ دیتا۔

''شادی کے بارے میں نہیں سوچا یا میرے بارے میں نہیں سوچا۔'' سیماب جیسی صاف گو لڑکی کو اس کا تذبذب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

''تم تو بہت اچھی لڑکی ہو۔''

''صائم.....'' سیماب چند قدم چل کر عین اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ بولی تو آواز صاف اور ٹھوس تھی اور لہجہ آر پار ہونے والا۔

''صائم! میں دیکھنے میں جذباتی لگتی ہوں مگر جذباتی ہوں نہیں.....اور نہ جذباتی ہو کر فیصلے کرتی ہوں۔ شاید میں نے اپنی ماں کو بہت مضبوط دیکھا ہے اس لیے۔'' اس نے کندھے اچکا کر صائم کے عقب میں گلاس ونڈو سے دکھائی دیتی ستارہ کو دیکھا۔ وہ فائقہ کے ہاتھ سے منہ میٹھا کر رہی تھیں۔

''تم مجھے صرف ایک بتاؤ، مجھ سے شادی کرو گے؟''

صائم کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح براہ راست اسے پرپوز کر دے گی۔

اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا، مگر بادل بہت زور سے گرجے۔

بجلی کہیں قریب ہی گری تھی.....یا پھر اس کے دل پر.....

وہ صائم کا واہمہ نہیں تھی۔

بارش کے پانیوں نے اس کا پیکر نہیں تراشا تھا۔

زوباریہ سرمد اتنے سالوں کے بعد مجسم اس کے سامنے اور سیماب کے عین عقب میں گھاس کے اسی قطعے پر کھڑی تھی جس پر روشنی پڑ رہی تھی۔

بارش اس کے گرد رقصاں تھی۔

بارش ان کے درمیان موہوم سا پردہ تھی۔

اور ایک بارش وہ تھی..... جب وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی.....

وہی بارش جس میں محبت کا پاکیزہ وجود زوباریہ کے شک کے ہاتھوں آلودہ ہوا تھا۔

وہی بارش..... جب صائم نے اپنے وجود سے بہتے لہو اور بارش کے نمکین پانیوں کو اکٹھے چکھا تھا۔

آسمان سے پانی نہیں کاغذ کے پرزے مزید ریزہ ریزہ ہو کر گر رہے تھے۔

''تمہیں تھوڑا عجیب لگا نا۔ لیکن میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اب کیا کریں؟ ایک بندہ آپ کو اچھا لگا ہے تو کہنے میں کئی سال لگا دیں۔'' سیماب کچھ کہہ رہی تھی۔

''تم چاہو تو انکار کر دو۔ کوئی مر تھوڑی جائیں گے، دل ہی تو ہے بہل جائے گا۔''

زوباریہ نے برآمدے کے اسٹیپ پر قدم رکھا۔

اور نفی میں گردن ہلائی..... اور بدلے میں صائم کی گردن اثبات میں ہل گئی تھی۔
''کیا؟'' سیماب نے کچھ نا سمجھی سے پوچھا۔
صائم نے نظر چھڑا کر سیماب پر مرکوز کی۔
''دلوں کو بہلایا نہیں جاتا۔ آباد کیا جاتا ہے۔''
زوباریہ کی سانس رک گئی۔
سیماب جوش میں بچوں کے بل گھوم گئی۔
''زیبی.....'' وہ پانی پانی ہوئی زیبی سے لپٹ گئی، جواب بھی اپنی نگاہ نہیں چھڑا پائی تھی۔
''آئی ایم سوپی یار! میں نے تم سے کہا تھا..... صرف میں ہی نہیں، وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔''
صائم کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ بکھر گئی۔
جو چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ وہ بھی جذباتی فیصلے نہیں کرتا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر زیبی سے ایک ایک زخم کا حساب لینے کا فیصلہ کر لیا تھا..... اور زیبی نے اس کی مسکراہٹ کو حرف حرف سمجھ لیا تھا۔
اور لرز کر رہ گئی۔
صائم اندر چلا گیا تھا۔
''چلو، تمہیں اس کی مدر سے ملواؤں۔'' سیماب نے اس کا ہاتھ کھینچا تو پتھر کے بت کے میں جان پڑ گئی۔
''اس حلیے میں سامنے نہیں جا سکتی..... بلکہ بتانا بھی نہیں کہ میں گھر واپس آ گئی ہوں۔'' زیبی ٹال کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

ستارہ نے محمود صاحب کے لیے سارا کھانا بھجوایا تھا..... مگر ان کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صائم نے دوبارہ سے ٹرائفل کا باؤل بھر لیا۔ فائقہ نے باقی سارا کھانا فریزر میں رکھ دیا۔
انہیں کل چلے جانا تھا۔ نواسا، نانا کھاتے رہیں گے۔ انہیں مزید کچھ بنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
اب وہ جوش میں ساری تفصیل بتانے بیٹھ گئی تھیں اور محمود صاحب کی نظریں لاپروائی سے ٹرائفل کھاتے صائم کے چہرے پر کچھ کھوج رہی تھیں۔
ان کی نظروں میں اتنی چبھن تھی کہ صائم کے لیے کھانا مشکل ہو گیا۔
''مجھے نیند آ رہی ہے مما! سونے جا رہا ہوں۔''
''بیٹھ جاؤ۔ مجھے دوائیاں کون دے گا تمہارا باپ۔'' وہ جھنجلا کر غصہ ہوئے۔
''میں دے دوں گی۔'' فائقہ نے حیرت سے ان کا غصہ ملاحظہ کیا۔
''تم تو جان چھوڑو۔'' وہ چڑ کر بولے۔
فائقہ ہکا بکا رہ گئیں تو محمود صاحب سنبھل کر قدرے پیار سے بولے۔
''صبح تمہیں جانا بھی ہے، جا کر آرام کر لو۔ مجھے اس ناہنجار سے دو دو ہاتھ..... مطلب دو چار باتیں کرنی ہیں۔'' پتا نہیں آج زبان بار بار پھسل رہی تھی۔ زیبی کی بے یقین آنکھیں ذہن کی اسکرین پر پیوست ہو گئی تھیں۔
فائقہ کو بھی احساس ہوا کہ باپ کسی الجھن میں ہے اور الجھن صرف صائم سے شیئر کرنا چاہتا ہے تو شب بخیر کہہ کر اٹھ گئیں۔
''مجھے ایسے گھورنا بند کریں۔'' وہ جوان کی نظروں سے بچنے کے لیے پائن ایپل کے ٹکڑے باؤل میں گن رہا

تھا، پیالہ پٹخ کر بولا۔
''اسی لیے تو کہتا تھا فیصلہ کرنے سے پہلے زیبی کے بارے میں ضرور سوچ لینا۔''
اس صورت حال سے وہ خود بہت دکھی تھے۔
''آپ جانتے تھے، وہ سیماب کی کزن ہے؟''
''بہت پہلے جان گیا تھا۔''
''مجھے کیسے نہیں پتا چلا۔'' اس نے بے بسی سے ہاتھ جھٹکا۔
''کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا۔'' محمود صاحب نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ جب زیبی نے ان کے پاس باقاعدہ آنا شروع کیا تب تک صائم یہاں سے جا چکا تھا۔ اپنی تعلیم میں گم ہو کر کئی سال یہاں نہ آیا۔ زیبی مستقل آ رہی تھی مگر ہر اسٹوڈنٹ کی طرح اس کی حد بھی بیرونی برآمدہ ہی تھا۔ بہت ہوا تو کچن..... باقی کمرے بند ہی رہتے۔
''آپ کو اندازہ ہے، آپ کے اس نہ چاہنے نے مجھے کس دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔''
وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں چکرا رہا تھا۔
جس انتقام کے چکر میں وہ سیماب کو ''ہاں'' کر کے آیا تھا، اس کی آگ سرد پڑنے لگی تھی۔
یاد تھا تو بارش کے پانیوں میں گھلتا زیبی کا وجود اس کی بے یقین آنکھیں۔
ہائے، کون کہتا ہے محبت مر جاتی ہے.....
کم بخت دل کے کسی کونے میں سر رکھ کر سسکتی رہتی ہے.....
جہاں نکال کر پھینکنے کا سوچو..... اس کی کراہ روح کھینچ لیتی ہے.....
دار پر چڑھا دیتی ہے.....
وہ بھی تڑپ رہا تھا۔ خود کو زندہ رکھنے کے لیے پاؤں مار رہا تھا۔
''اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی یا گزری محبت یاد آ گئی۔''
محمود صاحب نے سوال کیا۔
''سیماب کا کیا ہوگا؟'' وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسے خود بھی اندازہ ہو رہا تھا، اس نے ساری عمر جذباتی فیصلے ہی کیے ہیں۔
''اسے میں سنبھال لوں گا۔ ابھی تمہاری محبت میں اتنی دور نہیں نکلی ہوگی کہ واپسی مشکل ہو جائے۔ نہ اس نے زیبی کی طرح ساری کشتیاں جلائی ہیں۔''
''اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ غصے میں کمرہ چھوڑ گیا۔
محمود صاحب نے فیصلہ کر لیا۔ وہ سیماب سے خود بات کر لیں گے۔

☆☆☆

مگر اس سے پہلے ہی زیبی نے سیماب سے بات کر لی تھی۔
رات کی بارش کے بعد ایک خوش گوار صبح کے قدم دھرتی کے ٹھنڈے وجود پر اترے تو روح تک شانت کر گئی۔ سیماب کے تو ویسے ہی قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اس نے بوا سے فرمائش کر کے افغانی آملیٹ بنوایا تھا۔
وہی کھاتے ہوئے اس نے زیبی سے پوچھا۔
''تمہیں ایسا ایسا کیسا لگا؟''

''تم اس کا نام کیوں نہیں لیتی ہو؟'' زیبی کو بے تحاشا غصہ آیا۔ جب تک دونوں کی لڑائی تھی۔ سیماب نے اس کے ہزار برے برے نام رکھے تھے۔ بے وقوف...... گھونچو...... گھامڑ...... زوباریہ کو اندازہ ہو جاتا، وہ اپنے کولیگ کی بات کر رہی ہے۔ محبت کا احساس ہوتے ہی وہ ایس ایس ہو گیا تھا۔ سیماب اور صائم۔

سیماب نے بس ہنس کر دونوں آنکھیں دبائیں۔

''اچھا بتاؤ نا، کیسا لگا؟'' ستارہ آفس جا چکی تھیں۔ اس لیے وہ تسلی سے کزنز ٹاک کرنا چاہ رہی تھی۔ زوباریہ نے ہاتھ سے کانٹا رکھ دیا۔ اسے لگا سیماب سے بات کرنا ہو گی۔ وہ سیماب کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اس سے شادی مت کرو۔''

''کیا؟'' سیماب کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔'' زوباریہ کی سمجھ میں نہیں آیا اسے کیا وجہ بیان کرے کہ سیماب اپنے ارادے سے باز آ جائے۔

''لیکن مجھے تو وہ اچھا لگتا ہے۔''

''وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔''

''زیبی! تم اسے جانتی ہی کتنا ہو؟'' سیماب کو چڑ ہونے لگی۔ وہ اس وقت صرف زیبی سے تعریف سننا چاہتی تھی۔

(''میں ہی تو اسے جانتی ہوں'')

''کسی کو جاننے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ وہ شخص تمہارے قابل نہیں ہے، پلیز اسے چھوڑ دو۔ تمہیں اس سے کہیں اچھا لڑکا مل جائے گا۔''

''او کے۔'' سیماب نے نیپکن اٹھا کر منہ صاف کیا پھر براہ راست زیبی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''لیکن یہ تو بتاؤ، اسے کس کے لیے چھوڑ دوں۔''

زیبی لاجواب ہو گئی۔

کچھ بولنا چاہا، مگر مناسب لفظ نہ ملے۔ وہ بغیر تیاری کے سیماب کو قائل کرنے بیٹھ گئی تھی۔

''زیبی! میں کوئی بچی نہیں ہوں کہ اپنے بارے میں درست فیصلہ نہ کر سکوں۔ مجھے نہیں پتا وہ تمہیں کیوں اچھا نہیں لگا...... اور جسے چھوڑنے کا سوچ کر میری سانس بند ہونے لگتی ہے، اسے میں اس بنا پر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔''

وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی پھر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔'' ہلکا سا وقفہ، جس میں زیبی بس ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتی رہی تھی۔

''اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اس کی ماں رشتہ دے چکی ہے، اب بس رسم کرنے آئیں گی۔ اس لیے مائی کزن!'' بہت سنجیدہ لہجے میں بولتے بولتے وہ لائٹ موڈ میں آ گئی۔

''اب صائم تمہیں اچھا لگے یا برا، تم شادی کی تیاری کرو۔ او کے۔''

وہ زیبی کا کندھا تھپتھپا کر چلی گئی۔

زیبی بے بسی سے اسے جاتے دیکھتی رہی تھی۔

سیماب کا لہجہ بتا رہا تھا، وہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے آگے نکل چکی ہے۔

☆☆☆

''سنو۔ آئس کریم کھانے چلیں۔'' آفس سے نکلتے سیماب نے صائم سے پوچھا۔

وہ جو صبح سے اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا، ٹھٹک کر رکا۔
''بل میں دے دوں گی۔''
''بل کی بات کہاں سے آ گئی۔'' صائم نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
''وہ اس دن تم آج کل کی محبت کی تشریح کر رہے تھے نا.....'' کہتے کہتے اس نے شرارت سے زبان دانتوں تلے دبالی۔ صائم نے اسے گھورتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔
''میری کزن کو تم بالکل پسند نہیں آئے۔''
آئس کریم کارنر پر اپنا اپنا فلیور لے کر بیٹھے ہی تھے کہ سیماب نے بتایا۔
صائم نے چونک کر اسے دیکھا۔
''کہتی ہے تم سے شادی نہ کروں۔''
''اسے کیا اعتراض ہے؟'' صائم نے خود کو سنبھالا۔
''پتا نہیں۔ وہ تمہیں جانتی نہیں، تم سے ملی نہیں..... پھر بھی اسے تم پر اعتراض ہے۔'' آئس کریم میں چمچ گھماتے سیماب نے کندھے اچکائے۔
''وہ تم سے جیلس ہو رہی ہے۔'' صائم نے اپنے اندر ایک کمینی سی خوشی کو محسوس کیا۔
''نہیں۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ میں اسے اتنے سالوں سے جانتی ہوں۔ ہم بہنوں کی طرح رہے ہیں۔'' سیماب نے فوراً اس کی بات کو رد کیا۔
''وہ مجھ سے جیلس نہیں ہو سکتی۔''
''تو پھر.....؟'' نجانے وہ سیماب کے منہ سے کیا سننا چاہتا تھا۔
''دراصل اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔''
''کیا ہوا؟'' صائم ہلکا سا کھنکھار کر بولا۔
''وہ کسی سے محبت کرتی تھی..... مگر بریک اپ ہو گیا۔''
صائم نے لب بھینچ لیے۔
ایک عمر کی کہانی کو سیماب نے چند لفظوں میں کتنی لاپروائی سے سمو دیا تھا۔
''بریک اپ کس نے کیا؟''
''ہمیشہ لڑکے ہی بے وفائی کرتے ہیں۔''
''بکواس.....'' صائم نے دانت پیستے ہوئے اتنے زور سے چمچ مروڑا کہ ٹوٹ گیا۔
''کیا ہو گیا؟ میں نے تمہیں تو بے وفا نہیں کہا۔''
''نہیں، بس ایسے ہی.....''
''اچھا چھوڑو۔ مجھے لگتا ہے تم ڈسٹرب ہو رہے ہو۔ ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' سیماب نے بات بدلی۔
''بریک اپ کے بعد تمہاری کزن کی زندگی میں اور کوئی نہیں آیا؟'' صائم نے محتاط انداز میں سوال کیا۔
''نہیں..... بالکل نہیں۔ اس نے اپنا گول بنا لیا تھا کہ اسے ہر صورت اپنے فادر کا خواب پورا کرنا ہے اور وہ اس نے کر دیا۔''
بات کرتے کرتے سیماب کی نظر صائم کی آئس کریم پر گئی۔
''تمہاری آئس کریم پگھل رہی ہے۔ تم دوسرا چمچ منگوا لو۔''
''ہوں۔'' اس نے بے دلی سے سامنے رکھی آئس کریم کو دیکھا۔

زیبی اب تک کیا اس کے انتظار میں تھی۔
کیا ان دونوں کا رشتہ اب بھی زیبی کے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔
''فرض کرو، وہ اب بھی تمہاری منتظر ہو تو کیا کرو گے؟'' محمود صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔
تب جواب نہیں ملا تھا یا پھر اسے یقین تھا، وہ سامنے آئی تو بڑی سفاکی سے اسے ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے گا' جس طرح وہ بڑھ گئی تھی۔ مگر نجانے کیسے؟
اس کے قدم بارش کے پانیوں میں ڈوبے تھے۔
سامنے آسمان سے پانی کی چادر گر رہی تھی۔
اور اس کے پار.....
وہ تھی..... جس کا وجود بارش کے پانیوں میں گھل رہا تھا۔
''صائم.....'' سیماب نے نجانے کیا بات کی تھی۔
صائم نے بے حد بوکھلا کر شوخ رنگ لڑکی کو دیکھا۔
سیماب کو صائم کی محبت نہ ملی تو کیا اس کے سارے رنگ بھی اڑ جائیں۔ وہ بھی اتنی ہی بے رنگ دکھائی دے گی جتنا کہ زیبی.....
اس نے وحشت کے عالم میں آئس کریم کو ہاتھ مارا اور وہاں سے بھاگ آیا۔
سیماب نے حیرت سے میز پر بہتی آئس کریم کو دیکھا۔
اور دور جاتے صائم کو۔ جو گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مگر گاڑی بڑھانے سے پہلے اسے یاد آ گیا تھا سیماب اپنی گاڑی آفس میں ہی چھوڑ آئی تھی۔
اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

''ہمیں ہمیشہ لگتا ہے کہ ہم جذباتی فیصلے نہیں کرتے، مگر ہم کر لیتے ہیں۔'' توتوں کے پنجرے کو چھیڑتی سیماب نے زوباریہ کو دیکھا۔ آج اسے فرصت تھی تو چھوٹے سے لان کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔ اس سے پہلے اس نے کپڑے دھو کر ڈالے تھے۔
''پتا نہیں اسے ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادت کیوں ہے؟'' سیماب کو بلاوجہ کوفت ہوئی۔
''کچھ تم بھی ہاتھ بٹا دو۔'' اس کی نظروں سے الجھتی زوباریہ نے مڑ کر دیکھا۔
''کیا کر رہی ہو؟'' سیماب پاس آئی۔
''فالتو شاخیں الگ کر رہی ہوں۔''
''کیسے پتا چلتا ہے، یہ فالتو ہیں۔'' سیماب نے کٹر اٹھا کر دیکھا۔
''نظر آتا ہے۔'' زوباریہ نے سادگی سے جواب دیا۔
''میں نے ایک بات سوچی ہے۔''
''کیا؟'' زوباریہ کیاریاں صاف کرنے لگی۔
''تمہاری اور صائم کی ایک دو ملاقاتیں رکھ لیتی ہوں۔ اس طرح تم اسے بہتر طور پر سمجھ سکو گی۔''
''اس کی ضرورت مجھے نہیں، تمہیں ہے۔ اچھی طرح پرکھ لو، اسے بھی اور اپنے فیصلے کو بھی۔ کچھ لوگ راستے میں چھوڑ جانے والے بھی ہوتے ہیں۔''
زیبی کا کام ختم ہو گیا تھا، وہ سب سمیٹ کر اندر چلی گئی۔

دھیان کی میز پر پگھلی ہوئی آئس کریم قطرہ قطرہ زمین پر گر رہی تھی۔
''وہ اسے بھول گیا۔''
''لیکن میں اسے یاد بھی تو آ گئی تھی۔''
سیماب کے کانوں میں صائم کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔
لیکن ایک فیصلہ اس نے دل ہی دل میں کر لیا تھا۔ اسے منگنی میں جلدی نہیں کرنی۔ جب تک صائم کی ذات کی ساری گرہیں اس کے سامنے نہ کھل جائیں۔

☆☆☆

''یار! اب بس بھی کرو۔ صبح آفس کے لیے بھی نکلنا ہے۔ تم تو نہ خود سوتی ہو، نہ سونے دیتی ہو۔''
اوائل ستمبر کی خوش گوار رات تھی۔ ہلکی ہوا موتیے کی خوشبو چرا لائی تھی۔
''میری اماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ یہ جملہ ان کا ہے۔'' سیماب ہنسی۔
''سوری۔ میں آج.....'' صائم نے شرمندگی سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''تمہیں کیا ہوا تھا۔''
''کبھی کبھی یوں ہی وحشت سی ہونے لگتی ہے۔''
''یوں ہی تو کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔''
''تمہاری کزن نے دوبارہ کوئی اعتراض تو نہیں کیا؟'' صائم نے ٹاپک بدلا۔
''نہیں۔''
''تمہیں اس سے پوچھنا چاہیے تھا۔'' نجانے وہ کیا سننا چاہتا تھا۔
''جب وہ اس ٹاپک پر کھل کر بات نہیں کرنا چاہتی تو مجھے اس کی فیلنگز کو سمجھنا چاہیے۔ وہ محبت سے الرجک ہے تو میری محبت کو کیسے سمجھ پائے گی۔''
''ہوں.....'' صائم خاموش ہو گیا۔ اس کی بے توجہی محسوس کر کے سیماب نے گڈ نائٹ کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

''مجھے صائم سے بات کرنا ہے بابا!'' پیلے کپڑوں میں ملبوس ہم رنگ چہرہ لیے وہ سامنے کھڑی تھی۔ محمود صاحب ابھی ابھی نہا کر آئے تھے۔ ان کا روشن چہرہ بہت نکھرا لگ رہا تھا اور سپید بال آوارہ بدلیوں کی طرح اڑ رہے تھے۔
''میں نے خود کو بہت سمجھایا ہے۔ ہم الگ ہو چکے ہیں۔ وہ کسی کے بھی ساتھ زندگی گزارے، مگر وہ میری نظروں کے سامنے سیماب کے ساتھ.....'' اس نے اذیت کے ساتھ لب کاٹے۔
''میں کیسے برداشت کروں گی۔''
''تم سیماب کو بتا دو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔
''وہ بہت ہرٹ ہو گی یہ جان کر کہ صائم ہی وہ لڑکا ہے جس کے ساتھ میں.....''
اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں گردن ہلائی۔
''اس سے کہیں بہتر ہے کہ صائم خود سیماب کو چھوڑ دے۔''
''تم نے مشورہ دیا اور میں مان لوں گا۔'' صائم کی غصہ بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
زوبار یہ چونک کر اس کی طرف مڑی۔

اس دن تو ڈھنگ سے دیکھ ہی نہ سکی تھی۔
دن کی روشنی میں روبرو دیکھ کر احساس ہوا، وہ کتنا بدل گیا ہے۔
کہنی کے پاس ایک پرانی چوٹ کا نشان..... غالباً زیبی کی محبت کی نشانی تھا۔
زیبی ایک لمحے کو بولنا بھول گئی تھی۔
محمود صاحب ہکا بکا سا کھنکھارے اور کھڑے ہو گئے۔
''ٹھیک ہے، تم دونوں آپس میں بات کر لو۔''
ان کے جانے کے لمحے تک زیبی نے خود کو سنبھال لیا تھا۔
''اور تمہیں کیا تکلیف ہے، میں کس سے شادی کر رہا ہوں۔'' نانا کے جانے کے بعد وہ پلٹا۔
صائم کی آنکھیں آگ اگل رہی تھی۔ زندگی میں کبھی زیبی نے اس کی آنکھوں میں اتنا غصہ نہیں دیکھا تھا۔
''سیماب سے شادی مت کرو۔''
''تو کس سے کروں؟ تم سے؟'' وہ دو قدم اس کی طرف بڑھا۔
زیبی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
''مگر تم تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔''
''پرانی باتیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔'' زیبی نے نظریں چرائیں۔
''پرانی باتیں.....'' صائم جل کر راکھ ہوا۔ ''کچھ زخم کبھی نہیں بھرتے۔ ناسور بن جاتے ہیں۔'' صائم نے اس ستون پر ہاتھ رکھا جس کے ساتھ زیبی لگی کھڑی تھی۔
''تمہیں پرانی باتیں لگتی ہیں۔ میں تو اب بھی وہیں پڑا ہوں سڑک کے کنارے، بارش کے پانی میں بہتا، اپنا ہی خون دیکھ رہا ہوں۔''
اس کی جلتی بجھتی آنکھیں زیبی کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔
وہ منہ نہ پھیرتی تو جل کر راکھ ہو جاتی۔
صائم نے بڑی سختی سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔
''منہ کیوں پھیر لیا۔ مجھے دیکھو..... غور سے دیکھو.....''
تکلیف سے زیبی کی کراہ نکل گئی۔
''میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا، جس پر زخم نہ ہو۔ ٹوٹی ہڈیوں کی اذیت برداشت کرتے میں تمہیں پکار رہا تھا..... مگر تم کہاں تھیں؟''
زیبی نے اسے پیچھے دھکیلنا چاہا..... مگر وہ اس پر حاوی تھا۔
''جب دانیال مجھے مار رہا تھا..... میں تمہیں پکار رہا تھا زیبی! مگر تم کہاں تھیں..... مگر تم تو وہاں سے بھاگ آئی تھیں۔ یہ تھا میری محبت کا انجام..... میری محبت کا صلہ.....''
صائم نے اسے دھکیل کر چھوڑ دیا۔
زیبی رو پڑی۔ سر ستون سے ٹکرایا تھا..... یا صائم کی اذیت دل کو چیر گئی تھی۔
''رونا مت..... میرے سامنے رونا مت۔'' وہ انگلی اٹھا کر چلایا۔
''میں ڈر گئی تھی..... ہمارے ساتھ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔''
''کیوں ڈر گئی تھیں۔ کیا میں نے تمہیں چھوا تھا۔ کوئی زیادتی کی تھی۔ تمہارا فائدہ اٹھایا تھا۔'' وہ پاگل ہو کر چیخا۔

زیبی چپ ہوگئی۔ وہ دوسرے ستون پر بند مٹھی جمائے ضبط کی کڑی منزلیں طے کر رہا تھا۔
''میں آئی تھی..... تم نے کہا، تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔''
''تو کیا تب بھی تم سے محبت کرتا۔'' وہ پلٹا۔
''آئی ایم سوری۔'' لبوں پر ہاتھ رکھے وہ روتی چلی گئی۔
''رونا بند کرو۔'' صائم نے دانت پیسے۔
وہ تب بھی چپ نہ ہوئی۔
''کیوں روتی جا رہی ہو۔''
جواب ندارد تھا۔
صائم نے غصے سے آ کر اس کے ہاتھ ہٹائے اور اس کے گال رگڑ ڈالے۔
''تمہیں لگتا ہے، میں تمہارے آنسوؤں سے پگھل جاؤں گا۔''
زیبی کے گال جلنے لگے۔
''اس لیے میرے سامنے اپنے قیمتی آنسو ضائع مت کرو پرنس۔'' وہ طنزیہ کہہ کر رخ موڑ گیا۔
زیبی اب اس کی پشت دیکھ رہی تھی۔
غصہ ابل کر بہہ گیا تھا۔
وہ خود کو پرسکون کرتا اپنی پشت پر موجود زیبی کی موجودگی پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔
''کسی سے بھی شادی کر لو..... مگر سیماب سے نہیں۔''
''کیوں.....؟'' صائم نے بغیر مڑے پوچھا۔ لہجہ مدھم تھا۔
''ہم ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ہر وقت کا سامنا ہوگا۔ سیماب کیسے برداشت کرے گی اور میں کیسے سہوں گی۔ دنیا کچھ نہیں بھولی، پھر سے وہی کہانی دہرائے گی۔''
''تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' دونوں ہاتھ کے انگوٹھے جینز کی جیبوں میں اڑستے صائم نے بغیر اس کی طرف مڑے سوال کیا۔
''نفرت تم نے کی تھی۔ میں نے نہیں۔'' ہلکے سے توقف کے بعد گہری سانس لے کر زیبی نے کہہ دیا۔
''ہا..... نفرت.....'' صائم نے پیر سے زمین کو ٹھوکر لگائی۔ ''وہ نفرت، جو تمہارے دو آنسوؤں میں بہہ گئی۔''
صائم نے بے بسی سے سر جھٹکا۔
''کتنے برس خود کو یہ سبق پڑھاتا رہا کہ تمہاری شکل دوبارہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ سامنے بھی آئیں تو پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ مگر ہوا کیا..... سارے سبق، ساری نفرت، سارے زخم بھول گیا۔''
زیبی ششدر سی اس کی پشت کو تکتی رہی۔
وہ یہاں صائم سے یہ سب سننے نہیں آئی تھی۔
''ٹھیک ہے۔'' وہ صائم کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر سکتی تھی۔
''میں ہار گیا۔ نہیں کروں گا سیماب سے شادی..... لیکن ایک شرط ہے۔''
وہ آہستگی سے اس کی طرف گھوما۔
''کیسی شرط؟''
''تم آ جاؤ میری زندگی میں۔'' صائم نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ پھیلایا۔

زیبی نے اس کی پھیلی ہتھیلی کو دیکھا۔ دل چاہا، اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر زندگی کی اس ٹرین پر سوار ہو جائے جس کی آخری منزل موت ہے۔

''اگر اتنے سالوں کی دوری ہماری محبت ختم نہیں کر سکی تو ہمیں ایک ہو جانا چاہیے۔''

اس نے مٹھی بند کر لی۔

''اب یہ ممکن نہیں۔'' یہ کہتے زیبی کا دل کر لایا۔

''اب ہی تو ممکن ہے۔'' صائم نے پاس آ کر زیبی کے کندھے کو چھوا۔

''ہم اب بااختیار ہیں۔''

''نہیں.....'' زیبی نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ اب ہی تو سب کچھ ٹھیک ہوا تھا۔ اس کے اپنوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اسے اس کے رشتے واپس ملے تھے۔ ابھی تو سب کچھ سمٹا تھا۔ پھر سے کیے بکھیر دیتی۔ محبت کے مزاج میں بڑا کمینہ پن ہے۔ ہمیشہ دو میں سے ایک کی چوائس دیتی ہے۔

زیبی کو ایک بار پھر دونوں میں سے ایک کو چننا تھا۔

اس نے ایک بار صائم کو چنا تھا۔

وہ پھر سے اپنے گھر والوں کو دھتکار نہیں سکتی تھی۔

''سیماب سے دور رہو۔ تم کبھی اسے سچی محبت نہیں دے سکتے۔ اس بات کو سمجھو، تم اسے کبھی خوش نہیں رکھ پاؤ گے۔ تم خود اس رشتے سے انکار کر دو..... سنا تم نے۔''

''آہ.....'' صائم نے کرب سے لب بھینچے۔ اس نے ایک بار پھر صائم کو بے اعتبار کر دیا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے۔

''زیبی!'' دونوں اپنی اپنی جگہ ششدر رہ گئے۔

پھر دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

سیماب بے یقینی سے زیبی کو دیکھتی نفی میں گردن ہلاتی ہاں سے بھاگ گئی۔

''سیماب..... سیما..... میری بات تو سنو.....'' زیبی اس کے پیچھے چلی گئی۔

صائم وہیں کھڑا دونوں کو آگے پیچھے جاتا دیکھتا رہا۔

پھر نڈھال سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

محمود صاحب بہت انتظار کے بعد خود ہی باہر آ گئے۔ صائم نے ان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنی اور مزید سر جھکا لیا۔ مختلف کیفیات کا جوار بھاٹا تھا جس میں وہ ڈوبتا ابھرتا تھا۔

''صائم.....'' ان کا بھاری پر شفقت ہاتھ صائم کے کندھے پر تھا۔

''لڑکیاں اتنی بزدل ہوتی ہیں تو محبت کیوں کرتی ہیں؟ اپنے گھر والوں سے ڈرتی ہیں..... میں خود اس کے گھر والوں سے بات کر لوں گا۔ سیماب کو بھی سنبھال لوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ ایک بار پھر مجھے ٹھوکر مار کر چلی گئی۔''

''میں نے کہا نا..... وہ.....'' محمود صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

صائم ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

''بس، بہت ہو گیا۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور زمانے سے ڈرتی ہے۔ اسے میرا ساتھ بھی چاہیے اور گھر والوں کا بھی..... اور جب یہ ساری باتیں ایک ساتھ ممکن ہی نہیں تو پھر بات ایک ہی ہے کہ ہمارے راستے الگ ہیں۔''

''خود کو تکلیف دو گے؟''

''میں اپنے حصے کی تکلیف اٹھا چکا..... اب اس کی باری ہے۔''

نانا اس کے لہجے کی پھنکار سے ڈر گئے۔

''تم غلط کرو گے۔''

''دیکھتے ہیں.....'' وہ بے زاری سے کہہ کر اندر چلا گیا۔ محمود صاحب بے بسی سے صائم کو جاتے دیکھتے رہے کیونکہ جب انہوں نے زیبی سے کہا تھا کہ وہ خود اس کے گھر والوں سے بات کریں گے تو زیبی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''میرا باپ ایک بار بچ گیا ہے بابا! دوسری بار نہیں بچے گا۔''

محمود صاحب کو لگا، شاید دونوں آمنے سامنے بات کریں تو کوئی حل نکل آئے، مگر ایک بار پھر معاملہ وہیں کا وہیں لٹک گیا تھا۔

☆☆☆

سیماب غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔

''سیما..... میری بات سنو..... ویسا کچھ نہیں جیسا تم سمجھ رہی ہو۔''

''میں خود سنا اور دیکھا ہے زیبی! تم اس کی منتیں کر رہی تھیں کہ وہ مجھ سے شادی نہ کرے۔ تم ایسے کیسے کر سکتی ہو۔'' وہ حلق کے بل چلائی۔

''ایک بار میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔'' زیبی نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا مگر ستارہ آ گئی تھیں۔

''یہ کیسا شور ہے؟''

''اپنی لاڈلی بھانجی سے پوچھیں۔ یہ نہیں چاہتی، میرا رشتہ صائم کے ساتھ ہو۔''

زیبی ایک دم چپ ہو گئی۔

ستارہ نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

''سیما! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ صائم کا رشتہ تمہارے لیے آیا ہے، اس کی امی منگنی کے لیے آنا چاہ رہی ہیں۔''

''یہ ہونے دے گی؟'' سیماب نے زیبی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ و انداز دونوں ہی بدل گئے تھے۔

''یہ کیوں نہیں ہونے دے گی۔'' ستارہ پریشان ہو گئیں۔

آج بہت عرصے کے بعد انہیں سیماب میں بچپن والی سیماب نظر آئی جو اپنی ہر چیز کے لیے اتنی پوزیسو تھی کہ چیز توڑ دیتی تھی مگر کسی کو دیتی نہ تھی۔ وہ تو خوش تھیں کہ زیبی کی سنگت میں ان کی بیٹی میں بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''ویٹ آمنٹ۔'' سیماب اپنے ہی کسی خیال کے ہاتھوں چونک گئی۔

''تم بھی محمود صاحب کے گھر آتی جاتی رہی ہو۔ وہیں صائم سے ملی ہو گی..... تمہیں بھی وہ پسند آ گیا ہو گا۔ ہے نا..... یہی بات ہے۔''

''زیبی! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ستارہ نے پریشان ہو کر زیبی کو دیکھا۔

''یہ کیا بتائے گی، مجھ سے پوچھیں۔ صائم کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے شادی نہ کرے۔''

''سیماب! میری بات تو سنو۔'' زیبی جھنجلا گئی۔

''میرا نام نہ لینا۔ میں نے تمہیں بہن سمجھا۔ دوست بنایا..... مگر تم ایک چھوٹے ذہن کی کم ظرف لڑکی ہو..... مگر ایک بات یاد رکھنا، تم زندگی بھر صائم کو مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔'' وہ غصے میں راستے میں آئی ہر چیز کو

تھوکر مارتی وہاں سے چلی گئی۔
ستارہ نے بہت پریشان ہو کر زوباریہ کو دیکھا۔
''زیبی! کیا ہوا تھا؟''
''خالہ! پلیز مجھے غلط مت سمجھیں۔ مجھے لگا، صائم سیماب کو وہ محبت نہیں دے سکتا، جو وہ ڈیزرو کرتی ہے۔''
''یعنی تم نے واقعی صائم سے کہا تھا۔'' ستارہ حیران پریشان رہ گئیں۔
زوباریہ نے مجرموں کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔
''اور تمہیں ایسا کیوں لگا تھا؟''
ستارہ کے سوال نے زوباریہ کو لاجواب کر دیا۔
جواب دے بھی تو کیا.....
ستارہ کے اندر دور کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔
کچھ تو ایسا تھا جو ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔

☆☆☆

زوباریہ اپنے کمرے میں بند تھی اور سیماب جلے پیر کی بلی بنی پورے گھر میں گھوم رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی بہنوں جیسی کزن اور دوست اس کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔
''یقیناً اس نے جیلسی میں یہ سب کیا ہے۔''
اسے صائم کی بات پر اعتبار آنے لگا۔
''لیکن اسے یہ اعتبار کیوں تھا کہ صائم اس کی بات مان لے گا۔''
سیماب کی الجھن زبان پر آئی تو ستارہ کا دماغ جھنجھنا گیا۔
(''ایسا تو بہت قریبی رشتے میں ہوتا ہے۔ اتنا مان تو کسی اپنے کو دکھایا جاتا ہے'') انہوں نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا۔
وہ بوا جی کے بے حد اصرار پر انگور توڑنے بیٹھی تھی۔
''جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید کیا۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے، اس نگوڑی کو گھر میں مت رکھیں۔ مگر یہاں میری سنتا کون تھا۔''
بوا اپنے راگ الاپ رہی تھیں۔
ستارہ کے سر میں درد ہونے لگا۔
''اماں! چپ کیوں سادھ لی ہے۔'' سیماب کو ماں پر غصہ آنے لگا۔
''مجھے اس سے بات تو کرنے دو سیما.....!''
''آپ..... بی بی! اب بھی اس کی سائیڈ لیں گی۔'' بوا نے تعجب سے ستارہ کو دیکھا۔
''بوا! آپ بھی بس جلتی پر تیل ڈالیں گی۔'' ستارہ کو غصہ آنے لگا۔
''اس میں جلتی پر تیل کی کیا بات ہے۔ بس اسے اس گھر سے چلتا کریں۔''
ستارہ نے بے حد غصے سے بوا کو دیکھا، وہ جو سیماب کی محبت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔ دم سادھ کر بیٹھ گئیں۔
''رہنے دیں بوا! ان کی لاڈلی بھانجی کو کچھ مت کہیں۔ وہ بھلے کچھ بھی کرتی رہے، میری تو سمجھ سے باہر ہے، وہ اتنی جرأت کیسے کر گئی۔'' سیماب نے پھلوں کی ٹوکری پرے دھکیل دی اور خود تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔
''اب یہ کوئی چھوٹی بات تو ہے نہیں ستارہ بی بی! مٹی کا مادھو نہ بنیں۔ بیٹی کی خوشیوں کا سوال ہے۔'' بوا

سے پھر نہ رہا گیا۔
''بوا! چھری تلے دم تو لیں۔ دیکھ رہی ہوں سارے معاملے کو۔ اٹھائیں یہ سارا سامان کچن میں لے کر جائیں۔''
ستارہ نے اتنے غصے میں کہا کہ بوکو کچھ اور کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ خاموشی سے سامان اٹھا کر چلی گئیں۔
ستارہ اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں وہیں بیٹھی رہ گئیں۔
''خالہ!'' وہ زوباریہ کی آواز پر چونکیں۔
''زوباریہ! اگر تمہارے پاس کوئی معقول وجہ ہے تو بتانا..... ورنہ بیٹا، میں تمہیں کبھی ڈیفنڈ نہیں کرسکوں گی۔ سیماب یہی سمجھتی ہے کہ تم نے اس سے جیلس ہوکر یہ سب کیا ہے۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔'' ان کا لہجہ نرم پھوار کی طرح جلتے بلتے دل پر پڑا۔
''شاید ایسی ہی بات ہے۔'' زوباریہ نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔
ستارہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئیں۔
''کہاں کہاں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ ہر مشکل وقت میں تمہارے ساتھ کھڑی رہی ہوں۔ بیٹی بنا کر لائی تھی۔ بیٹی کی طرح محبت کی۔ اتنا ہی سوچ لیا ہوتا کہ خالہ پر کیا بیتے گی۔''
''آئی ایم سوری خالہ!'' زیبی کا لہجہ بھیگ گیا۔ ''مجھے معاف کردیں۔''
''زیبی! یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔''
وہ خاموشی سے آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔
''دیکھو بیٹا!'' انہوں نے نرمی سے زوباریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ''اولاد سے پیارا رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا اور میرے پاس تو سیماب کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اسے دکھ ہو، کوئی تکلیف پہنچے..... میں تو مر ہی جاؤں گی۔''
''اللہ نہ کرے خالہ! کیسی باتیں کررہی ہیں۔'' زوباریہ تڑپ کر بولی۔
''تمہیں صائم کے بارے میں کوئی بات پتا چلی ہے، کوئی ایسی بات جو ہم نہیں جانتے۔''
زیبی نے نفی میں گردن ہلائی۔
''کیا تم اسے پہلے سے جانتی ہو؟''
زیبی نے تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔
واپس آتی سیماب اسے ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔ مگر بظاہر نارمل انداز میں آ کر ستارہ کے عقب میں کھڑی ہوگئی۔
''اماں! صائم کی کال تھی۔ اس کی مدر اس جمعہ کو منگنی کرنا چاہ رہی ہیں۔'' زوباریہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر سیماب کو دیکھا۔
وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔
''ہاں، ان کی مجھے بھی کال آئی تھی۔'' ستارہ نے آہستگی سے بتایا۔
''صائم چاہ رہا ہے، میں منگنی کی انگوٹھی اس کے ساتھ جا کر خریدوں۔''
سیماب کی آنکھیں جتا رہی تھیں۔ دیکھو تمہارے کہے کا صائم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
''مبارک ہو سیما!'' زوباریہ کھڑی ہوگئی۔
''شکریہ۔ زیبی! میری بات سن کر جاؤ۔''
زوباریہ جاتے جاتے رک گئی۔
سیماب اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''دیکھو، ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ گزارا ہے۔ میں اسے اچھے طریقے سے ختم کرنا چاہتی ہوں۔''
زیبی نے بغیر نظریں ملائے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''تم نے صائم سے جو بھی کہا، جس نیت سے کہا۔ تمہاری ان سیکیورٹی یا حسد..... یا جو بھی..... لیکن اب میں چاہوں تو بھی تمہاری طرف سے اپنا دل صاف نہیں کر سکتی۔''
زیبی نے گہرا سانس لیا۔
سیماب نے ایک نظر ماں کو دیکھا جو غالباً اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
''ہو سکتا ہے محبت کی ناکامی نے تمہیں اتنا بے اعتبار کر دیا ہو کہ تمہیں ہر محبت کرنے والا برا لگتا ہو۔''
زوباریہ نے سنبھل کر سر اٹھایا۔
''میرا تجزیہ کرنے کے بجائے ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔''
''ٹو دی پوائنٹ بات یہ ہے کہ میری اور صائم کی منگنی سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔''
کچھ لمحے زوباریہ اور ستارہ کچھ بول ہی نہ سکیں۔
پھر زوباریہ نے ستارہ کو دیکھا اور کچھ بھی کہے بغیر اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔
اس کی محبت کی دین تھی یہ دربدری.....
پھر سے اذنِ سفر مل گیا تھا۔
''سیماب! تمہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔''
''کیوں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ نے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا تھا۔ وہ صائم کو کس طرح دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی حسرت سے مجھے خوف آنے لگا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری اور صائم کی محبت اور رشتے کو کسی کی نظر لگے۔''
سیماب نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔
''تیار ہونے جا رہی ہوں۔ صائم آنے والا ہوگا۔''
ستارہ نے گہری سانس لے کر چپ سادھ لی۔
ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ اس سچویشن کو کیسے ہینڈل کریں۔

☆☆☆

یہ وہ شہر تھا جس نے زوباریہ کو اس وقت پناہ دی جب اپنے شہر میں زندگی تنگ ہو رہی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے، انہوں نے اس وقت زوباریہ کی شخصیت کو تعمیر کیا، جب اس کے اپنوں نے اس کی شخصیت کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔
تکلیف تھی..... بہت تکلیف تھی۔ مگر یہ طے تھا کہ اب یہاں سے چلے جانا ہے۔
یہاں سے دانا پانی اٹھ گیا تھا۔
اس نے بیگ کی زپ بند کی اور کمرے پر ایک نظر ڈالی۔
دیواریں خالی تھیں۔ اس کی اور سیماب کی تصویریں اتر چکی تھیں۔
ان کے قہقہے خالی دیواروں سے لپٹے سسک رہے تھے۔
بستر میں چھپ کر، ستارہ کی نظر بچا کر کی گئی سرگوشیاں اور باتیں تکیے کے غلاف میں لپٹی آخری سانس لے رہی تھیں کیونکہ زوباریہ جا رہی تھی..... اس کے جانے کے بعد سیماب ان سب کو اٹھا کر باہر پھینک دے گی۔
بالکل اسی طرح جس طرح اس نے زوباریہ کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ آہٹ پر زوباریہ نے تیزی سے چہرہ صاف کیا۔

"پیکنگ ہوگئی۔" ستارہ اندر آئیں۔
"جی۔" زوباریہ نے دوبارہ کمرے کو دیکھا۔
"کچھ رہ تو نہیں گیا؟"
"جو رہ گیا، وہ لے جا نہیں سکتی خالہ!" وہ بدقت مسکرائی۔
"زیبی!" ستارہ نے پیار سے اس کا چہرہ چھوا۔ "میں نہیں چاہتی تھی، تم اس طرح جاؤ۔"
"میں بھی نہیں چاہتی تھی۔"
"تم نے بہت جلدی کی۔"
"بس خالہ! دانا پانی اٹھ گیا اور دل بھی۔" اپنے تاثرات چھپانے کو زیبی نے خواہ مخواہ ہینڈ بیگ کھولا تو اس میں رکھے چیک پر نگاہ گئی۔
"تمہیں ریزائن نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"چھٹی نہیں مل رہی تھی۔"
"ہاسٹل میں رہ لیتیں یا میں کہیں اور بندوبست کر دیتی۔ جاب اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔"
وہ جس طرح یہاں سے جا رہی تھی، ستارہ کو تکلیف ہو رہی تھی۔
"خالہ! جب جانا ہی ٹھہرا تو دیر کیا اور سویر کیا۔ آپ ٹینشن مت لیں، میں پرانی والی زوباریہ نہیں ہوں۔" اس نے چیک نکالا۔
"خالہ! میں آپ کی محبتوں کی قرض دار ہوں..... چھوٹا سا اماؤنٹ ہے۔ آپ نے میری میڈیکل کی پڑھائی کے لیے بہت خرچا کیا۔ مگر اس پیسے پر سیماب کا حق ہے۔"
"اسے واپس رکھ لو۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
"نہیں خالہ..... میں....."
"زیبی!" انہوں نے نرمی سے زیبی کی بات قطع کی۔ "تمہاری میڈیکل کی پڑھائی کا سارا خرچا تمہارے ابو کے کہنے پر تمہارے تایا نے دیا تھا۔"
زوباریہ ہکا بکا رہ گئی۔
"میں نے تو ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا۔ اسے اندر رکھو، مجھے تم سے صرف ایک بات پوچھنا ہے۔" انہوں نے خود ہی چیک لے کر بیگ میں ڈال دیا۔
"جی خالہ!"
"بنا بتائے چلی جاؤ گی تو ساری زندگی خلش رہے گی۔"
زوباریہ نے الجھ کر ستارہ کو دیکھا۔
انہوں نے ہلکے سے توقف کے بعد ایک دم پوچھ ڈالا۔
"تم صائم کو پہلے سے جانتی ہو؟"
سیماب دروازے میں کھڑی ہوگئی۔
یہی تو وہ سوال تھا جو اس کے اندر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔
"کیا صائم وہی لڑکا ہے جس سے تم محبت کرتی تھیں؟"

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

شازیہ الطاف ہاشمی

خواب سفر

ماں کے لہجے کا غرور بے وقوفانہ سا لگ رہا تھا۔

''بھابھی! ابھی زارا کی عمر ہی کیا ہے فقط اٹھارہ برس ابھی تو میرے خواب ہیں اسے پڑھا لکھا کر کسی مقام تک پہنچانا ساری زندگی مشین کے ہتھے کے ساتھ گھومتے گزری ہے۔ اب میری بیٹی کا نصیب ایسا ہو یہ مجھے گوارا نہیں، عالیان لاکھوں میں ایک ہے، اللہ نے خوب نواز رکھا ہے اگر وشمہ راضی ہے تو ایک چھوڑ ہزار لڑکیاں مل جائیں گی۔''

کچن کی دیوار سے لگی خود ساختہ پختہ ذہن کی مالک زارا کو یہ باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں صغریٰ خالہ نے کم از کم اٹھارہ سو کا تو لان کا سوٹ ہی پہن رکھا تھا پھر یہی ملازمہ کے تن پر ہوتا۔ بیٹیاں کسی کی جاگیر تو نہیں ہوتیں۔ ان کا بھی حق ہوتا ہے اچھا کھانے پہننے کا اور امی کے تن پر تو کترن کترن جوڑ کر بنائی گئی قمیض ہے ناں ان کی کیا اوقات کہ ایسے کفران نعمت کر سکیں، انہیں تو جھٹ سے ہاں کہنا چاہیے۔ وہ نہ کہہ رہی ہیں، نہ ڈھنگ سے کبھی کھایا نہ پہن اوڑھ کر دیکھا۔ پہلے خواب دیکھا کرتی تھیں شکوے کیا کرتی تھیں کہ چچی کو میری بیٹیاں نظر نہ آئیں اب جو آئی ہیں تو ایسے انکار کر رہی ہیں جیسے پروا ہی نہ ہو کسی بات کی۔ چائے کی ٹرے اٹھائے اٹھائے بددلی سے پلٹتی زارا سامنے دیکھ ہی نہ پائی اور ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔'' اپنے لہجے کی شوخی وہ چھپا نہ سکی تھی۔ ''کسی اور کام کا چھوڑا ہے تم نے بے مروت لڑکی اور یہ چچی کو کیا ہو گیا ہے انہیں سمجھاتی کیوں نہیں جب تم راضی ہو تو۔''

وہ اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ تھامنا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھوں میں گرم چائے کی ٹرے تھی۔ ساتھ بسکٹ کے دو پیکٹ کھول کر پلیٹوں میں سجا رکھے تھے۔

''میں چائے دے کر آتی ہوں تم پریشان مت ہو۔ میں بات کروں گی امی سے۔''

ایسے پریشانی سے دور رہنے کا کہہ کر وہ حقیقتاً خود الجھ گئی تھی۔ امی کو آخر کیسے سمجھائے کہ وہ اسے زندہ رہنے دیں اس کی یہی مرضی ہے۔

''آ گئی میری زارا! ماشاء اللہ پہلے سے بڑھ کر پیاری لگ رہی ہو۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو.....''

اور وہ امی کی گھوریوں کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

''جو محبت مجھے نظر آ رہی ہے آخر امی کو وہ نظر کیوں نہیں آتی شاید انہیں کبھی محبت ملی ہی نہیں، وہ محبت کیا جانیں، محبت تو سارا جہاں ہے اس کے بغیر زندگی کچھ بھی نہیں۔

عالی اسے شروع سے بہت پسند تھا۔ اکیڈمی سے واپسی پر وہ اسے اکثر اپنے ساتھ لے آتا تھا یہیں سے زارا نے اس کے ہمیشہ کے ساتھ کی تمنا کی تھی۔ اس کی مسکراہٹ پر وہ سو جان سے فدا رہتی تھی۔

''عالی! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔''

''ہاں تو کیوں نہ لگوں۔ اکلوتا چچا زاد ہوں ناں بھئی۔''

وہ اس کی محبت کو یونہی ہوا میں اڑا دیا کرتا تھا چچی جان بھی اس کے لگاؤ کو سمجھتی تھیں مگر پتا نہیں کہتی

کچھ نہیں تھیں۔ وہ بھی کبھار ان کے گھر بھی چلی جایا کرتی تھی۔ عالی کے کام دل و جان سے کیا کرتی، برتن کپڑے کھانا مزیدار۔ یہاں روپے پیسے کی کتنی فراوانی تھی ہر بندہ ہی اپنی اپنی پسند اسے بتا دیا کرتا اور وہ خوشی خوشی کچن میں گھس جایا کرتی، ٹماٹر، پھل، سبزیاں، مسالے ہر شے وافر مقدار میں موجود تھی وہ مسرت سے دیکھتی ہی رہ جایا کرتی ہنہ گری کی پروانہ سرد ہوا کے جھونکوں کی۔ امی کو اس کی فکر رہتی تھی۔

''کیوں سارے گھر کے کام کرتی پھرتی ہے۔ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈال ڈال کے ہاتھ دیکھو۔ اپنے، بالکل برف ہو رہے ہیں۔'' امی تشویش سے کہتیں۔

''امی! چچی بہت تھک جاتی ہیں۔ اوپر سے عاشر بھائی کی بیوی لٹنی، اللہ معاف کرے چچی جان

کو ایسے دیکھتی ہے جیسے کھا جانا چاہتی ہو اور عاشر بھائی کی غیر ذمہ داری دیکھو، ماں کی پروا نہیں۔ ایک عالی ہے جو سب کے لیے سوچتا ہے۔'' وہ عالیان کے لیے بھی پریشان رہتی تھی۔

''وہ سب کے لیے سوچتا ہوگا زری مگر تمہارے لیے کبھی نہیں سوچے گا۔ میری جان! تو ہم ان کے لیے کیوں سوچتے پھریں۔'' امی کو اس کے دل کی ہر ہر دھڑکن کی تال معلوم تھی۔

''تو میں نے کب کہا کہ وہ سوچے۔'' وہ لاپروائی سے بول کر اٹھ گئی تھی۔

''چچی جان کی گرم گود میں لیٹا اسے دیکھ دیکھ مسکراتا عالیان ابھی اسے نہیں سوچتا!''

☆☆☆

عالیان کے بی ایس سی میں اچھے نمبر بالکل نہیں آئے تھے۔ ایک بوجھ کی طرح اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر ہر بوجھ سے نجات حاصل کر لی تھی۔ چچا گھر میں اتنے ہر دلعزیز نہیں تھے مگر کماتے بہت اچھا تھے۔ ان جتنے اثاثے خاندان بھر میں کسی کے نہیں تھے اور دو ہی بیٹے تھے۔ نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ زری کے لیے یہ سب کبھی بھی سب سے پہلے نہیں رہا تھا۔ یہ سب سے آخر کی بات تھی، محبت حاصل ہو جائے تو سمجھو سب مل جاتا ہے۔

''عالی تم بالکل دل پہ مت لینا خوش رہا کرو۔ میں تمہارے لیے پکوڑے بناتی ہوں۔''

چچی جان باہر تخت پر بیٹھی پالک کاٹ رہی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ تھوڑی سی باریک کتری پالک پکوڑوں میں عالی کو بہت اچھی لگے گی مگر یہ خیال خام خیالی ہی ثابت ہوا تھا۔

''پریشان ہوتی ہے میری جوتی اور تم پکوڑے کس خوشی میں بنانے چل پڑیں۔ کون سا خوشی کا موقع ہے بس آگے نہیں پڑھنا تو نہیں پڑھنا۔ دماغ پھٹنے والا ہو جاتا تھا میرا، یہ تو ابا کی ضد تھی اور انجام بھی دیکھ لیا انہوں نے۔''

وہ لاپروائی سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بولتا جا رہا تھا۔ زری نے سرخ رنگ کا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا سوچا تھا کسی دن اچانک کالج پہن کے عالی کے ساتھ جائے گی تو وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا مگر یہاں وہ ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔ کوئی تعریف نہ توصیف، یہ لاپروائی تو اس پہ جچتی ہے۔ آخر کو خوشی خوشحالی کے سارے موسم ان ہی کے گھر تو اترے رہتے ہیں۔

''زری تم ذرا کچن کی خیر خبر لو بیٹی! ورنہ اس مہارانی نے تو اپنے حجرے سے نکلنا نہیں پتا نہیں کون سا منحوس دن تھا جب اسے بہو بنا کر لے آئی، میں ایک دن جو سکھ کا دیکھا ہو۔ ہر وقت کی بیماری کے تماشے اللہ کرے سچ مچ بستر پکڑ کر لیٹ جائے پھر خدمتیں کرتی اچھی بھی لگوں میں۔''

چچی جان کا دل ہر وقت ایسے ہی کڑھتا رہتا تھا مگر لبنیٰ بھابی کے کان پہ جوں تو کیا ہلکی سی خارش بھی نہ ہوئی تھی کبھی۔

''چلیں چچی جان آپ پالک مجھے پکڑائیں دھو کے چولہے پر چڑھاؤں۔ گوشت تو اب تک گل ہی گیا ہوگا۔ دودھ میں نے پہلے ہی ابال کر فریج میں رکھ دیا تھا۔''

''شاباش ہے بیٹا بہت خیال رکھتی ہو میرا ورنہ تو اس نے تو مار ہی دینا تھا مجھے۔'' شکوے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ صاف ستھرا کچن، ہاٹ پاٹ میں گرم روٹیاں اور مٹن پالک کا سالن بنا کر سب سے آخر میں اس نے دو کپ چائے بنائی اور اوپر چلی آئی تھی۔

لبنیٰ بھابی بھی اسے کوئی خاص پسند نہیں کرتی تھیں۔ البتہ عاشر بھائی کا پتا کم کم ہی چلتا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ لبنیٰ بھابی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھیں۔ یہ شادی محبت کی شادی تھی جو کم کم ہی اپنی جگہ بنا پاتی ہے۔ اب بھی وہ دونوں پتا نہیں کن سوچوں میں گم تھے اور اس کی سوچ ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی کہ اسے اس گھر میں جگہ بنانے کے لیے عالی کا ساتھ پانے کے لیے سب کے دل میں جگہ بنانی ہی ہوگی۔ وہ سب کا خیال رکھتی، چائے بناتی تو

سب ہی کے لیے بناتی۔ چاہے عزیز چچا ہوں یا عاشر بھائی اور عالی تو تھا ہی اس کا پکا سچا دوست۔

عاشر بھائی اپنی چائے ختم کر کے جا چکے تھے۔ لبنیٰ بھابھی خاموش تھیں لیکن ان کی خالی خالی ویران آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

''بڑے ہی خود غرض لوگ ہیں زری تمہیں یہاں سے کبھی کچھ نہیں ملے گا خواہ مخواہ ہی خود کو گھلاتی پھرتی ہو۔ آنٹی کسی کو خوش ہوتا دیکھ ہی نہیں سکتیں اور تم ان سے امید لگائے بیٹھی ہو۔''

انہوں نے اس گھر میں بہت مایوسی سمیٹی تھی۔

☆☆☆

موسم آج بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ صبح سے ہی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، سارے گملے دھلے دھلائے تازہ محسوس ہو رہے تھے۔ امی نے کچن میں یقیناً تھوڑا سا بیسن گھول رکھا تھا جو اب کڑکڑاتے گرم پکوڑوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سونی اور سویرا دونوں امی کی مدد کروا رہی تھیں۔ تب ہی پلیٹ میں تھوڑے سے پکوڑے اس کے سامنے بھی آ گئے تھے اس کا دل ایک دم ہی اداس ہو گیا تھا۔

اس دن عالی اداس تھا اس کی اداسی پریشانی کا سوچ سوچ کر وہ اتنی دعائیں اس کے لیے مانگا کرتی تھی کہ حد نہیں، پتا نہیں فون میں بیلنس بھی ہے کہ نہیں بٹنوں والا فون اور تھوڑی سی ہر چیز اس کا دل اداس کر دیا کرتی تھی۔ نہ بیلنس ہے نہ پیسے ہیں، کیسی زندگی ہے میری کاش میں اس سے بات ہی کر لیتی۔ مس کال بھی پتا نہیں گئی ہے کہ نہیں، بیلنس نہ بھی ہو تو مس کال تو چلی ہی جاتی ہے مگر جوابی کوئی کال نہیں آئی تھی۔

''مصروف ہو گا ایک تو عزیز چچا اسے دنیا کے ہر کاروبار میں مستعد اور طاق ہی دیکھنا چاہتے ہیں بس۔'' اس نے سوچا۔ بارش زیادہ نہیں ہو گئی۔ آج امی نے پکوڑا اکھلایا اور ساتھ ہی آ بیٹھیں باہر شام برس پڑی تھی۔

دو دن ہو گئے وہ عالی سے نہیں ملی تھی اس کے سگے چچا کا گھر تھا کون روکنے والا تھا۔ امی اسے روکتی ہی رہ جاتیں ابا اجازت دے دیتے۔

''تم جاتے وقت سونی سویرا کو بھی ساتھ لے جایا کرو، تمہاری چچی کا دل لگ جایا کرے گا چلو تمہارے سامنے ہی سہی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع تو ملتا ہے بھابی کو۔''

وہ ہمدردی میں بولے جاتے۔

''چلو اختر تو میرے ساتھ دوکان پہ بیٹھتا ہے تم تینوں چھٹی کے روز تو لازمی ہو آیا کرو اور میں تو کہتا ہوں نیک بخت تم بھی اب پرانے گلے شکوے جانے دو، دل کو صاف کر لو۔ اب الگ ہوئے بھی پندرہ بیس سال ہوئے تین چار سال میں کون کس کو کتنا جان سکتا ہے بھلا۔''

روٹی کھانے کے بعد، دسترخوان زری نے اٹھا لیا تھا اور سونی چائے بنانے چلی گئی تھی۔ یہ ان کا سکھڑاپا ہی تھا جو گھر کی ہر شے شیشے کی طرح چمکتی رہتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جاؤں گی کسی دن۔''

امی نے ہتھیار ڈال کر بات ختم کر دی تھی۔ ورنہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ چچی جیسی بد دماغ سازشی عورت کے پاس بیٹھنا کتنا دل گردے کا کام ہے۔

''بچیاں وہاں جائیں گی تو دل تھوڑا لگائیں گی، برتن دھلوائیں گی، فرش چمکوائیں گی ان سے۔''

انہوں نے دل میں سوچا مگر کہا نہیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جو عورتیں دل کی بات منہ سے نکال دیتی ہیں بہت دکھ ملتے ہیں انہیں اور جو عمل کرتی پائی جاتی ہیں ان کے دل کم زخمی ہوتے ہیں۔ انہوں نے زری کو منع کیا تھا جو باپ کو اس میدان میں کھینچ لائی تھی۔

''اے اللہ سب تیرے حوالے میرا کیا کچھ نہیں سب آپ ہی کا حکم ہے، میری بیٹی کو سیدھا رستہ دکھا دیجیے۔'' امی پرانے وقت کی میٹرک پاس تھیں۔ پتا نہیں اتنا صبر پایا کہاں سے تھا۔

کہتی تھیں دعائیں بہت دل سے عزت کے ساتھ چپکے چپکے مانگنی چاہئیں وہ قبول ضرور ہوتی ہیں۔ ان کے اپنے ہی فلسفے اپنا ہی زندگی گزارنے کا طریقہ تھا۔ وہ بھی کسی غلط راستے پر تو نہیں اسے عالی سے اور عالی کو اس سے محبت ہے تو کون ہے جو راستہ روکے اور چچی جان کی جتنی خدمت اس نے کی تھی۔ کیا وہ کافی نہیں تھی اس کی فرماں برداری اور ان کی دکھ سکھ کی باتیں سب کچھ اس کے حق میں جا رہا تھا مگر اس کے مقدر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

کتنا خوب صورت تھا وہ، عالی کا چہرہ اس کے سامنے آجاتا تھا محبت کرنا کوئی گناہ تو نہیں؟

☆☆☆

چچی جان کے گھر اتری وہ دوپہر بہت ہنگامہ خیز سی تھی۔ دیر سے ہی سہی مگر وہ آضرور گئی تھی، وہاں ہلکے سروں میں چلتی ہوا اسے بہت بھلی لگی تھی۔

چھوٹے سے لان میں کین کی کرسیاں ڈالے عالی کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اس کا دھڑکتا دل تھم سا گیا تھا، وہ آواز وشمہ ہی کی تھی۔

عالی تو ہے بھی ہنسوڑ سا، ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دی تھی ہمیشہ کی طرح اور ان ہی کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ وشمہ پھپھو کی اکلوتی بیٹی تھی بچپن میں تو وہ ذرا کم کم ہی لفٹ کروایا کرتی تھی مگر اب وہ ملنے ملانے بھی آنے لگی تھی۔ نزہت پھپھو کی جان تھی اس میں۔

''لو آ گئی ہماری ماسی، اب ہر کام منٹوں میں ختم ہو جائے گا۔'' عالی کے مذاق شروع ہو چکے تھے۔

''میں کیوں ہونے لگی ماسی تم ہو گے اس گھر کے چپڑاسی، میرا تو اپنا گھر ہی یہ جب دل چاہے گا آؤں گی، ایک کپ چائے کا تو بنا نہیں سکتے کام چور۔''

اس نے آنکھوں میں شرارت سمو لی تھی اس وقت منہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

''عالی کے بچے تمہیں تو میں پوچھ لوں گی۔''

''کیسی ہو وشمہ؟'' وہ وشمہ کے گلے لگی عالی کو گھور رہی تھی۔

''آ گئی محترمہ کو ہماری یاد بھی۔'' وشمہ نے الٹا شکوہ کر ڈالا تھا۔

''کبھی کبھی نزہت پھپھو ان کی شرارتوں کی وجہ سے اسے اور وشمہ دونوں کو اکٹھا پیٹ بھی دیا کرتی تھیں۔'' اسے ہنسی آ گئی تھی۔

''سچ ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی میں، عالیان سے کہا بھی کہ تمہیں لے آئے چچی بھی کتنا کہہ رہی تھیں مگر یہ محترم ہیں کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔'' وشمہ نے عالی کی شکایت لگائی تھی ''اس سے بعد میں حساب برابر کریں گے۔''

''تم سناؤ کیا چل رہا ہے آج کل۔''

''بس وہی یار گھر کے چھوٹے موٹے کام اور امی کے وہی فرمان ہر لڑکی کو گھر داری میں طاق ہونا چاہیے بھئی اب ہر کوئی زبیدہ آپا تو ہونے سے رہا تقریباً گھر کے سارے کام سیکھ چکی ہوں میں مگر پھر بھی ان کی نصیحتیں ختم نہیں ہوتیں، یہ کر لو وہ کر لو۔'' وشمہ اور اس کے خیالات کتنے ملتے جلتے تھے، وہی اس کے ساتھ بھی اپنے گھر میں ہوا کرتا تھا حالانکہ وہ تو خود کو سگھڑ سمجھا کرتی تھی۔

''ہائے بس سہم ہے یار! کیا کہوں اب۔''

''لگتا ہے چائے آج میں ہی بناؤں گا کیونکہ دو خواتین اندر باتوں میں لگی ہیں اور دو یہاں اب کھانا چائے کو تو خواب ہی سمجھوں میں۔'' درمیان میں عالی نے دھائی دی تھی بھوک کا کچا تھا وہ۔

''تم ایسا کرو عالی سموسے لے آؤ اور ہم دونوں چائے بنا لیتے ہیں۔'' وشمہ نے صلاح دی تھی، دوسرے ہی لمحے عالی بائیک اڑاتا گرم سموسے لینے چلا گیا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی پتیاں نیچے گھاس پر گری ہوئی تھیں۔

اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا خاص طور پر گلاب، میں تو اپنی شادی پر ایسا لال گلابی جوڑا ہی پہنوں گی بھلے کوئی بھی کلر ان ہو۔ اس نے سوچا اور مسکرانے لگی۔

یہیں سے کتنی بار اس نے گلاب توڑ کر عالی کو پیش کیا تھا۔

''کبھی تم بھی زحمت کرلیا کرو۔''

''کیا بتاؤں نزہت! کیسے کیسے اس لڑکی نے میرے ارمانوں کا خون کیا ہے، اسی گھر میں اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے۔ بس میں اور میرا میاں، نہ کسی آئے کی خبر نہ گئے کا پتا اور عاشر اسے تو خبر بھی نہیں کہ ماں کن حالوں سلگتی رہتی ہے اب یہی دیکھ لو بیٹی ہمارے ساتھ غیروں کی طرح آئی اور گئی اوپر اپنے حجرے میں۔''

چچی جان نزہت پھپھو کے سامنے اپنے دکھڑے رو رہی تھیں جسے پاس گزرتی وشمہ نے بھی سنا تھا ''کبھی انہیں اپنے گھر کا فرد سمجھا بھی ہے چچی نے۔''

''بہت اچھی ہیں لبنیٰ بھابی، چائے بنا کے اوپر چلتے ہیں۔ دیکھنا تم کیسے پیار سے بولتی ہیں چچی جان نے شاید انہیں سمجھا ہی نہیں ہے بس وہی ساسوں والی طبیعت اور عاشر بھائی، وہ تو عالی سے بھی اچھے ہیں۔''

وشمہ چچی کی باتیں سن کر بدگمان ہو رہی تھی اور اوپر جانے سے ہچکچا رہی تھی مگر زری نے غلط فہمی دور کردی تو اوپر جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

''چلو آج مل کے دیکھتی ہوں۔'' دونوں ٹرے اٹھائے چپکے سے سموسہ چھپایا اور چائے کے کپ لیے اوپر پہنچیں تو وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں اور فوراً بیٹھنے کے لیے جگہ دی تھی۔ وشمہ بھی خوش ہوگئی تھی۔

''بھابی آپ بہت اچھی ہیں۔'' وشمہ بھی ان کے اعلا اخلاق سے متاثر ہوگئی تھی۔

''بہت ذکر کرتے ہیں عاشر تمہارا۔''

عاشر بھائی نے بھلا دیا ہے ہمیں بھی آئے ہیں ملنے جب چھوٹے تھے تو عاشر بھائی سے اتنی ٹافیاں اور چاکلیٹس کھائیں کہ امی کہتی تھیں کہ تمہارے دانت عاشر گلا کر ہی چھوڑے گا۔''

وہ زمانہ زری کو بھی یاد تھا جب وہ ساری ٹافیاں چھین کر ان پر صرف اپنا ہی حق جما لیا کرتی تھی مگر عاشر بھائی سب میں برابر بانٹ دیا کرتے تھے۔

''کتنے دن رہو گی وشو۔''

''جتنے دن تم کہو گی زری ڈیئر۔''

محبت بام عروج پر پہنچ چکی تھی مگر جب پلیٹ میں ہاتھ پڑا تو بول پڑی۔

''ہائیں تم باتوں باتوں میں میرے حصے کا سموسہ بھی چٹ کر گئیں۔''

''اب تو کھا گئی ہے، ہمارے سموسے بانٹے ہوئے تھوڑی ہیں۔'' زری کی دہائی پر لبنیٰ بھابی سمیت تینوں ہنسنے لگیں۔

''بریانی ذرا کم مسالے والی بنانا اور رائتہ، سلاد لازمی ہوں ویسے بھی کم کم آتی ہے نزہت۔ اب آئی ہے تو یہ نہ سوچے کہ بھابی نے اچھا کھانا بھی نہ کھلایا اور عزیز صاحب کے تو ویسے ہی تیور بگڑے رہتے ہیں نہ کبھی اولاد سے محبت کی نہ بیوی کی چاہت رکھی، پتا نہیں یہ خاندان بنا کس مٹی سے ہے۔ غیر بھی اور غیر ہی اکیلی رہ گئی میں تو۔ وشمہ مہمان ہے اور لاڈلی بھی بہت ہے کوئی کام نہ کروانا اس بچی سے۔ نزہت کیا سوچے گی آتے ہی کام سے لگا دیا اسے۔''

☆☆☆

''زری کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ چکن کڑاہی تیار تھی روٹیاں عالی بازار سے لینے گیا تھا۔ وشمہ کا فیورٹ اسٹرابیری فلیور کسٹرڈ ٹھنڈا ٹھار تیار تھا۔ بریانی دم پر تھی اور سلاد اس نے کاٹ سجا بھی دیا تھا اس نے۔''

''بہت ذائقہ ہی بھئی تمہارے ہاتھ میں تو۔'' نزہت پھپھو نے شامی کباب کھاتے اس کی تعریف کی اور پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں دے دیا تھا۔

''بہت محنت کی ہے بچی نے یہ تو اس کا حق ہے زاہدہ!''

''چچی جان نے آج تک اسے بچے کھچے پر ہی ٹرخایا تھا۔ لبنیٰ بھابی اس کا پھر بھی خیال کرلیا کرتی

تھیں یا پھر عزیز چچا اس کی تعریف کر دیا کرتے لیکن اکثر تو وہ گھر پہ ہوتے ہی نہیں تھے ان کا سارا وقت مارکیٹ میں ہی گزر جاتا تھا۔

''اچھا بھئی زاہدہ! اب میں سونیا سویرا سے ملنے جاؤں گی۔ بہت محنت کرتی ہیں بھابھی! اللہ رزق میں برکت دے بس۔''

انہیں پتا تھا کہ امی ادھر کبھی نہیں آتیں اور دوسرے وہ مصروف ہی اتنا ہوتی ہیں کہ کہیں آنے جانے کا وقت ہی نہیں ملتا اتنے ڈھیروں ڈھیر خوب صورت خوش رنگ دوپٹے کمیضیں نت نئی شلواریں امی کے پاس سلنے آتے کہ دل چاہتا وہ ہر لباس کم از کم ایک بار تو ضرور پہنے۔ ان کے ہاتھ میں کمال صفائی تھی، عام سے عام جوڑا بھی خوب جچتا تھا پہننے والے پر، زری نے سوچا اور پانچ سو مٹھی میں دبائے اٹھنے لگی تھی کپڑوں کا رنگ برنگا خیال اف۔

''اس دفعہ تو ایک جوڑا میں بھی سلواؤں گی بھابھی سے۔''

پھپھو زینت گلی میں چلتے کہہ رہی تھیں۔ وشمہ زری کے ساتھ ذرا آگے چل رہی تھی۔

''لڑکیو رک تو جاؤ۔ پیروں کی جگہ پہیے تو نہیں فٹ کروا رکھے۔'' پیچھے سے پھپھو کی آواز نے انہیں رکنے پر مجبور کیا۔

☆☆☆

چچی جان بہت سے رنگ رنگیلے کپڑے بیڈ پہ پھیلائے کسی سوچ میں غرق تھیں۔

''اچھا زری اس کے ساتھ کون سا دوپٹا مناسب رہے گا۔ یہ چنری والا پھر یہ پیلا والا۔''

☆☆☆

''چچی! یہ والا ٹھیک رہے گا اس میں تھوڑا پیلا رنگ ہے یہی سجے گا اس کے ساتھ۔''

ان سارے سوٹوں کی پیکنگ بھی خوب تھی سرخ ربن سے بندھے ہوئے تھے سب کے سب۔

''پتا نہیں ایسے کپڑوں کا چچی جان کریں گی کیا۔'' کچن میں دو بڑے ٹوکرے مٹھائی کے دیکھ کر وہ اور بھی حیران ہوئی تھی۔

''اچھا زری! ایک ٹوکرا کھلا ہوا بھی ہے۔ اس میں سے ایک پلیٹ اپنی پسند سے چن لو بھئی تھک گئی ہوگی تم بھی۔''

مگر وہ مٹھائی کھائے بغیر ہی آ گئی تھی۔ اپنی منگنی کی مٹھائی وہ بھی ہونے والے سسرالی گھر سے کون کھاتا ہے ایسے، اسے شرم آ گئی تھی۔

''آج شام چچی اور عالیان آ رہے ہیں یہاں۔''

''وہ کیوں بھلا۔'' سونی نے سوال کیا تھا۔

''میرے لیے اور کیوں میں ناں کہتی تھی۔''

وہ اور سویرا لوڈ ویڈنگ دیکھ رہے تھے کہ کیسے لوڈ کے بغیر بھی شادیاں ہو ہی جاتی ہیں اور کیسے فہد کی شادی مہوش سے ہو جاتی ہے، زری محلے سے کوچ نہ کرنے والا گانا سنتے جھوم رہی تھی کہ امی مٹھائی کی پلیٹ لیے اندر چلی آئی تھیں۔

''یہ کہاں سے آئی؟'' منہ میں لڈو بھرتے پوچھا گیا تھا اور دوسرے پر نظر تھی اس کی۔

''تمہاری چچی نے بھجوائی ہے وشمہ کو عالی کے لیے مانگ لیا ہے انہوں نے۔''

بہت صبر سے انہوں نے یہ خبر زری کو سنائی تھی۔

وہ بیڈ کے کنارے اچانک بیٹھ گئی تھیں۔ ''انہیں میری زری نظر ہی نہیں آئی اور نہ عالی کو۔''

''تو کیا ہوا امی! عالی کی زندگی ہے اسے اپنی مرضی سے جینے کا حق ہے۔'' وہ بھی تو انہی کی بیٹی تھی اندر سے مضبوط۔

تو چچی نے وہ ساری جیولری کپڑے اور جو اس سے تیاری کروائی تھی وہ ساری وشمہ کے لیے تھی وہ عالی سے کہہ کر خود کو ہلکا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ دل پہ بوجھ سا لیے امی کی گود میں سما گئی تھی۔

''جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ کرتا ہے وہی بہترین ہے ہمارے لیے۔'' اس نے

آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ وشمہ عالی کی زندگی کا حصہ بن گئی اور اس نے اپنی یک طرفہ محبت کو خود سے بھی چھپا لیا تھا شیشے کی دیوار کے پار وشمہ سرخ لباس پہنے گھبرائی بیٹھی تھی کہ وہ اندر چلی آئی کمرا سرخ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی آج تو عالی کی خیر نہیں ہے۔'' اس کے ہاتھ زری کے ہاتھوں میں تھے۔

''ذرا اس کی بھی خیر خبر لو زری! کہاں چلا گیا ہے۔'' وہ عجلت میں تھیں۔ وہ تو روتی ہوئی زری کو دیکھنے آئی تھیں مگر وہاں نظارہ کچھ اور تھا۔

''چچی! وہ عالی ابھی آجائے گا باہر دوستوں میں گیا ہے۔''

آج اس کمرے کو وہ آخری بار دیکھ رہی تھی قسمت کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا وشمہ! عالی کو ملنا تھی وہ مل گئی تو وہ کیوں سوگ مناتی پھرے!

گو دونوں طرف سے گلے شکوے دور ہو گئے تھے۔ چچی جان نے امی کو گھر جا کر شادی کا کارڈ دیا تھا۔ معافیاں تلافیاں بھی ہوئی تھیں۔ عزیز چچا بھی آئے تھے۔

نزہت پھپھو دونوں بھائیوں کے درمیان انتہائی خوش تھیں۔ باہر سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ بھی حسب معمول ہر کام کے لیے حاضر خدمت تھی تو امی بھی مطمئن ہو گئی تھیں۔

''لو بھئی کزنز آج تو دونوں ہی غضب ڈھا رہی ہو دونوں میں سے زیادہ پیارا کون لگ رہا ہے۔'' تب ہی عالی آ گیا تھا۔

''وشمہ بہت پیاری لگ رہی ہے عالی بہت پیاری۔''

☆☆☆

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا ادھر عالی بھی بہت مصروف ہو گیا تھا یا شاید پہلے سے ہی اس کے پاس وقت نہیں تھا کسی کے لیے۔

کافی دن سے ابا کو بخار تھا کبھی کم کبھی زیادہ، نزہت پھپھو پہلے پہل فون پر حال احوال پوچھتی رہیں پھر الیاس انکل اور وہ ملنے آ گئے تھے ڈھیروں ڈھیر پھل اور ابا کی دوائیاں بھی لے آئے ابا منع ہی کرتے رہ گئے۔

پھپھو نے سیب نہ نہ کرتے بھی کھلا کر ہی دم لیا تھا۔

''جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ یوں پڑے اچھے نہیں لگ رہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''بھابھی! بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا کما بھی رہا ہے میری نند سلمٰی کافی دنوں سے کہہ رہی تھی کہ تم سے ملوانے لے کر آؤں۔ پہلے پہل تو مجھ سے وشمہ کے لیے بھی کہا۔ میرا ارادہ بھی تھا مگر اس کے نصیب عالی سے جڑے تھے۔ اب تم سوچ کر جواب دینا بلکہ کسی دن لے آتی ہوں میں جنید کو دیکھا بھالا سمجھ دار بچہ ہے۔''

امی سوچ میں پڑ گئیں بس ابا کی طبیعت سنبھلے تو وہ بات آگے چلائیں اس کے ساتھ کی وشمہ تو اپنے گھر کی بھی ہو گئی۔ وہ فکر مند تھیں۔

وہ بھی ایک عام سا ہی دن تھا مگر اب جب وہ عالی کو آہستہ آہستہ بھول رہی تھی پھوپھو نے جنید کی تصویر بھجوائی تھی اسے بھی وہ اچھا لگا تھا۔

کوئی دن تھا کہ مسرت خالہ (جنید کی امی) بھی آ کے رسم ادا کر جاتیں۔ درمیان میں ایک آدھ بار وہ وشمہ سے ملنے بھی گئی تھی۔ عجیب سا رنگ روپ ہو رہا تھا اس کا۔ ایسے جیسے خوش ہی نہ رہی ہو کبھی مگر کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا اسے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے پوچھا بھی نہیں، نہ اس نے کچھ کہا تھا وہ کچن میں دال کو بگھار رہی تھی۔ پاس پڑا فون بج اٹھا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو عالی ہوں ڈیئر۔'' وہ چہکا تھا۔

''امی تو گھر پہ نہیں ہیں۔'' وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پھر سے ان ہی راہوں کی مسافر ہو جہاں یک طرفہ محبت نے اسے پہلے لا پٹخا تھا اس لیے اب انجان بننا ہی بہتر تھا۔

''تائی سے ملنا ہوتا تو فون کرتا کیا بڑے دن ہوئے تمہارے ساتھ آئس کریم نہیں کھائی۔ چلو، آج پھر سے پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے بیچ میں کوئی آیا ہی نہ ہو۔

''وشمہ بھی چلے گی ساتھ؟'' وہ اسے بتانا بلکہ جتانا چاہتی تھی کہ وہ وشمہ کا شوہر ہے۔

''نہیں یار! صرف تم اور میں بس۔'' جواباً فرمائش کی گئی تھی۔

''سوری عالی! میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔ گھر میں بہت سا کام ہے مجھے اور ٹیوشن والے بچے بھی آنے والے ہیں۔''

اس نے بہانا بنا کر فون بند کر دیا تھا حالانکہ اس دشمن جاں کی ایک مسکراہٹ کے بدلے وہ کبھی جان بھی دیتے نہ سوچا کرتی تھی مگر اب وہ کسی اور کا تھا اور وہ کسی سے بھی خیانت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وشمہ سے بھی نہیں۔

باہر بائیک رکنے کی آواز آئی تھی۔ ''تم میرے ساتھ نہیں چل رہیں؟ میرے ساتھ زری میرے ساتھ۔

اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش بھی تھی۔ کبھی قریب کھڑے لوگ بھی کتنے دور ہوتے ہیں صدیوں کا فاصلہ تھا جسے وہ طے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لاپروا، انجان اتنا بھی انجان نہ تھا۔ جتنا وہ اسے سمجھی تھی۔

''میری زندگی میں وشمہ ضرور شامل ہے زری! مگر محبت مجھے تم سے ہی تھی۔ یہ میں نے اب جانا ہے۔''

جب اقرار کا موسم گزر چکا تھا اسے اقرار یاد آ گیا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ چکی تھیں۔

''میں مرجاؤں گا تمہارے بغیر۔'' اس وقت گھر پر بھی کوئی نہ تھا۔ امی ہوتیں تو انہیں اور بھی برا لگتا یا شاید وہ یہ سب کہنے کی ہمت ہی نہ کرتا مگر اس تنہائی اور عالی کے بکھرے ہوئے پریشان بالوں نے اسے پچھاڑ ڈالا تھا۔ ایسے جیسے بیچ کا سال گزرا ہی نہ ہو۔ نہ اسے نزہت پھپھو کا خیال آیا نہ وشمہ کا، آج وہ صرف اپنی سننا چاہتی تھی۔

''کل صبح آٹھ بجے وہیں اکیڈمی کے دروازے پر۔''

وہ کہہ کر لوٹ گئی تھی اور وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا مسکراتا چلا جا رہا تھا۔

''عورت اپنی پہلی محبت کبھی بھول جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا اور زری عالی کو بھول جائے یہ تو بالکل نہیں ہوگا کبھی۔''

اپنے اوپر اس کا اعتماد اور بھی بڑھ گیا تھا تو آج بھی بائیک کے پیچھے بیٹھی زری نے بھی یہی سوچا تھا کہ محبت بھولنے کے لیے نہیں ہوتی وہ عالی کے دل سے کبھی نکلی ہی نہیں ہمیشہ اس کے دل میں رہی تھی۔

''بنگو فلیور۔''

''تمہیں کیسے یاد رہی یہ بات۔''

''بھولتا کیسے اور تمہیں بھولنا میرے بس میں کہاں۔'' وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی گئی تھی۔

''میں کہتی ہوں کون سی (زری کے ابا) ابرار کی سگی بہن ہے نزہت جو تم ایسا سوچ رہی ہو اپنی اولاد کی خوشی آخر تمہیں نظر کیوں نہیں آتی۔''

چچی نے نزہت پھپھو کی حیثیت ایک بار پھر واضح کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کتنی سنگ دل تھیں نہ انہیں کسی کی اچھائی سے سروکار تھا نہ خوبی سے۔

امی بھی یہ بات جانتی تھیں مگر انہیں وشمہ کا بھی خیال تھا۔ وہ کسی کی بیٹی پر کیوں ظلم ڈھائیں اور ایک برتے ہوئے مرد کے حوالے اپنی بیٹی کیوں کریں مگر بیٹی تھی کہ اسے عالی کے سوا ہر

شے ہر رشتہ برا لگ رہا تھا۔ پتا نہیں نزہت پھپھو پر کیا بیت رہی ہوگی۔ عالی اب چچی کے ساتھ ہی آیا کرتا تھا۔

''آخر کیا وجہ ہے جو آپ وشمہ کے ہوتے زری کو؟ بھابھی یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ التجا نما انکار کر رہی تھیں۔ زری کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی منوا کر ہی چھوڑے گی۔

اگر نزہت آجائے تو اس کی رضامندی سے۔''

''ارے نزہت گئی بھاڑ میں ہلنے کی کوشش کی نا اس نے اس کی لاڈلی منہ پر ماروں گی اس کے۔'' امی کو ان کے تیور دہلا رہے تھے اور باہر کھڑی زری کو خوشی ہو رہی تھی۔

اس کھینچا تانی بھرے ماحول سے نکل کر اس کے قدم خود بہ خود چچی جان کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چلو اچھا ہے وشمہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور پتا بھی چل جائے گا اس کے خیالات کا۔ پہلی حق دار تو عالی کی میں ہی تھی اسے تو یونہی خیرات میں ملا ہے عالی۔

اچھی خاصی اکڑ پیدا ہو گئی تھی اس میں اور ہٹ دھرمی علیحدہ۔ بدمست قدم زنجیر ہو کر رہ گئے تھے۔

''اکڑ ختم کرنی ہے تیری تائی کی ہے۔ بیٹی تو قدموں میں لوٹ رہی ہے اور ماں کی بکواس ہی ختم نہیں ہو رہی۔ زری منوا لے گی اس سے دیکھ لینا تم۔'' چچی جان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

''کبھی مردوں میں بھی کمی ہوئی ہے بھلا یہ تو عورتوں کا مقدر ہوتی ہے۔'' پاس بیٹھے عالی نے انہیں نہیں ٹوکا۔

''اس ماں کی لاڈلی کو تو میں سیدھا کر ہی لوں گی ساری زندگی اس عورت نے زچ کیے رکھا ہے مجھے اب جب وقت آیا ہے تو۔''

انہیں اپنے بیٹے کے حوالے سے کسی قسم کا بھی خیال نہیں تھا پروا تھی تو صرف اپنے بدلے کی اور سب کو پریشان کرنے کے جتن کرتی رہتی تھیں۔

''کرو ذرا اپنے ابا کو فون، پتا نہیں یہ بندہ مر کیوں نہیں جاتا ایسی آفت مچا رکھی ہے کہ.....''

عالی روز ہی اسے یاد کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی۔

''ہاں عالی بس کل ملتے ہیں تم وہیں آجانا ضرور اوکے۔''

وشمہ کے پاس بیٹھے ہی عالی کا فون آ گیا تھا۔ جس طرح اس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اسی طرح کل وہ بھی اسے دھوکا دینے والی تھی۔

''وشمہ! تم پریشان مت ہو۔ اللہ نے تمہارے لیے بھی کوئی نہ کوئی رستہ ضرور رکھا ہوگا۔ بس تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔''

☆☆☆

سرِشام ہی سویرا سونی پیارے سے سنہرے لباس پہنے صحن میں ادھر۔ کا کر رہی تھیں نزہت پھپھو اور وشمہ اندر زری کے پاس بیٹھے تھے۔

آج جنید اور اس کا نکاح تھا چونکہ وشمہ ناراض ہو کر میکے آئی ہوئی تھی اس لیے چچی کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی۔ تھوڑا فاصلہ بھی بہت فاصلے میں بدل چکا تھا۔

''میں عالیان کی حقیقت جانتی ہوں بھابی! دوسروں کو دیوار سے لگانے والے خود ہی دیواروں میں چنے جائیں گے۔''

یعنی اسے بتانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ جنید کے ساتھ بیٹھے نکاح نامے پر دستخط کرتے اور امی کے گلے سے لگ کر اسے پتا چلا تھا کہ حقیقت میں زندگی کتنی خوب صورت ہے اور خوابوں کے سفر میں کتنے اندھیرے بھرے رہتے ہیں۔

جنید کے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے ہوئے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ شام کے سونے پن میں دھیرے دھیرے رات اتر رہی تھی۔ سب کھانا کھا رہے تھے اور باہر قمقموں کی روشنی دیکھتے عالی کی آنکھوں میں تاعمر اندھیرا اتر چکا تھا۔

☆☆

حمیرا عروش

تلافی

عالیہ بیگم آج بہت دنوں کے بعد اپنی دیورانی فائزہ کے ہاں تشریف لائیں تھیں۔ دونوں خواتین کے بیچ دیورانی جٹھانی جیسے کچھ کڑوے کسیلے کچھ کھٹے میٹھے رشتے کے برعکس اچھا خاصا بہنا پا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ فائزہ یوں اچانک انہیں دیکھ کر کھل اٹھی اور دیر تک گلے لگی رہی مگر جب اس نے کوئی پانچویں چھٹی دفعہ ایک ہی جملے کی تکرار کی۔

''ہائے اللہ بھابھی جان! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں آپ کو کتنا زیادہ یاد کر رہی تھی۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ خود ہی ملنے چلی آئیں۔''

تو وہ بری طرح سے چڑ گئیں اور تپے تپے لہجے میں بولیں۔

''بنورانی! اگر تم مجھے اتنا ہی زیادہ یاد کر رہی تھیں تو خود آجاتیں ملنے، تمہارے پاؤں پر کیا مہندی لگی ہوئی تھی؟؟'' فائزہ برا مانے بغیر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور شگفتگی سے بولی۔

''بھابھی جان! مہندی میرے نہیں بلکہ آپ کے دیور جی کے پاؤں پر لگی ہوئی ہے۔ دفتر سے آتے ہی ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کہیں لے کر جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔''

''ہمارے ہاں بھی یہی حال ہے تمہارے بھائی صاحب دکان سے آکر ٹی وی یا پھر موبائل میں گم ہو جاتے ہیں۔ چھٹی کے دن ان کے اپنے ہی یار دوستوں کا آنا جانا ختم نہیں ہوتا۔ میں تو تنگ آچکی تھی۔ آج ہمت کر کے اکیلی ہی رکشہ کر کے آگئی ہوں۔''

وہ چادر اتار کر صوفے پر آرام دہ حالت میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔ فائزہ جھٹ ٹھار جوس کا گلاس بھر لائی اور انہیں پیش کرتے ہوئے بولی۔

''بہت اچھا کیا آپ نے بھابھی جان! میں بھی کسی دن ایسی ہی ہمت کا مظاہرہ کروں گی اور اکیلی ہی اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ اماں جان مجھے شدت سے یاد کر رہی ہیں۔ بھابھی جان کا کئی مرتبہ فون آچکا ہے۔''

''ارے فائزہ! تمہارے میکے سے مجھے یاد آیا کہ پرسوں تم فون پر بتا رہی تھیں کہ تمہاری چھوٹی بھابھی سیل سے بہت خوب صورت لان کے پرنٹ لے کر آئی ہیں اور کچھ انہوں نے تمہارے لیے بھی بھجوائے ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو دکھانا.....! وہ نزاکت سے گھونٹ گھونٹ جوس پیتے ہوئے اشتیاق سے بولیں۔

''بس کیا بتاؤں میں آپ کو بھابھی جان! میری چھوٹی بھابھی بہت قسمت والی ہیں۔ ہمارے بھیا بہت ٹھنڈی میٹھی طبیعت کے مالک ہیں۔ بازار کے ایک کونے پر بچہ گود میں لے کر ٹک جاتے ہیں اور بھابھی دکان دکان پھر کر نہایت عمدہ پرنٹ چھانٹ کر لے آتی ہیں۔ کچھ انہوں نے میرے لیے بھی بھیجے ہیں میں آپ کو لا کر دکھاتی ہوں۔''

وہ اسٹور روم کی طرف چلی گئی جبکہ انہوں نے جوس ختم کیا اور صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی، اچانک سامنے میز پر رکھا پڑا ان کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ انہوں نے دیکھا تو گھر سے کال آرہی تھی۔

''یا الٰہی خیر ہو.....!!!'' انہوں نے فوراً بٹن دبا کر موبائل کان سے لگایا۔ ان کا بیٹا گڈو تیز تیز بول رہا تھا۔

''اماں جان! کیا آپ ابو جی کے لیے روٹی پکا کر نہیں گئی تھیں۔ ہاٹ پاٹ تو خالی تھا۔ انہوں نے غصے میں آ کر پھینک دیا۔ وہ ٹوٹ گیا ہے۔''

''ہائے میرے اللہ! یہ کیا کر دیا انہوں نے؟''

ارے! روٹی ہاٹ پاٹ میں نہیں تھی بلکہ آٹے والے کنستر کے اوپر دھری چنگیر میں رکھی ہوئی ہے۔ تم جلدی سے نکال کر دے دو۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید توڑ پھوڑ کریں۔''

گڈو نے عجلت میں فون بند کر دیا۔ اور وہ اپنی جگہ پر غصے سے بل کھا کر رہ گئیں۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ابھی واپس چلی جائیں اور گھر جا کر میاں کی خوب خبر لیں مگر رکشے کا ایک طرح سے ہڈیاں تڑوا دینے والا گھنٹے دو گھنٹے کا سفر کر کے آئی تھیں فوراً پلٹ کر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے دل پر جبر کر کے بیٹھی رہ گئیں۔

فائزہ جب شاپنگ بیگز لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو انہیں یوں پریشان حال بیٹھا دیکھ کر گھبرا گئی اور تشویش سے بولی۔

''خیریت تو ہے بھابھی جان.....؟؟ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔''

''ارے نہیں فائزہ..... طبیعت تو خراب نہیں ہے ہاں البتہ قسمت ضرور خراب ہے۔ آتے وقت بچوں کو کھانا کھلا کر اور برتن وغیرہ سمیٹ کر آئی تھی۔ ان سے پوچھا تو میچ دیکھنے میں مگن تھے۔ بے نیازی سے بولے۔ ''تم جاؤ! خود ہی لے کر کھا لوں گا۔'' میں بھی جلدی میں یہ بتانا بھول گئی کہ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں نہیں بلکہ چنگیر میں رکھی ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گرمیوں میں روٹی ہاٹ پاٹ میں نہیں رکھتی۔ گیلی گیلی سی ہو جاتی ہے۔ بس پھر کیا تھا جب بھوک لگنے پر کچن میں گئے تو روٹی ہاٹ پاٹ میں نہیں تھی جائے ادھر ادھر تلاش کرنے کے یا پھر بچوں سے پوچھنے کے انہوں نے لے کر غصہ میں ہاٹ پاٹ ہی توڑ ڈالا۔ ابھی ابھی گڈو کا فون آیا تھا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

''اف توبہ..... یہ بھائی صاحب بھی عجیب ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آ کر برتن توڑ دیتے ہیں۔ نجانے ان کی یہ توڑنے پھوڑنے والی عادت کب بدلے گی.....؟؟ فائزہ بھی پریشانی سے بولی۔

''ہائے فائزہ! تمہیں کیا بتاؤں اب تک میرے جہیز کے درجنوں برتن توڑ چکے ہیں۔ ہاٹ پاٹ کا بس یہ آخری پیس ہی بچا تھا۔ جو میں نے چند دن پہلے ہی ٹرنک سے نکالا تھا۔ منجھلی ممانی نے مجھے تحفہ دیا تھا۔ اب تو انہیں انتقال کیے بھی کئی سال ہو چکے ہیں۔'' وہ گیلی آنکھوں کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بولیں۔

''چلیں چھوڑیں بھابھی! بھائی صاحب کون سا خصوصی طور پر صرف آپ کے جہیز کے برتنوں کو ہی مشق ستم بناتے ہیں، جب وہ غصے میں ہوں تو اپنی جیب سے

خریدے ہوئے برتن بھی توڑ دیتے ہیں۔ آپ بتا تو رہی تھیں ایک دن کہ کوئٹہ سے جو ڈنر سیٹ نہایت شوق سے خرید کر لائے تھے اس کی بھی اب تک تین پلیٹیں شہید کر چکے ہیں۔ پھر وہ غصہ اترنے پر آپ کو پہلے سے زیادہ عمدہ اور بڑھیا چیز متبادل کے طور پر لا بھی تو دیتے ہیں۔'' فائزہ نے جیٹھ کی جانب سے ان کا دل صاف کرنا چاہا مگر وہ مزید بھڑک اٹھیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو فائزہ! مگر جب وہ میرے جہیز کا کوئی برتن توڑتے ہیں تو مانو کہ میرا کلیجہ ہی کٹ کر رہ جاتا ہے۔ تم جانتی تو ہو کہ عورت کو اپنے میکے کی طرف سے دی گئی چیزوں سے کتنا پیار ہوتا ہے۔ آخر اپنے پیاروں کی یادیں جڑی ہوئی ہوتی ہیں ان سے۔'' ان کا تو ملال ہی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ بھائی صاحب کو ہدایت دے! آپ یہ سوٹ دیکھیں ذرا! فائزہ نے شاپر کھول کھول کر دیدہ زیب سوٹ نکالنے شروع کیے۔ وہ بھی وقتی طور پر بہل گئیں اور تھوڑی دیر بعد ہاٹ پاٹ کا غم بھول بھال کر فائزہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئیں۔

☆☆☆

شام ڈھلے جب وہ گھر لوٹیں تو ماحول طوفان گزر جانے کے بعد والی خاموشی کا پتا دے رہا تھا۔ بچے کیرم بورڈ کھیل رہے تھے جبکہ صاحب بہادر کھاٹ کی کر لمبی تانے سو رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے ہاٹ پاٹ کے ٹکڑے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالے جا چکے تھے (غالباً بچوں نے ان کی دل آزادی کے خیال سے ایسا کیا تھا) ان کی نظر پڑی تو دل میں اک ہوک سی اٹھی مگر وہ اس وقت تو مصلحتاً خاموش رہیں مگر اگلے دن انہوں نے بھی خوب لڑائی جھگڑا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی اور اس سے اگلے دن میاں صاحب بھی تلافی کے طور پر زیادہ خوب صورت اور قیمتی ہاٹ پاٹ کا سیٹ لے آئے مگر پرانے والے کا غم بدستور ان کے دل میں درد بنا ٹیسیں دیتا رہا۔

☆☆☆

آج کل وہ تندہی سے گھر کی صفائی مہم میں جتی ہوئی تھیں۔ دراصل ان کی ناروے میں مقیم نند تشریف لا رہی تھیں اور بڑے بھائی اور بھاوج ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ ان ہی کے ہاں قیام کرتی تھیں۔

اس بار تو ان کی آمد کا مقصد بھی خصوصی تھا۔ وہ کئی سال پہلے اپنے بڑے فرزند کی بات اپنے دیور کی بیٹی کے ساتھ طے کر چکی تھیں اور اب باقاعدہ منگنی کرنے کا ارادہ تھا اور اس سلسلے میں تقریب بھی یقیناً ان ہی کے گھر میں منعقد ہونی تھی۔ اس لیے وہ پہلے کی نسبت زیادہ جوش خروش سے خصوصی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر گھر کو شیشے کی مانند چمکایا۔ نئے پردے اور بیڈ شیٹ وغیرہ خریدی گئیں۔ در و دیوار کچھ میلے میلے سے لگ رہے تھے۔

انہوں نے سرسری سا تذکرہ کیا تو میاں خلاف معمول جھٹ رنگ و روغن کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے بھی موقع غنیمت جانا اور فوراً ملازمہ اور بچوں کو ساتھ لگا کر سارا سامان کچھ گیراج اور کچھ کشادہ سے صحن میں ڈھیر کر دیا۔ وہ بھی ان کی مدد کے خیال سے دکان بند کر کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے سیڑھی لگا کر دیواروں پر لٹکتی آرائش اشیاء اور کیلنڈر وغیرہ اتارنے شروع کیے۔ رنگ و روغن والا بھی اپنے ساز و سامان کے ساتھ تشریف لے آیا۔ اس نے بھی بڑے سارے ڈرم میں چونا اور پانی وغیرہ ملا کر رنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

صاحب بہادر کمرے کے وسط میں کمرے تنقیدی نظروں سے در و دیوار کا جائزہ لے رہے تھے کہ کپڑوں والی الماری کے عین اوپر ٹنگی ہوئی ابا مرحوم کی فریم شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ فوراً سیڑھی لگا کر اوپر چڑھے اور تصویر اتارنے لگے۔ نہایت احتیاط سے کیل پر ہتھوڑی سے ہلکی سی ضرب لگائی۔ زنگ آلود کیل وہ ہلکی سی ضرب بھی برداشت نہ کر سکا اور آدھا ٹوٹ کر اڑتا ہوا دور جا گرا، ان سنبھالتے سنبھالتے بھی کے تصویر نیچے جا گری۔ شیشے کا فریم تو نیچے گرتے ہی چکنا چور ہو گیا اور اس کے ٹکڑے یہاں وہاں جا گری مگر اس کیا اندر موجود تصویر نکل کر عین کمرے کے وسط میں دھرے چونے ملے پانی کے ڈرم میں جا گری۔

انہوں نے فوراً ایک کرنکالی مگر یہ کیا تصویر بری طرح سے گیلی ہو چکی تھی۔ ابا مرحوم کے تمام نقوش بگڑ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے جھٹک کر خشک کرنا چاہی تو پرانا، خستہ حال گتہ گیلا ہونے کی وجہ سے دو تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

''اف میرے خدایا! یہ کیا ہو گیا.....'' وہ بے چارگی سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔

وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جائے حادثہ پر پہنچیں وہ زمین پر پھسکڑا مارے لٹے پٹے سے بیٹھے تھے۔

''ہائے ابا مرحوم کی تصویر مجھ سے ضائع ہو گئی۔''

وہ تصویر کے ٹکڑے ہاتھوں میں تھامے کراہے۔

''کوئی بات نہیں..... آپ کے پاس اور تصویریں ہوں گی ان میں سے کسی ایک کو فوٹو فریم کروا لیجیے گا۔'' انہوں نے دلاسا دینا چاہا۔

''نہیں بس ایک دو تصویریں ہی ہیں۔ وہ بھی گروپ فوٹو یا پھر فیملی فوٹو ہیں۔ یہ ہی ایک ان کی جوانی کی یادگار تصویر تھی اب تو شاید اس کا نیگیٹو بھی نہ ملے۔'' وہ حد سے زیادہ دل گرفتہ ہو رہے تھے۔

انہوں نے کسی کام میں حصہ نہ لیا اور چپ چاپ کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

☆☆☆

رات کو جب وہ ان کے لیے کھانے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ گہری سوچوں میں ڈوبے دکھائی دیے۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ گھبرا گئیں اور دھیرے سے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''اجی!..... سنیے..... کیا طبیعت ناساز ہے؟؟''

''کیا..... کیا کہا.....؟؟'' وہ چونک گئے۔

''میں پوچھ رہی تھی کہ کیا پریشانی ہے.....؟؟ طبیعت ناساز ہے کیا.....؟؟''

وہ دوبارہ استفسار کرنے لگیں۔

''نہیں بیگم..... بس دوپہر سے عجب کیفیت ہے.....!! ابا میاں کی تصویر ٹوٹنے کا غم ہی دل سے نہیں جا رہا ہے۔

میں جب بھی کمرے میں داخل ہوتا تھا تو فوراً نگاہ اس تصویر کی جانب اٹھ جاتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے ہی دیکھ رہے ہوں۔ اور اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج ہی ان کا انتقال ہوا ہے۔ آج ہی وہ مجھ سے جدا ہوئے ہیں..........کاش تصویر نہ ٹوٹتی۔''

وہ اپنی رو میں بولے جا رہے تھے جبکہ وہ سوچ رہی تھیں کہ ان کے اپنے ابا مرحوم کی تصویر حادثاتی طور پر ٹوٹ گئی تو وہ کسی قدر افسردہ ہو رہے ہیں اور خود کو کتنا مجرم سمجھ رہے ہیں اور ان کے جہیز کے برتن وہ جان بوجھ کر پھینک کر توڑ دیتے تھے مگر ذرہ برابر بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کے احتجاج کو خاطر میں لاتے تھے۔

پھر زیادہ قیمتی برتن دلا کر سمجھتے تھے کہ تلافی ہو گئی۔ وہ بھی تو اس وقت ایسے ہی احساس زیاں کا شکار ہوتی تھیں جس کا وہ اس وقت خود پہلی بار سامنا کر رہے تھے۔ وہ اگر چاہتیں تو اس وقت جتا بھی سکتی تھیں مگر وہ لفظی جنگ کر کے ہار چکی تھیں اور پھر ان پر اس کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اس بار ایک لفظ نہ بولیں اور خاموش ہی رہیں۔

جبکہ دوسری جانب وہ ان کی طرف سے کچھ طنزیہ اور جلے کٹے جملوں کی توقع کر رہے تھے مگر خلاف معمول ان کو خاموش پا کر حیرت زدہ ہو کر ان کی جانب دیکھنے لگے۔

ان کے لب تو خاموش تھے مگر ان کی آنکھوں میں انہیں گلے شکوؤں کے کئی رنگ نظر آئے۔ ٹھیک ہی کہا ہے کسی نے کہ خاموشی کی بھی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ جب لفظ بے وقعت ہو جائیں تو یہی ایک خاموشی سو لفظوں پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ اور مد مقابل کو وہ سب کچھ سمجھا دیتی ہے جو ہزار لفظ مل کر بھی نہیں سمجھا سکتے۔ آج انہوں نے یہ اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ ان کی بیگم درست کہا کرتی تھیں کہ کچھ نقصانات ایسے ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔ جوں ہی ان کی نظریں بیگم کی نظروں سے چار ہوئیں تو انہوں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا اس عزم کے ساتھ کہ آئندہ وہ ایسے کسی نقصان کا باعث نہیں بنیں گے۔

☆☆

شازیہ جمال طارق

ہار دے بھی تو بازی مات نہیں

”سخت زہر لگ رہی ہو شگفتہ! یوں ٹسوے بہاتی ہوئی۔ تمہارے جیسی عورتیں ہی شوہر کی ہر جائز و ناجائز بات مان کر پہلے خود ان کو ڈھیل دیتی ہیں اور پھر جب وہ اسی ڈھیل کا فائدہ اٹھا کر من مانی کرنے لگتے ہیں تو سر پکڑ کر رونے بیٹھ جاتی ہیں۔“

زرتاج بیگم نے خود سے دو سال چھوٹی بہن کو خوب لتاڑا۔

”غضب خدا کا، اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد تمہیں بتا کر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔“

شگفتہ کے رونے میں اور شدت آگئی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی آپا کہ پائی پائی جوڑ کر میں نے اپنی سچل کے لیے جو کنگن بنوائے تھے، راشد یوں مجھ سے پوچھے بغیر ان کو بیچ آئیں گے۔ کہہ رہے تھے کہ کاروبار میں گھاٹا ہو گیا ہے، جیسے ہی نفع ہوا تمہیں ویسے ہی کنگن بنوا کر دوں گا۔“

”ہونہہ۔ بنوا کر دے ہی نہ دے کہیں وہ۔“

زرتاج بیگم نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ”اچھا اب رونا تو بند کرو۔ یوں ٹسوے بہانے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ راشد میاں نے جو کرنا تھا سو کر لیا۔ اب تم ساری عمر بیٹھ کر ان کنگنوں کو روتی رہو گی کیا؟ ویسے بھی تمہاری اپنی کرنی تمہارے آگے آئی ہے، نہ اس کو اتنا سر پر

ناولٹ

چڑھاتیں کہ وہ تن تنہا اتنے بڑے فیصلے کرتا پھرتا۔

مجھے دیکھا ہے شروع دن سے کیسا ہولڈ رکھا ہوا ہے، جمیل صاحب پر۔ ان کی آج تک ہمت نہیں ہوئی میرے کسی فیصلے سے اختلاف کرسکیں۔ گھر بار، بچوں کی پرورش، سجیلہ کا رشتہ طے کرنے تک ہر چیز میں نے اپنی مرضی سے کی۔ جمیل صاحب چوں تک نہ کرسکے میرے آگے۔''

شگفتہ نے رشک سے بڑی بہن کو دیکھا۔ بھرا بھرا جسم، مہندی سے رنگے بالوں کا نفاست سے بنا جوڑا، ہلکے نیلے رنگ کا چکن کا سوٹ پہنے، کلائیوں میں بھن والی چوڑیاں۔ وہ ہمیشہ سے ہی رعب داب رکھنے والی تھیں۔ شادی سے پہلے ماں باپ کے گھر میں بھی ان کا حکم چلتا۔ چھوٹے بہن بھائی شروع سے ہی ان سے دبتے آئے تھے اور تو اور اماں ابا کے لیے بھی ان کے مشورے کے بغیر کوئی بھی چھوٹا بڑا قدم اٹھانا محال تھا۔

شادی کے بعد بھی بڑی بہو اور بڑی بھابھی بن کر اپنی خوب دھاک بٹھائے رکھی۔ ساس، نندوں کی کیا مجال جب وہ اپنے مرنج مرنجان سے شوہر کو ہی کسی گنتی میں شمار کرنے کی روادار نہیں تھیں۔

''لیں خالہ! ٹھنڈا ٹھار شربت پئیں۔ اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ رونے سے وہ کنگن تو آپ کو ملنے سے رہے۔'' سجیلہ نے شربت کا گلاس انہیں پیش کیا۔ جسے وہ ایک ہی سانس میں غٹا غٹ چڑھا گئیں۔ لیکن کم بخت اندر ایسی آگ لگی تھی جو کسی طور ٹھنڈی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گلاس خالی کرنے کے بعد ڈکار اور سرد آہ ان کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ پھر سے شروع ہوا چاہتی ہی تھیں کہ جمیل صاحب آتے دکھائی دیے۔ سفید کرتا شلوار، چھوٹی سی داڑھی، سر پہ سفید جالی والی ٹوپی پہنے، شکل سے ہی شریف اور حد درجہ مسکین نظر آتے تھے۔

''سجیلہ! ایک کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں دے جاؤ بیٹا۔'' شگفتہ سے سلام دعا کے بعد سجیلہ سے مخاطب ہوئے۔

سجیلہ ''جی ابا'' کہتی فوراً اٹھی تھی۔ لیکن زرتاج بیگم نے ٹوک دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی گرمی میں چائے پینے کی۔ غضب خدا کا یہاں گرمی سے دم نکلا جارہا ہے اور انہیں چائے پینے کی سوجھ رہی ہے۔''

''نیک بخت! سر میں شدید درد ہورہا ہے۔ سوچا چائے پینے سے آرام آجائے گا۔''

''سر کا درد ہی تو ہے، ٹھیک ہونے والا ہوا تو شربت سے بھی ہوجائے گا۔ جاؤ سجیلہ! اپنے ابا میاں کے لیے بھی شربت بنادو۔''

جمیل صاحب گہری سانس اندر کھینچتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ شگفتہ نے مرعوبیت سے زرتاج آپا کو دیکھا۔ ایسی جرأت وہ ہی کرسکتی تھیں ورنہ ان کی کیا مجال تھی کہ شوہر کی چائے کی طلب کو پس پشت ڈال کر زبردستی شربت پلانے پر مصر ہوسکیں۔

شگفتہ محض سوچ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''جگ جگ جیو میری بہن! اب تو تم اس گھر سے چلی جاؤ گی تو کون میری ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھے گا؟''

سجیلہ نے آج سارا دن لگا کر ارمان کے کمرے کا کونا کونا رگڑ کر صاف کیا تھا۔

نئی بیڈ شیٹ بچھائی، تکیے، کشن کے کور، پردے وغیرہ بدلے۔ گل دان میں تازہ پھول سجاتے ہوئے وہ مسکرا کر ارمان کی طرف مڑی۔ جسے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی ٹھنڈک اور تازگی کا خوش گوار احساس ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں، میں چلی جاؤں گی تو کوئی اور آجائے گی تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔ کوئی گھنگھریالے بالوں، شہد رنگ آنکھوں والی۔'' سجیلہ شرارت سے لب دبائے کہہ رہی تھی۔ ارمان پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔

''ہائیں ہائیں..... کون؟ کس کی بات کررہی ہو؟''

"کسی کی بھی نہیں۔ ایسے ہی مثال دے رہی تھی۔" کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے آگے بڑھی۔ ارمان جست لگا تا اس کے عین سامنے آ گیا۔

"نہیں، یہ تم کس کی مثال دے رہی تھیں گھنگھریالے بال، شہد رنگ آنکھیں؟"

"یہ تو تم مجھے بتاؤ گے۔ کب سے یہ راز دل میں چھپائے پھر رہے ہو کہ کانوں کان تک خبر تک نہ ہونے دی۔" ارمان سر کھجانے لگا۔

"لیکن بچو! میں بھی تمہاری بہن ہوں۔ تمہیں کیا لگا تھا، تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ جو آنکھیں ہیں نا اندر کے سارے بھید کھولنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہیں۔"

"جیمز بانڈ کہیں کی۔" اس کے سر پر چپت لگا تا ارمان بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"تمہیں سچل اچھی لگتی ہے۔ اب تک بتایا کیوں نہیں۔"

"میں بس تمہاری شادی کے بعد اماں سے اس سلسلے میں بات کرنے کا سوچ رہا تھا۔"

"خدا تمہیں تمہارے اس مقصد میں کامیاب کرے۔" سجیلہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"دیکھو زرتاج! میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ تم نے سجیلہ کا رشتہ طے کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح جانچ پرکھ کے بعد ہی انہیں کوئی جواب دینا چاہیے تھا۔"

"آپ تو رہنے ہی دیں جمیل صاحب! بھلا آپ کو کیا پتا ان باتوں کا۔ خواہ مخواہ کی سوچ بچار میں اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکل جاتا تو..... آج کل اچھے رشتے بھلا ملتے ہی کہاں ہیں؟"

زرتاج بیگم نے ہمیشہ کی طرح کڑک دار آواز میں میاں کی بات رد کی تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مجھے بس ایک ہی بات کھٹک رہی ہے۔ ایک دو جگہ سے پتا کروایا تو معلوم ہوا لڑکا کہیں ٹک کر کوئی کام نہیں کرتا۔ اب تک کئی جگہوں پر معمولی باتوں کو وجہ بنا کر اچھا بھلا لگا کام چھوڑ چکا ہے۔ ایسے غیر مستقل مزاج بندے سے کچھ بعید نہیں۔ نجانے ہماری سجیلہ کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھے۔"

"لڑکے تو ہوتے ہی غیر مستقل مزاج ہیں۔ طبیعت میں ٹھہراؤ تو شادی کے بعد آتا ہے۔ کسی حاسد نے ہی بے پر کی اڑائی ہوگی۔ آج کل کون خوش ہوتا ہے کسی کو اتنا اچھا بر ملے۔"

برآمدے میں ان کی گفتگو سنتی سجیلہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نجانے ابا میاں کی بات کہاں تک درست تھی۔ لیکن یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ اماں ایک بار جو فیصلہ کر لیں، انہیں کوئی اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ابا میاں تو بالکل نہیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں سجیلہ کی ہونے والی ساس اپنی بہو، بیٹیوں اور داماد کے ساتھ آئی بیٹھی تھیں۔ زرتاج بیگم اور جمیل صاحب وہیں موجود تھے۔ شادی کی تاریخ اور دیگر معاملات وغیرہ طے کیے جارہے تھے۔ سجیلہ نے مدد کے لیے سچل کو بلالیا۔ دونوں نے مل کر کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کرلیا تھا۔

"اچھا سنو، تم جاکر اب فریش ہوجاؤ۔ تب تک میں سلاد بنالیتی ہوں۔" سچل نے اسے کمرے کی طرف دھکیلا اور خود کرسی کھینچ کر سامنے میز پر سبزیاں پھیلائے سلاد بنانے لگی۔

"سجیلہ! بازار سے کچھ منگوانا ہے تو بتاؤ۔" ارمان بولتا ہوا اندر آیا تھا لیکن سامنے سجیلہ کی جگہ سچل کو دیکھ کر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہوگیا۔

"ارے، نیند میں تو کئی بار تمہیں اس گھر میں چلتا پھرتا، کام کرتا دیکھ چکا ہوں۔ اب کیا جاگتی آنکھوں سے بھی یہ خواب نظر آنا شروع ہوگیا ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ آپ کی سوتی جاگتی آنکھوں کا خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔" سبزیوں کے چھلکے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالتی سچل مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"خدا کرے، یہ حقیقت جلد امر ہوجائے۔" اس کی پشت پر بکھرے نم گھنگھریالے بالوں کو دیکھتا وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اندر آتی سجیلہ نے باآواز بلند "آمین" کہا تھا۔ سچل جھینپ کر رخ موڑ گئی۔ ارمان مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ دونوں جلدی سے دسترخوان لگانے لگیں۔

"میں نے تو اس ماہ کے آخری جمعہ کو نکاح کا سوچ رکھا ہے۔ آپ بس ہمیں اس جمعہ کو ہی نکاح کی تاریخ دے دیں۔"

"آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی بات کررہی ہیں۔" زرتاج بیگم سے پہلے جمیل صاحب بول پڑے۔

"ارے بھئی، نیک کام میں دیر کیسی؟" ان کے داماد صاحب نے بھی لب کشائی کی۔

"بعض اوقات جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔"

زرتاج نے دانت کچکچا کر شوہر نامدار کو دیکھا۔

"کیوں خواہ مخواہ بحث کیے جارہے ہیں۔ تیاری تو ساری میں کرچکی ہوں۔ آپ نے مزید وقت لے کر کون سا برادری میں بتاشے بانٹنے جانا ہے۔ رقیہ بہن! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس مہینے کا آخری جمعہ ٹھیک رہے گا۔" شوہر کو لتاڑنے کے بعد سجیلہ کی ساس سے مخاطب ہوئیں۔ جمیل صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

مجال ہے جو اس عورت نے کبھی کسی کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا ہو۔ باقی سب تو خیر ہے لیکن بیٹی کی ہونے والی سسرال کے سامنے ایسی عزت افزائی...... وہ دل مسوس کر وہاں سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

خاندان اور آس پڑوس کی لڑکیوں نے سرشام ہی ڈھولک بجا کر رونق لگادی تھی۔

شہلا پھوپھو کی ارم کھڑی ہوکر رقص کرنے لگی۔ سبز چوڑی دار پاجامے پر تنگ شارٹ زرد قمیص، دوپٹا کندھوں سے پھسلتا نیچے قدموں میں گر گیا۔ ارم کا لچیلا بدن تھرک رہا تھا۔ ارمان کسی کام سے اندر آیا تھا، نظر یوں ہی بلا ارادہ رقص کرتی ارم پر جاپڑی۔ اسی وقت سچل نے ارمان کو ارم کو دیکھتے دیکھ لیا۔ ناگواری کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ ہاؤ ہو کا شور، خوش گوار قہقہے، تالیوں کی گونج......

سب بڑھ چڑھ کر ارم کو داد دے رہی تھیں۔ سچل وہاں سے اٹھ گئی، فریج سے تازہ گلاب کی پتیوں سے بھرا تھال لے کر جوں ہی پلٹی عقب میں کھڑے ارمان سے بری طرح ٹکرا گئی۔ تھال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ گلاب کی پتیاں یہاں وہاں بکھر گئیں۔ چند ایک سچل کے گھنگھریالے بالوں میں اٹکتی اس کی تیاری کو مزید چار چاند لگا گئیں۔

''واہ! کیا نظارہ ہے۔'' ارمان مبہوت سا اسے دیکھے گا۔

''کیوں..... کیا باہر کے نظارے سے جلدی دل بھر گیا؟'' تیکھے لہجے میں کہتی وہ اس کے پہلو سے نکل کر باہر جانے لگی۔ ارمان نے کلائی سے پکڑ کر روک لیا۔ سچل خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''کبھی بھی محض لمحہ بھر کی غلط فہمی کو بھی اپنے دل میں جگہ مت دینا سچل۔ ورنہ تمہارے لیے میرے اس خوب صورت احساس کی کلی کھل کر مسکرانے سے پہلے ہی مرجھانے لگے گی، جسے محبت کہتے ہیں۔'' اس کی کلائیوں میں گجرے پہناتا وہ گمبھیر لہجے میں بولتا باہر نکل گیا۔ سچل مسحور سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

سجیلہ رخصت ہوگئی تھی۔ سارا شور شرابا دم توڑ گیا۔

''کیسی دل کو کاٹتی ویرانی اور خاموشی سی چھا گئی ہے۔ ہماری سجیلہ کیا اس گھر سے گئی گویا ساری رونق بھی اپنے ساتھ لے گئی۔'' ابا میاں زور درنج ہو رہے تھے۔

''بیٹیوں نے تو ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہی ہوتا ہے۔ اب میں خیر سے اپنے ارمان کی دلہن لے آؤں گی۔ گھر میں پھر سے رونق ہو جائے گی۔'' زرتاج بیگم ارمان کے کندھے پہ دباؤ ڈالتی اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

ارمان زیر لب مسکرا اٹھا۔

''اس مسکراہٹ کی وجہ جان سکتا ہوں برخوردار؟'' ابا میاں نے گویا اس کی چوری پکڑ لی تھی۔

''بالکل جان سکتے ہیں، لیکن اس شرط پر کہ جب یہ مقدمہ اماں کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، آپ میرا ساتھ دیں گے؟''

''میں کیا اور میری اوقات کیا؟'' ابا گویا خود پر نازاں تھے۔

ارمان کو ذرا اچھا نہ لگا۔

''ابا!''

''دیکھا نہیں، تمہاری اماں نے سجیلہ کا رشتہ اور شادی وغیرہ کے سارے معاملے میں مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر پھینکا۔ تمہاری دفعہ بھی وہ کہاں کسی کی رائے کو خاطر میں لائے گی۔''

''امید پہ دنیا قائم ہے۔'' ارمان نے کہا۔

''ہاں، دل والوں کی۔'' ابا نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد داماد پہلی بار آ رہا تھا۔ زرتاج بیگم نے خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ سجی سنوری، شرمائی شرمائی سی سجیلہ کا چہرہ اس کی اندرونی خوشی کا غماز تھا۔ وہ خود ایک ایک ڈش اٹھا کر شاہد کو پیش کرتی رہی۔

کھانے کے دوران ہی ارمان کی شادی کا ذکر چھڑ گیا۔

''ہاں بھئی تمہارے بغیر تو اب یہ گھر ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ارمان کی دلہن آ جائے گی تو کچھ ہمارا بھی دل بہلے گا۔''

''ارمان سے بھی پوچھ لیں تاکہ اس کے دل میں کوئی ''ارمان'' نہ رہ جائے۔''

شاہد کی بات پر زرتاج فخر سے سینہ پھلا کر بولیں۔

''میرا ارمان ایسا نہیں ہے۔ بہت فرماں بردار ہے۔ جو ماں کی پسند، وہی اس کی پسند۔''

ارمان پہلو بدل کر رہ گیا۔

''مطلب آپ کی نظر میں کوئی ہے۔'' سجیلہ نے ماں کو کریدا۔

''بھئی رشتہ تو میں اپنوں میں ہی کروں گی۔ غیروں سے تو بہ بھلی۔ ایک تو تمہاری شہلا پھوپھو کی ارم اور دوسری.....''

ارمان کا دل کہیں پسلیوں میں ہی پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ ''اور دوسری شگفتہ کی سچل۔'' انہوں نے بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

''میرے خیال سے ارم ٹھیک رہے گی۔ ماشاء

اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ شادی میں خوب رونق لگائی ہوئی تھی اس نے۔'' ابا میاں بول رہے تھے۔ ارمان کو اچھو لگ گیا۔ شاکی نظروں سے ابا میاں کو دیکھا۔ ارم کے نام پر سجیلہ بھی چپ ہوگئی۔ جب کہ زرتاج نے پرسوچ ہنکارا بھرتے ہوئے موضوع گفتگو بدل دیا اور داماد سے اس کی پسند ناپسند پوچھنے لگیں تاکہ اگلی دعوت کا انتظام اس کی پسند کو مدنظر رکھ کر کیا جاسکے۔

☆☆☆

''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی ابا! آپ ایسا کیسے کرسکتے ہیں میرے ساتھ؟'' صدمے سے چُور لہجے میں بولتا ارمان ان کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

''کل ہی تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں سچل کو پسند کرتا ہوں اور آج آپ اماں سے ارم کی طرف داری کررہے تھے؟''

''آرام سے بیٹھ جاؤ صاحب زادے۔ میں نے صرف ایک تیر چھوڑا ہے۔ دعا کرو نشانے پر لگ جائے۔''

''کیا مطلب؟'' ارمان کے قدم تھمے۔

''کیا تم صبح تک کا انتظار نہیں کرسکتے؟'' ارمان انہیں ناراض نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔

صبح منہ پھلائے وہ ناشتے کے لیے آبیٹھا۔

''ہاں بھئی، کیا سوچا ہے۔ کب جانا ہے شہلا کی طرف اپنے ارمان کا رشتہ لے کر؟''

ارمان کا دل چاہا سامنے پڑا چائے کا کپ اٹھا کر پھینک دے۔ ابا میاں ایک دم پھاپھا کٹنی لگنے لگے تھے۔ لیکن اماں کی بات پر اسے زوردار جھٹکا لگا۔

''آپ سے کس نے کہا میں شہلا کی طرف ہی رشتہ کروں گی۔ سچل میری اپنی بھانجی ہے اور ارم سے لاکھ درجے سلجھی ہوئی ہے۔''

ارمان کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ابا میاں نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے چائے کا کپ لبوں سے لگالیا۔ اماں کسی کام سے کچن سے باہر گئیں تو ارمان کا دل چاہا وہیں کھڑے ہوکر بھنگڑا ڈالنا شروع کردے۔

''تیر لگ گیا نشانے پر؟''

''اوہ۔ تو اس کا مطلب ہے آپ نے اس وقت جان بوجھ کر سچل کی جگہ ارم کا نام لیا تھا۔'' ارمان کو اب ابا کا کیم سمجھ میں آنے لگا تھا۔

''ہاں، کیوں کہ میں جانتا تھا تمہاری ماں اس بار بھی میری رائے پر اپنی خواہش اور مرضی کو ترجیح دے گی۔'' ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔

ارمان نے اٹھ کر انہیں گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

شگفتہ بہن کی مزاج آشنا تھیں۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اپنے آگے وہ کسی کی نہیں چلنے دیتی تھیں۔ ذرا سی اونچ نیچ ہوئی نہیں وہ ''خالہ'' سے ''ساس'' بننے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گی۔ لیکن دوسری طرف بیٹی کی خوشی اور ارمان جیسا سلجھا ہوا داماد انہیں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا۔ سو دل میں ہزار اندیشے لیے اللہ کا نام لے کر ہاں کردی۔

''سجیلہ کی شادی پر بہت دھوم دھڑکا ہوگیا۔ اب میں سب کچھ سادگی سے ہی کروں گی۔''

شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی زرتاج نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔

''کیوں بھئی؟ ہمارے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے۔ بینڈ باجوں کے ساتھ بارات لے کر جائیں گے۔''

''آپ تو رہنے ہی دیں جمیل صاحب! بات تو یوں کرتے ہیں جیسے کوئی قارون کا خزانہ سنبھال کر بیٹھے ہوں۔ پہلے ہی سجیلہ کی شادی پر اچھا خاصا خرچا ہوگیا۔ مجھ سے نہیں بھگتائی جاتی پھر سے وہی جگ ہنسائی۔''

''خیر کچھ نہ کچھ تو کرہی لیں گے۔ خیر سے اچھا خاصا کماتا ہے ہمارا ارمان۔''

ابا میاں نے ہار نہ مانی۔

''اچھا خاصا کمانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی کی ساری زندگی اپنی شادی کے فضول کے دھوم

دھڑکوں کے لیے لیا گیا قرض چکاتا رہے اور میں بھی کیوں بھلا آپ کے ساتھ دماغ کھپا رہی ہوں۔ سن رہی ہو شگفتہ! تم اپنی طرف سے جو کرنا چاہو کرو، ہماری طرف سے تو بھئی سب کچھ سادگی سے ہی ہوگا۔''

شگفتہ کیا کہتیں۔ اب کہنے کا کچھ فائدہ نہیں، وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

☆☆☆

زرتاج بیگم جس سادگی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں۔ اس سے ان کی مراد بری۔ زیورات اور شادی کے فنکشنز میں جتنا پیسہ بچایا جاسکتا ہے بچالیا جائے۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ البتہ ارمان کے دوستوں نے باہر مل کر خوب ہلا گلا کیا۔ اور پھر تاروں کی چھاؤں میں سچل دعاؤں کے سنگ رخصت ہو کر آ گئی۔

''اداس ہو؟'' اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ارمان کو اداسی سی نظر آئی تھی۔

''خالہ کی ناانصافی پر دکھ ہوا ہے۔ ایسے تو کسی بیوہ اور رنڈوے کی بھی شادی نہیں ہوتی۔''

ارمان نے گہری سانس کھینچی۔

''فرض کرو سچل! ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوتی لیکن ایک دوسرے سے ہونے کے بجائے کسی اور کے ساتھ ہو جاتی تو؟''

''اللہ نہ کرے۔'' بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''تو کیا تمہارے خوش ہونے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ خدا نے ہمارا جوڑا ایک ساتھ لکھ دیا اور آج ہم یوں ایک مضبوط اور مستحکم حیثیت سے ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہیں؟'' وہ سنجیدہ لیکن ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

سچل نے سر جھکا لیا۔ ارمان کا دل چاہا رات بھر اسے سامنے بٹھا کر یوں ہی دیکھتا رہے۔

''ارمان! پلیز بس کریں۔''

''کیا؟''

''اس طرح سے دیکھنا۔'' دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم چٹخاتی وہ سخت پزل ہو رہی تھی۔

''تو اور کس طرح سے دیکھوں؟'' اس کے حنائی ہاتھ تھامتے ہوئے وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ سچل کا چہرہ گلنار ہونے لگا۔

☆☆☆

سجیلہ ٹکر ٹکر ساس کی شکل دیکھنے لگی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو آپ یوں باتیں سنا رہی ہیں۔ صرف اپنے بھائی، بھاوج کی دعوت کرنے کا ہی تو کہا ہے۔''

''تو بی بی! جا کر اپنے میاں سے کہو جو دن چڑھے تک بستر توڑتا پڑا رہتا ہے۔ شادی ہوگئی، دعوتیں نپٹ گئیں۔ اب تک کیوں گھر میں پڑا ہوا ہے۔ کام پر کیوں نہیں جاتا؟''

سجیلہ چونکی۔

''میں نے پوچھا تھا ان سے، کہہ رہے تھے ابھی چھٹیاں ختم نہیں ہوئیں۔''

منجھلی نند فائقہ ہنسنے لگی۔

''اچھی بے خبری ہے۔ چھٹیاں ختم نہیں ہوئیں یا شروع ہی اب ہوئی ہیں۔''

سجیلہ کو ان کی باتوں نے الجھا دیا۔ کمرے میں آ کر اس نے سوئے ہوئے شاہد کو جھنجھوڑا۔

''افوہ۔ کیا مصیبت ہے۔ کیا قیامت آ گئی ہے۔''

''آپ کام پر کیوں نہیں جا رہے؟''

''کون سے کام پر؟'' مندی مندی آنکھیں مسلتا وہ ہونق پن سے اس سے پوچھنے لگا۔

''میرا مطلب ہے جاب پر۔''

''جاب..... وہ تو کب کی ختم ہوگئی۔'' اس کے اطمینان سے کہنے پر سجیلہ چلائی۔

''کیا؟'' شاہد نے ناگواری سے اس کے انداز کو دیکھا۔

''شادی سے دو چار دن پہلے۔ عجیب بد دماغ انسان تھا۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ مجھے

بھی غصہ آ گیا۔ استعفیٰ منہ پر دے مارا۔''

سجیلہ صدمے سے اسے دیکھے گئی۔ ''آپ کی جاب ختم ہوگئی اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''اب تو بتا دیا نا۔ ہٹو سامنے سے۔ ساری نیند خراب کر دی۔'' بڑبڑاتا، جمائیاں لیتا وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ سجیلہ بیڈ پر گر سی گئی۔ گھر والوں کے بدلے بدلے رویے کی وجہ اسے اب سمجھ میں آنے لگی تھی۔

☆☆☆

''تو اس میں ہاتھ پاؤں چھوڑنے والی کون سی بات ہے؟ نوکری ہی ختم ہوئی ہے اور مل جائے گی۔'' سجیلہ ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

''کہیں ہاتھ پاؤں مارے گا تو اور ملے گی۔ گھر بیٹھے تو ملنے سے رہی۔''

وہ اچھی خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ سچل چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی کہ اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ زرتاج بیگم ہر آئے گئے کے سامنے برملا کہتیں۔

''سارا گھر اٹھا کر بہو کے حوالے کر دیا۔ اب یہ سیاہ کرے یا سفید، اس کی مرضی۔''

اور یہ تو صرف سچل ہی جانتی تھی کہ بے شک کرتی سارا کچھ وہ ہی تھی لیکن زرتاج بیگم کی مرضی اور مسلسل دی جانے والی ہدایات کے مطابق۔

چائے پی کر سجیلہ منہ پر دوپٹا ڈال کر لیٹ گئی۔ سچل کچن میں جا کر شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ شاید سجیلہ کو لینے آتا تو کھانا یہیں کھاتا۔ زرتاج خالہ کے حکم کے مطابق وہ بریانی پکانے لگی۔ سچل کو پکا یقین تھا کہ ان دنوں اس کے گھر میں جو مسائل وغیرہ چل رہے تھے وہ شاید ہی سب کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھا سکے۔

لیکن اس کی غلط فہمی شام کو دور ہوگئی۔ شاہد یوں دامادوں والے ٹھسے سے ڈائننگ ٹیبل پہ آ بیٹھا اور بلا تکلف بریانی کی پلیٹ پر بوٹیوں کا پہاڑ کھڑے کرتا رغبت سے کھانے لگا۔

''اور سناؤ برخوردار! کام وغیرہ کیسا جا رہا ہے؟'' ابا میاں نے غلط موقع پر صحیح سوال کیا تھا۔ شاہد کے گلے میں ہڈی پھنس گئی۔

ارمان نے پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے کیا۔

''اس آدمی کو کبھی بات کرنے کا ڈھنگ نہ آیا۔'' زرتاج بیگم نے دانت پیسے۔

سجیلہ بے زار سی اٹھ کر اپنا بیگ اور چادر لیتے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

ابا میاں کو تیزابیت کا مسئلہ ہو رہا تھا۔ ان کی طبیعت کے پیش نظر سچل نے کھانے میں مرچ مسالے کم ڈالے۔ ابا میاں ممنونیت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے کھانا کھانے لگے۔

''اونہہ۔ اتنا پھیکا اور بدمزا کھانا۔'' پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی زرتاج کا مزاج بگڑ گیا۔

''وہ خالہ دراصل ابا میاں کی طبیعت کی وجہ سے آج کھانے میں مرچیں وغیرہ کم ڈالی ہیں۔'' سچل وضاحت دینے لگی۔

''سارا سارا دن حاجی صاحب کی بیٹھک میں بیٹھ کر چائے پینے سے ان کا معدہ خراب نہیں ہوتا اور تم کھانا پکانے سے پہلے مشورہ نہیں کر سکتی تھیں۔ لے کے سارا رزق ضائع کر دیا۔ کان کھول کر میری بات سن لو، اگر تم نے ایسے ہی من مانیاں کرنی ہیں تو بی بی اپنا چولہا ہانڈی الگ کر لو۔'' اتنی سی بات پر ایسی زبردست جھاڑ۔ سچل رونے والی ہوگئی۔

''چھوڑیں نا اماں! جانے دیں۔ اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔'' ارمان انہیں ٹھنڈا کرنے لگا۔

''نہ تم ایسا کرو، کسی قبرستان میں جا کر گڑھا کھودو اور مجھے اس میں زندہ دفن کر آؤ۔ پھر بھلے سے کرتے رہنا اپنی من مانیاں۔''

غصے سے بولتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ابا میاں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

سچل الگ سر پکڑے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سجیلہ کی طبیعت خراب تھی۔ شاید دن چڑھے سویا رہتا۔ کھاپی کر باہر دوستوں میں نکل جاتا۔ رات گئے واپسی ہوتی۔

ساس نندوں کی جلی کٹی سننے کے لیے سجیلہ اکیلی رہ جاتی۔ وہ کرتی بھی تو کیا شوہر کی بے روزگاری، نکمے پن اور فارغ بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کے طعنے سن سن کر تو اس کے کان پک گئے۔ جواب میں کچھ بولتی تو بات کا مزید بتنگڑ بن جاتا۔

اس کے مقابلے میں جٹھانی راحیلہ کی پوزیشن گھر میں مستحکم تھی۔ جس کے شوہر نے گھر کا آدھے سے زیادہ خرچہ اٹھا رکھا تھا۔ اس کی بیوی بچے گھر بھر کے منظور نظر بنے ہوئے تھے۔ شادی شدہ عورت کی اپنے سسرال میں حیثیت مستحکم یا کمزور شوہر کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ اور جس کا شوہر ہی مستقل بے روزگار ہو۔ سجیلہ ادھ موئی سی ہونے لگی۔

اوپر سے جب سے اس کے امید سے ہونے کا پتا چلا تھا، ساس نے الگ واویلا مچا دیا۔ اب بچے کا خرچہ بھی ہمیں اٹھانا پڑے گا۔''

سجیلہ نے فون کر کے روتے ہوئے ماں کو ساری صورت حال بتائی۔

''اماں! وہ لوگ تو مجھے گھر سے نکالنے کے درپے ہو گئے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کچھ کھا کر مر جاؤں۔ اور اب یہ بچے کا جنجال.....''

زرتاج نے اسے فوراً ضروری سامان باندھ کر اپنے ہاں چلے آنے کا کہا۔ رکشے میں دھکے کھاتی روتی کرلاتی سجیلہ سامان سمیت پہنچ گئی۔ سچل نے بھاگ کر پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

''ارے کیسی ڈائن ماں ہے۔ ذرا کلیجہ نہیں کانپا اس کا۔ اور کچھ نہیں تو اپنے بیٹے کی ہونے والی اولاد کا ہی خیال کر لیتی۔'' شام کو شاید آیا تو زرتاج بیگم اسی کے سامنے برا بھلا کہنا شروع ہو گئیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں خالہ جی! مجھے خود اماں سے ایسی سخت دلی کی امید نہیں تھی۔ میں کوشش کر تو رہا ہوں۔ ایک دو جگہ انٹرویو بھی دیا ہے۔ امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی بات بن جائے گی۔ بس مجھے اپنے گھر والوں کے رویے نے دکھی اور آپ لوگوں کے سامنے شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔''

''ارے دفع کرو ایسے ہوتے ہیں گھر والے، جو مشکل وقت میں ساتھ دینے کے بجائے گھر سے ہی دھتکار دیں۔ میں تو کہتی ہوں تم بھی یہیں آ جاؤ۔ یہ بھی تو تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔''

''نیک بخت! اتنی جلد بازی اچھی نہیں۔ شاید میاں کا یہاں رہنا مناسب نہیں جب تک یہ کوئی نوکری اور کرائے کے گھر کا انتظام کرے تب تک ہماری بچی یہیں ہمارے پاس رہے گی۔'' جمیل صاحب کی مداخلت زرتاج بیگم کو خوب کھلی تھی۔

''آپ تو اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھیں۔ دیکھا نہیں ہے کیسے کملا کر رہ گئی ہے میری بچی۔ اور اگر ہم ہی اس کے شوہر اور ہونے والے بچے کا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟'' سجیلہ صوفے پر نڈھال سی سر گرائے بیٹھی تھی۔ جبکہ زرتاج کی بات سن کر شاہد کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات فوراً نمودار ہوئے تھے۔

''میں اوپر والا پورشن صاف کروا دیتی ہوں۔ جب تک تمہاری نوکری کا بندوبست نہیں ہو جاتا تم لوگ آرام سے یہاں رہو۔ نوکری مل جائے بھر بھلے اپنی بیوی کو لے کر کرائے کے گھر میں چلے جانا۔'' زرتاج بیگم نے بیٹھے بیٹھے سارا پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔ شاہد نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ابا میاں داڑھی کھجاتے سوچ میں ڈوبے رہے۔

☆☆☆

''کیا ضرورت تھی داماد کے سامنے زیادہ مین میخ نکالنے کی؟ کیا سوچے گا وہ کہ اس کی دو وقت کی روٹی بھاری ہے ہم پر۔''

زرتاج بیگم کو ابھی تک جمیل صاحب کا بیچ میں بولنا کھٹک رہا تھا۔

''اگر ایسا ہی سوچنے سمجھنے والا ہوتا تو ہمارے

ایک ہی بار کے کہنے پر اپنا سامان باندھ کر یہاں نہ آجاتا۔'' ابا میاں صاف گوئی سے بولے۔ ''ویسے بھی بات دو وقت کی روٹی کی نہیں احساس ذمہ داری کی ہے۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ذمہ داریوں سے مزید غافل ہو جائے گا۔''

''بہر حال جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ آپ اپنے دماغ پر زیادہ زور مت دیں۔'' بے زاری سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میری دعا ہے تمہیں اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔''

''ہونہہ!'' کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

''سجیلہ کی طبیعت کے پیش نظر زرتاج بیگم نے اسے اس کی شادی سے پہلے والا کمرہ دے دیا تاکہ بار بار اوپر نیچے کی پریڈ میں اس کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔''

سچل اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کرتی۔ شاہد یوں بلا تکلف رہنے لگا گویا ہمیشہ سے یہیں ان سب کے ساتھ ہی رہتا آرہا ہو، آتے جاتے اکیلے میں کوئی بے تکلف جملہ سچل کی طرف اچھال دیتا۔ اسے بے حد برا لگتا۔ دانستہ وہ اس کے سامنے زیادہ آنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ لیکن ایک ہی گھر تھا آمنا سامنا ہو ہی جاتا۔

اس شخص کی آنکھیں کتنی عجیب سی ہیں۔ بے باک، بدلحاظ سی، نجانے خالہ نے کیا سوچ کر سجیلہ کی شادی اس شخص کے ساتھ کر دی۔ سچل دوسری الجھن میں مبتلا تھی۔ شاہد کی روز بروز بڑھتی بے تکلفی اسے کوفت میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس سلسلے میں وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ معمول سے قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ ارمان کو جلدی آفس پہنچنا ہوتا تھا۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارتی وہ جلدی سے کچن میں گھس گئی۔

ارمان کا ناشتہ، ارمان کے کپڑے، ارمان کے جوتے..... وہ گھن چکر بن کر رہ گئی۔

''ارے بی بی! بس کرو نیک پروین بننا۔ ہمارے، مردوں کو عادت نہیں ہے یوں بھاگ بھاگ کر خدمتیں کروانے کی۔ تمہارے ہاں ہی عورتیں ایسے چاپلوسی سے کام چلا کر مردوں کو الو بنایا کرتی ہوں گی۔''

ارمان آفس سدھارا تو اس نے سکون کا سانس لیا لیکن خالہ کی بات سن کر اسے ان کی ذہنیت پر شدید افسوس ہوا۔

''اس میں چاپلوسی والی کون سی بات ہے خالہ! اپنے شوہر کی خدمت اور اس کی ضروریات کا خیال رکھنا تو ہر بیوی کا فرض ہے۔ اماں کہتی ہیں شوہر کو خوش کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ اگر اپنے شوہر کے دکھ سکھ کا خیال بیوی نہیں رکھے گی تو تف ہے ایسے رشتے پر۔''

چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں جتا نہ سکی کہ کل ابا میاں کی طبیعت اتنی خراب تھی وہ سارا وقت اپنے کمرے میں لیٹے رہے۔ حاجی صاحب کی طرف بھی نہ جا سکے۔ اور زرتاج بیگم نے ایک بار بھی ان کے کمرے میں جا کر ان کی طبیعت پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

زرتاج نے چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تھی۔ تب ہی شاہد لاؤنج میں چلا آیا۔

سچل فوراً کھڑی ہوئی تھی۔

''بھابھی جی! اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا دیں گی۔ سجیلہ سو رہی ہے ورنہ اسی سے کہتا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ زحمت کیسی؟ ابھی بنا دیتی ہے۔'' زرتاج بیگم کے اشارہ کرنے پر وہ کچن میں آگئی۔ سخت زہر لگنے تھا وہ شخص اسے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے بارے میں سوچ گئی۔

''ہاؤ!'' خاموشی سے چلتا وہ کب اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا تھا اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ ڈر کے مارے وہ اچھل ہی تو پڑی۔ چائے چھلک کر اس کے ہاتھ پر آگری تھی۔

''ہاہاہا۔آپ تو ڈر گئیں۔'' بدتمیزی سے ہنستا وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔تکلیف کی شدت سے سچل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ارے ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔دکھائیں آپ کا ہاتھ زیادہ جلا تو نہیں؟'' وہ فوراً آگے کو ہوا تھا۔سچل دو قدم پیچھے ہٹی۔

''میرا اور آپ کا مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔بہتر ہوگا آپ اپنی حد میں رہیں۔''

ترشی سے کہتے چائے کا کپ اس کے سامنے سلیب پر پٹخا۔تب ہی سجیلہ نے اندر جھانکا تھا۔ناسمجھی سے دونوں کو دیکھا۔سچل بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔جبکہ وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔

''تمہاری بھابھی نے کہا اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاؤں۔میں نے بھی کہا نیک کام میں دیر کیسی؟'' سجیلہ یونہی اسے دیکھے گئی۔

☆☆☆

بہت لاپروا ہوتی جا رہی ہو تم خود سے سچل! حد ہوگئی اتنا زیادہ ہاتھ جلا لیا اپنا۔'' اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر برنال لگاتا ارمان خفگی سے اسے ڈانٹنے لگا۔سچل کے آنسو بہہ نکلے۔

''یہاں سب بے حس ہیں۔کسی کو کسی کا احساس نہیں۔''

''تو تمہیں کیا ضرورت تھی جلے ہوئے ہاتھ سے سارا کام کرنے کی؟ مجھے ایک فون کر دیا ہوتا میں باہر سے کھانا منگوا دیتا۔''

''جو اصل مسئلہ ہے وہ آپ لوگوں کو کیوں نظر نہیں آ رہا؟'' سچل پھٹ پڑی۔

''آخر کب جائیں گے یہ لوگ اپنے گھر؟''

''تم تنگ آ گئی ہو میری بہن سے؟''

''آپ کی بہن سے نہیں بلکہ.....'' سچل نے لب بھینچ لیے تھے۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟ کھل کر کہو۔''

''مجھے سجیلہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے ارمان! لیکن اس کا شوہر، اس کی موجودگی میں میں خود کو آرام دہ محسوس نہیں کرتی۔اپنے ہی گھر میں مجھے اپنے اٹھنے بیٹھنے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اتنے عرصے سے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔آپ لوگوں کو نظر کیوں نہیں آتا؟ ایسا کب تک چلے گا؟

سجیلہ کی ساری ذمہ داری ہم لوگوں نے اٹھالی۔وہ اب اس کی طرف سے زیادہ لاپرواہ اور بے فکر ہو گیا ہے۔سجیلہ ہم پر بوجھ نہیں ہے لیکن اس کے شوہر کی یہ بے فکری اور فراغت خود سجیلہ کے لیے ایک دن مسئلہ بن جائے گی۔آپ اس بارے میں سوچیں تو آپ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوگا۔''

''میں نے ایک دو جگہ اس کے لیے بات کر رکھی ہے۔آج ہی اس سے اس سلسلے میں بات کرنے والا تھا۔'' ارمان پرسوچ انداز میں بول رہا تھا۔

سجیلہ، ارمان سے شاہد کی جاب کا کہیں بندوبست کرنے کا کہنے کے لیے ان کی کمرے کی طرف آئی تھی۔لیکن اندر سے آتی باتوں کی آواز سن کر وہ دروازے کے باہر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

حاجی صاحب ابا میاں کے بہت گہرے اور پرانے دوست تھے۔میاں بیوی، دو شادی شدہ بچوں اور ایک بیوہ بہن پر مشتمل مختصر سی ان کی فیملی تھی۔

ابا میاں کی ریٹائرمنٹ کے وقت ارمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔سو معاشی بے فکری۔گھر میں یہ ہر وقت زرتاج بیگم کی چخ چخ سے تنگ آ کر انہوں نے زیادہ تر وقت حاجی صاحب کی بیٹھک پر گزارنا شروع کر دیا۔

دونوں دوست مل کر تاش کھیلتے، چائے پیتے، سیاست اور حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرے کیے جاتے۔حاجی صاحب کے گھرانے میں ابا میاں کو بہت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

حاجی صاحب ان دنوں علیل تھے۔ابا میاں کا زیادہ تر وقت ان کے ساتھ بیٹھک میں گزرنے لگا تھا۔اپنے گھر کے معاملات میں ان کی حیثیت نہ تین میں تھی نہ تیرہ میں۔مزید شاید میاں کی گھر داماد نے

انہیں گھر کے ماحول سے بے زار کر دیا تھا۔

☆☆☆

''امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سچل آج کئی دنوں بعد میکے آئی تھی۔ شگفتہ خود بھی زرتاج بیگم کے مزاج سے خائف ہو کر زیادہ وہاں جانے سے گریز کرتیں۔ اب تو بیٹی کے سسرال کا معاملہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکلے جس کی وجہ سے سچل کو ساس کے مزاج کی برہمی سہنا پڑے۔ سچل خود ہی ایک دو ہفتے بعد چکر لگا لیتی۔ آج شگفتہ نے اسے جو خبر سنائی تھی اسے سن کر تو حقیقتاً اس کے ہوش ہی اڑ گئے۔

''مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن تم جانتی تو ہو ماجد جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے اتنی بڑی بات کی ہے تو یقیناً اس میں کچھ نہ کچھ تو صداقت ہوگی۔''

''خالہ کو پتا چلا تو وہ تو گھر میں قیامت اٹھا دیں گی۔ ان کی مرضی کے بغیر پتا بھی ہلے تو انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی بات وہ کیسے برداشت کریں گی؟'' سچل ابھی تک شاک میں تھی۔

''آپا کی اسی عدم برداشت اور حاکمانہ طبیعت نے تو یہ دن دکھایا ہے۔ عورتوں کو اتنا خود پسند اور حاکمیت پسند نہیں ہونا چاہیے کہ سامنے والے کے لیے کوئی راہ فرار اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے۔ بہرحال تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن امی! ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی ہیں؟ ایک نہ ایک دن تو پتا چلنا ہی ہے۔'' وہ سچ مچ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سچل نے آج پہلی بار ابا میاں کو اور نظر سے دیکھا تھا۔ ان کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیا۔ بظاہر تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لیکن کچھ تھا ایسا جو چونکانے والا تھا۔ وہ اضطراب، بے سکونی اور عدم اطمینان کی جو کیفیت ہمہ وقت ان کی شخصیت پر چھائی رہتی تھی۔ اس کی جگہ ایک ٹھہراؤ نے لے لی تھی۔ کیا وہ اپنے اس فیصلے مطمئن ہیں؟'' سچل سوچے گئی۔

''بیٹا! میں حاجی صاحب کی طرف جا رہا تھا کوئی کام ہے تو بتاؤ۔'' سچل چونکی پھر آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''ہونہہ! پوچھ تو یوں رہے ہیں جیسے ان کی وجہ سے نجانے ہمارے کتنے ضروری کام رکے ہوئے ہوں۔'' زرتاج بیگم کی طنز میں ڈوبی خود کلامی اتنی بلند تو ضرور تھی کہ سچل کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب نے بھی بخوبی سن لی۔ بنا کچھ کہے وہ آگے بڑھ گئے۔

سچل سارا دن غائب دماغی کی سی کیفیت میں گھر کے کام نپٹاتی رہی۔ سجیلہ نے کچھ ضروری شاپنگ کرنی تھی۔ شام کی چائے پی کر وہ اور زرتاج خالہ مارکیٹ چلی گئیں۔

''سچل! یار ایک کپ اچھی سی چائے تو پلا دو۔'' آفس سے واپس پر ارمان تھکا تھکا سا صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں مسلنے لگا تھا۔

''اگر جو ارمان کو پتا چل جائے کہ.....'' وہ یونہی اسے دیکھے گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

سچل چونکی۔ ''ہاں ٹھیک ہوں، کیوں؟''

''لگ تو نہیں رہیں۔ کوئی بات ہے تو بتاؤ۔'' بغور اس کا چہرہ دیکھتے وہ پوچھ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کوئی بات ہے جو وہ بتانا بھی نہیں چاہتی اور چھپا بھی نہیں پا رہی۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فریش ہو جائیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' نظریں چرا کر کہتی وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

رات گئے ابا میاں نڈھال قدموں سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ حاجی صاحب حرکت قلب ہونے سے اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ نماز جنازہ صبح کو رکھی گئی۔ ارمان نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ ابا میاں نے زرتاج سے بھی افسوس کے لیے چلنے کو کہا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

''اپنی یاریاں، دوستیاں خود ہی بھگتائیں۔ مجھے اور بکھیڑے کیا کم ہیں۔''

''لیکن یہ تو ثواب کا کام ہے۔''

''آپ سمیٹ تو رہے ہیں دونوں ہاتھوں سے ثواب۔'' ان کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ ان کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

''ابا میاں! میں چلوں گی۔'' سچل اپنی چادر لینے کے لیے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

اور پھر ایک دن وہ بھونچال آ ہی گیا جس نے سچل کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ دینے والوں نے زرتاج بیگم کو بڑی پکی خبر دی تھی مع ثبوتوں کے، ابا میاں نے حاجی صاحب کی بیوہ بہن سے عقد ثانی کر رکھا تھا۔

زرتاج بیگم کے حواسوں پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ چلا چلا کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سجیلہ انہیں سنبھالنے میں بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ ارمان ہاتھ پیچھے باندھے مسلسل ٹہل رہا تھا۔ سچل کونے میں دبکی کھڑی تھی۔ شاہد ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر بیٹھا پاؤں ہلاتا اس ساری سچوئشن کا جیسے مزہ لے رہا تھا۔

''ابا میاں! کیا واقعی یہ بات سچ ہے؟'' ارمان نے ٹہلنا بند کر دیا تھا۔

''ہاں۔'' ابا میاں نے سکون سے جواب دیا۔ ارمان بے دم سا صوفے پر ڈھے گیا۔

''ارے میں کہتی ہوں اپنی اس سفید داڑھی کی ہی کچھ لاج رکھ لیتے۔'' زرتاج بیگم کی آواز پھٹی پڑ رہی تھی۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ ایک بیوہ کو اپنا نام اور سہارا دیا ہے۔''

''دوستی کی آڑ میں نجانے کب سے رنگ رلیاں منا رہے تھے اور وہ بھی ایسے بے غیرت کہ.....''

''زبان سنبھال کر بات کرو زرتاج بیگم! میں اپنے مرحوم دوست کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی صاعقہ بیگم کے خلاف آپ کی کوئی فضول بات سنوں گا۔''

''شرم تو نہیں آ رہی جوان شادی شدہ بچوں کے سامنے اپنے معاشقے کا پرچار کرتے ہوئے۔ میرا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی کچھ خیال کر لیتے، کیا منہ دکھائیں گے یہ دنیا والوں کو؟'' سجیلہ رونے لگی تھی۔ ارمان نے بہت ضبط سے پوچھا۔

''ابا! آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''بیٹا! کیا واقعی تم نہیں جانتے میں نے ایسا کیوں کیا؟'' دکھ سے اپنے بیٹے اور بیٹے کی شکوہ کناں آنکھوں میں جھانکتے وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

☆☆☆

حاجی صاحب نے اپنی زندگی میں ہی بیوہ بہن کو گھر میں حصہ نکال کر الگ سے پورشن بنوا دیا تھا۔ صاعقہ بیگم کی کوئی اولاد نہیں تھی جو بڑھاپے میں ان کا سہارا بنتی۔ اور اکیلی عورت کا اس معاشرے میں رہنا کس قدر مشکل تھا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

حاجی صاحب کی اپنی اولاد اپنی زندگی میں مگن تھی۔ انہیں خوف تھا کہ ان کے آنکھیں بند کرتے ہی ان کی بیوہ بہن کے لیے زندگی تنگ ہو جائے گی۔ جمیل صاحب کے سامنے کئی بار باتوں باتوں میں وہ اسی فکر میں ڈوب جاتے۔ ایک دن اپنی ٹوٹی پھوٹی ازدواجی زندگی کے ہاتھوں زخم خوردہ جمیل صاحب نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ صاعقہ بیگم سے عقد ثانی کرنے کا فیصلہ۔ جوان کی ہم عمر تو نہیں البتہ بہت باشعور دھیمے مزاج کی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔

اس ''انتہائی فیصلے'' کی پاداش میں زرتاج بیگم نے ان دنوں ان کا جینا مزید اجیرن کر دیا تھا۔ سجیلہ خفا تھی اور ارمان چپ..... سچل خاموشی سے گھر کے کام کیے جاتی۔ شاہد کی جسارتیں اور بے باکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ سچل کو لگتا کسی دن اس کا ضبط جواب دے جائے گا۔ لیکن وہ خاموش تھی کہ گھر کا ماحول مزید کسی تماشے کا متحمل نہیں تھا۔

''آپ کو اتنا بڑا اقدام اٹھانے سے پہلے گھر میں کسی کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔'' شام کے وقت ابا میاں اپنے کمرے میں ریوالنگ چیئر پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے جب سچل ان کے لیے چائے لے کر آئی۔ چائے تپائی پر رکھ کر وہ ان کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میرے اپنے بچے مجھے سمجھ نہیں پائے۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو خوامخواہ بیوی پر رعب جھاڑنے کے لیے اس کی تذلیل کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی مردانگی کا پرچم سربلند رہے۔ میرے نزدیک مرد اور عورت یکساں عزت کے حامل ہیں۔ لیکن زرتاج بیگم نے شروع دن سے جو رویہ اختیار کیا اس نے مجھے ہر گزرتے دن شدید اذیت سے دوچار کیا۔

میاں بیوی تو دکھ سکھ کے ساجھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا لباس، ایک دوسرے کی عزت، لیکن زرتاج بیگم نے ہمیشہ مجھے خود سے کم تر سمجھا۔ میرے ہر فیصلے، ہر خواہش، ہر رائے کو مسترد کیا۔ ہمیشہ مجھ پر حاوی رہنے کے لیے دوسروں کے سامنے میری ذات، میری کمزوریوں کو نشانہ بنایا۔ دونوں بچے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھتے اپنے آپ میں مگن ہو گئے۔ ان کی فیملی، ان کے مسائل، ان کی فیوچر پلاننگ..... میں اپنی اس ٹوٹی ہوئی، ادھوری زندگی کا بوجھ اکیلے اٹھائے اٹھائے تھک گیا تھا۔ مجھے بھی تو کوئی ایسا ساتھی درکار تھا جو میرے دکھ سنے، میری خوشیوں میں خوش ہو، میری فکر کرے، مجھے عزت اور اپنائیت کا احساس دے۔ تمہیں کیا لگتا ہے صاعقہ بیگم سے شادی کے پیچھے میری کوئی تسکین کی غرض چھپی ہوئی ہے۔ نہیں..... ہرگز نہیں..... میں نے اپنے دوست کا درد، اس کی فکر بانٹی، اور..... میں اس ادھورے پن سے تھک گیا تھا۔''

بولتے بولتے انہوں نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔ چائے پر سیاہی جم گئی تھی۔

سچل لب کھنچے لگی۔ زرتاج بیگم، جمیل صاحب پر دباؤ ڈالنے، انہیں صاعقہ بیگم کو طلاق دینے کی بات کرنے کی غرض سے بجیلہ اور ارمان کو ساتھ لیے ان کے کمرے کی طرف آئی تھیں۔ ادھ کھلے دروازے کے باہر وہ تینوں نفوس ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح ارمان کو ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا۔ وہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ ابا میاں بھی حاجی صاحب کے ہاں جانے کے لیے صبح سویرے گھر سے چلے گئے تھے۔ سچل کو بے وقت سونے کی عادت نہیں تھی۔ لیکن ارات بھر ابا میاں کی باتیں اسے کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتی رہیں۔ کروٹیں تو رات ارمان بھی بدلتا رہا تھا نجانے کیوں؟ سچل نے سوچا۔ اس وقت نجانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اٹھی تو یاد آیا آج بجیلہ نے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور اسے اپنا ایک سوٹ استری کرنے کے لیے دیا تھا۔ سچل جلدی سے استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔ بجیلہ کا سوٹ استری کر کے اس کے کمرے میں آ گئی۔

واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ سچل نے الماری کھول کر سوٹ اندر لٹکا دیا۔ اور جیسے ہی پلٹی واش روم کا دروازہ کھول کر شاہد باہر نکلا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر پر بنیان پہنے۔ تولیے سے گیلے بال رگڑتا۔ سچل بری طرح گڑبڑائی۔

''ارے زہے نصیب، کمرے تک آ گئی ہیں تو اندر بھی آ جائیں۔'' تولیہ بیڈ پر پھینکتا وہ پرجوش سا اس کی طرف بڑھا تھا۔ سچل کے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے اپنی سنگین غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ باہر نکلتی شاہد نے آگے بڑھ کر اس کے باہر جانے کی راہ مسدود کر دی۔ سچل آہستگی سے پیچھے ہٹی دیوار سے لگ گئی۔

''راستہ چھوڑو میرا۔''

''راستے میں تو آپ خود آئی ہیں۔ بھابھی!'' وہ خباثت سے مسکرایا۔ سچل سے سر اوپر اٹھانا دشوار

ہو گیا۔

''آگے سے ہٹ جاؤ، مجھے باہر جانا ہے۔''

ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر بمشکل قابو پاتی وہ بظاہر مضبوطی بنی لہہ رہی تھی۔ جبکہ اندر سے دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے چٹان بنا کر کھڑا تھا۔ پل نے شدت سے اللہ کو مدد کے لیے پکارا۔

تب ہی دروازہ کھول کر سجیلہ اندر داخل ہوئی تھی۔ سامنے کے منظر نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ شاہد فوراً پلٹا۔

''توبہ توبہ..... کیا زمانہ آ گیا ہے.....'' کانوں کی لوئیں چھوتا وہ سجیلہ کی طرف بڑھا۔ جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے منہ پر ہاتھ رکھے ابھی تک ششدر کھڑی تھی۔

آوازیں سن کر زرتاج بیگم بھی وہیں آ گئی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اندر کی صورت حال نے انہیں بھونچکا کر رکھ دیا تھا۔ پل شل اعصاب کے ساتھ شاہد کو فراٹے سے جھوٹ بولتا سنتی رہی۔ تہمت، کردار کشی، الزام تراشی.....

''یہ..... یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔''

''اچھا؟ اگر یہ سب جھوٹ ہے تو پھر بتائیں نا ان کو جب آپ کو پتہ تھا سجیلہ اور خالہ جی گھر پر نہیں ہیں تو پھر اکیلے نامحرم کے کمرے میں کیا کرنے آئی تھیں؟ اوپر سے واش روم کا دروازہ بجا کر مجھے جلدی سے باہر آنے کو کہا.....'' پل نے ایک بے بسی بھری نظر سجیلہ اور زرتاج خالہ کے فق ہوتے چہروں پر ڈالی تھی اور مرے مرے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

شاہد اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ سجیلہ کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''ہم اب اس گھر میں نہیں رہیں گے۔''

شاید ایک دم چپ ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر سر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیسی بے وقوفوں والی باتیں کر رہی ہو؟ یہ گھر ہمارا ابھی ہے۔ بجائے اس بدکردار عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکالنے کے تم میدان چھوڑ کر جانے کی بات کر رہی ہو۔''

''میں نے کہا نا میں اب اس گھر میں مزید ایک منٹ بھی نہیں رکوں گی۔'' سجیلہ کا فیصلہ کن انداز شاہد کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ زرتاج بیگم صوفے پر ڈھے سی گئیں۔

''تو اور کہاں جاؤ گی؟''

''مجھے نہیں پتا۔ اپنے گھر لے چلیں۔ کسی کرائے کے گھر میں یا پھر جہنم میں، لیکن میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔''

''خالہ جی! آپ ہی اسے سمجھائیں ہم کیسے اس گھر میں واپس جا سکتے ہیں جہاں سے ہمیں اتنا بے عزت کر کے نکالا گیا ہے۔''

''انہیں مسئلہ مجھ سے نہیں آپ کی بے روزگاری سے تھا۔ ارمان نے مجھے کل ہی آپ کی ایک جاب کا بندوبست ہو جانے کا بتایا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کی جاب کا سن کر آپ کے گھر والوں کا رویہ بدل جائے گا۔ نہ بھی بدلا تو ایک چھوٹا سا کرائے کا گھر تو ہم افورڈ کر ہی سکتے ہیں۔''

سجیلہ نے جیسے سب کچھ ایک دم سے طے کر لیا تھا۔

''میں سامان باندھتی ہوں۔ تب تک آپ کسی ٹیکسی کا بندوبست کریں۔''

شاہد مٹھیاں بھینچتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''یہ سب کیا تھا سجیلہ؟'' زرتاج بیگم جیسے ابھی تک شاک میں تھیں۔ سجیلہ اٹھ کر اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

''کیا تمہیں واقعی لگتا ہے جو کچھ شاہد نے کہا ہے وہ سچ ہے؟ پل نے.....''

''خدا کے لیے اماں! اس بے قصور پر انگلی اٹھانے کا سوچیے گا بھی مت۔ یہ اس کی شرافت تھی جو وہ اتنے دنوں سے چپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ ورنہ آپ کے داماد کی اصلیت تو پہلے ہی

مجھ پر کھل گئی تھی۔''

''تو تم نے گریبان کیوں نہیں پکڑا اس نامراد کا؟'' زرتاج بیگم تو گویا جلتے توے پر جا بیٹھی تھیں۔

''کیا مل جاتا مجھے اس کا گریبان پکڑ کر؟ محض ذلت، رسوائی اور طلاق کا دھبہ۔ میں نے اس کا نہیں اپنا بھرم رکھا ہے۔ کیونکہ ہاتھ تو آپ باندھ ہی چکی ہیں۔'' دونوں ہتھیلیوں سے سرخ آنکھیں رگڑتی وہ دکھ سے بول رہی تھی۔ ''آپ ذمہ دار ہیں اس سب کی۔ آپ نے میری زندگی برباد کر ڈالی ہے اماں۔''

زرتاج بیگم بے یقین نظروں سے اسے دیکھے گئیں۔ جو روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ابا اس وقت ایک باپ کی حیثیت سے میرے رشتے کے بارے میں اچھی طرح چھان بھٹک کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کی بے جا انا نے یہ گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے شاہد کو یہاں ٹھہرانے پر اعتراض کیا تب بھی آپ نے ان کی ایک نہ سنی، شاید انہیں میرے ان حالات کا پہلے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا جس سے میں اب گزر رہی ہوں۔ میرے لیے ایک بے روزگار، غیر مستقل مزاج شخص کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو رہا تھا تو اب ایک بے وفا، بدکردار انسان کے ساتھ رہنا کس قدر مشکل ہوگا؟ آپ نے ہمیشہ اپنی جھوٹی انا، بے جا ضد کا پرچم بلند کیے رکھا۔ عمر بھر اپنی ''میں'' کے حصار میں مقید رہیں۔ آپ کی اسی ''میں'' نے ابا کو آپ سے اس گھر سے ہر چیز سے متنفر کر دیا۔

ارمان کی نجانے کون سی نیکی اللہ کو پسند آ گئی کہ اس نے سچل جیسی لڑکی کا ساتھ اس کے نصیب میں لکھ دیا۔ ورنہ اگر آپ اسے بھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیتیں تو اس وقت وہ بھی میرے اور ابا کی طرح ادھوری زندگی کا کشکول ہاتھ میں تھامے کسی دوراہے پر کھڑا ہوتا۔''

زرتاج بیگم بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئیں۔ یہ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ ان کا دل چاہا سجیلہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں۔ یا پھر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن ایسا کرنے سے کیا حقیقت بدل جائے گی جو آج شفاف آئینے کی مانند ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو روتا بلکتا دیکھتی رہیں۔

باہر ٹیکسی کا ہارن بج رہا تھا۔

سجیلہ خود کو سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے سے پہلے وہ سچل کے کمرے میں آئی تھی۔ جو کھڑکی میں مضطرب سی کھڑی تھی۔ آہٹ پر فوراً پلٹی۔

''سجیلہ! کیا تمہیں لگتا ہے میں قصوروار ہوں؟'' شدت غم سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

''کیوں جا رہی ہو تم یہاں سے؟''

''میرے دل میں تمہارے لیے کوئی ملال نہیں ہے سچل! بس سمجھ لو خود کو بڑے نقصان سے بچانے کے لیے اپنا چھوٹا نقصان کر رہی ہوں۔ ہو سکے تو میرے لیے دعا کرنا۔'' سچل روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

زرتاج بیگم پر آج کی رات بہت بھاری تھی۔ بستر پر جیسے کانٹے سے اگ آئے تھے۔ کسی طور چین نہیں مل رہا تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک ہار کر بستر سے اٹھ کر کھلی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ ادھورے اداس چاند نے انہیں دیکھ کر بادلوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ مدھم ستارے نظریں چراتے بجھنے لگے۔ ہوا کی شوریدہ سری بڑھی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ زور سے آپس میں ٹکرائے تھے۔ پٹ بند کر کے وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئیں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح۔

''میں اپنی ٹوٹی پھوٹی ادھوری زندگی کا بوجھ اکیلے اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔ مجھے بھی تو کوئی ایسا ساتھی درکار ہے جو میرے دکھ سکھ سنے، میری خوشیوں پر خوش ہوں، میری فکر کرے، مجھے عزت اور اپنائیت کا احساس دے۔''

''آپ نے میری زندگی برباد کر ڈالی ہے اماں!'' ان کا دل کٹنے لگا تھا۔

''سچل آپ کی بھانجی ہے۔ ادب اور لحاظ میں خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن کب تک؟ ایک دن اس کا

ضبط بھی جواب دے جائے گا۔ کیا آپ کے اندر اتنا حوصلہ ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو خود سے دور جاتا دیکھ سکیں؟ پرندے اڑ جائیں تو تنکے سے بنے آشیانے کو بکھرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔'' تو ثابت ہوا زرتاج بیگم! تم نہ اچھی بیوی بن سکیں نہ اچھی ماں، اپنی جھوٹی انا کے پودے کو سراب کرتے کرتے خود سے جڑے رشتوں کو تشنہ کرتی رہیں انہیں اندر سے کھوکھلا کرتی رہیں۔ اور اگر جڑیں ہی کھوکھلی ہوجائیں تو پودا کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟ ان کے دل کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ سارے گزرے مناظر آج ایک نئے مفہوم کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے ابھرتے۔

رات آہستہ آہستہ بھیگتی رہی۔ ان کے دل پر گرم، نمکین قطرے گرتے رہے۔ اور وہ موم کی مانند پگھلتی رہیں۔

رات بھر برسنے والے بادلوں کا سینہ چیر کر صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تھی۔ تاریکی چھٹی اور برسوں سے آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا بھی۔ صبح کے پاکیزہ اجالے میں انہوں نے چپکے سے خود سے ایک عہد کیا۔

☆☆☆

ارمان صبح ہی گھر پہنچا تھا۔ فریش ہونے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پر آبیٹھا۔ سچل کا ستا ہوا چہرہ، متورم آنکھیں دیکھ کر چونکا۔ سجیلہ کی غیر موجودگی نے بھی ٹھٹکایا تھا۔ ماں کا چہرہ بھی آج ایک نئی کہانی سنا رہا تھا۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟ سجیلہ کہاں ہے؟''

سچل کا دل زور سے دھڑکا۔ ایک بار پھر وہی تماشا لگے گا۔ وہی ذلت، وہی الزام تراشیاں اور ارمان نجانے کا فیصلہ کرے۔ اسے اپنے ہاتھ ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔

''اس کے شوہر کی نوکری کا بندوبست ہوا تو اس نے واپس اپنے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔'' سچل نے چونک کر زرتاج خالہ کو دیکھا تھا۔ اسے لگا شاید اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جبکہ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''اچھا ہے اس کے میاں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ بیٹیوں کا اصل گھر ان کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ ہماری رونق تو ہمارے گھر میں موجود ہے۔'' سچل کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ ''تو صبر رائیگاں نہیں گیا۔''

''ایا میاں! ناشتہ نہیں کریں گے کیا؟'' ارمان نے پوچھا تھا۔

''میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔'' سچل فوراً اٹھی تھی۔ زرتاج بیگم نے اسے روک دیا۔ ''تم بیٹھو میں جا کر دیکھتی ہوں انہیں؟'' ناشتے کے لوازمات ٹرے میں سجائے وہ جمیل صاحب کے کمرے کی طرف چل دیں۔ ارمان اور سچل ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھے۔

''طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' آنکھوں پر بازو رکھے وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ آواز پر فوراً بازو آنکھوں سے ہٹایا تھا۔ اور اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ زرتاج بیگم نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے رکھی۔

''ایسی نظروں سے مت دیکھیں جمیل صاحب! کہ میں خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہوں۔'' ان کا لہجہ ندامت سے چور تھا۔ ''اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے میں جو کچھ کھو چکی ہوں وہ تو واپس لانے پر قادر نہیں لیکن جو کچھ بچ گیا ہے اسے کھونے کا حوصلہ میرے اندر نہیں ہے۔'' وہ نفی میں تھیں۔ جمیل صاحب کو ان کی مسکراہٹ پر رونے کا گمان ہوا۔

''آج آپ حاجی صاحب کے ہاں نہیں جائیں گے؟''

''کیوں؟''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

''افسوس کرنے کے لیے؟''

''نہیں، صاعقہ بیگم کو اپنے گھر لانے کے لیے۔'' ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ وہ مضبوط لہجے میں بولی تھیں۔ جمیل صاحب آسودگی سے مسکرا دیے۔

☆☆

شمیم رانی

''آپ شادی کرلیں ایاز!''

''یہ اچانک تمہیں کیا سوجھا سلمیٰ! میں نے تمہیں کہا تھا کہ ذہن روشن رکھو۔ الٹے سیدھے خیالات سے بچی رہوگی۔'' ایاز نے سنجیدگی سے مجھے سمجھایا۔

''ایسی لغویات ذہن سے نکال دو۔ صحت مندانہ انداز سے سوچنا شروع کرو۔ اگر آئندہ ایسی بات کی تو میں ناراض ہوجاؤں گا۔'' ایاز مجھ پر برہم ہوئے مگر دل میں ویرانی نے راج کرلیا تھا۔

میں شکستہ قدموں سے کچن کی طرف چل دی۔ زندگی سسک سسک کر ہولے ہولے رواں دواں تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ مکمل شان وشوکت تھی۔ مگر اللہ نے اتنی بڑی کمی پیدا کردی تھی، جس کا بھرنا مجھے مشکل لگ رہا تھا۔ دس سال شادی کو ہوچکے تھے۔ نیلم تھی تو گھر میں کافی رونق تھی۔ نیلم میری نند تھی مگر میں نے اسے ماں کی طرح پالا تھا۔ میرے آنے سے پہلے ایاز کے امی ابو ایک کار حادثے میں موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس وقت نیلم کی عمر دس سال تھی۔ میں نے اسے ماں کا پیار دیا۔ اس کی شادی کے بعد تو آنگن کا سونا پن من کی فصیل میں دراڑیں ڈالتا چلا گیا۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر میں نے ایاز کو شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

خدیجہ ایاز کی دور پار کی رشتے دار تھی۔ اچھی خوب صورت لڑکی تھی۔ عمر بیس سال ہوگی۔ کتنی ہی دفعہ دل خون کے آنسو رویا، من کی چبھن اذیت ناک ہوئی۔ اپنی گھر گرہستی، اپنے چاہنے والے میاں کے ساتھ کسی اور کا نام اور رشتہ منسلک کرنا مجھے پل صراط سے گزرنا لگا۔

آخر میں پل صراط سے گزر ہی گئی۔ ایک ننھی قلقاری اور معصوم ہنسی کے لیے مجھے اپنا دل مارنا پڑا۔ ایاز میرے متوالے تھے۔ میں بھی ایاز کی پوجا کرتی تھی مگر میں نہیں چاہتی تھی ایاز کا نام لیوا اس دنیا میں آنکھ نہ کھولے۔

میں نے ایاز کو اپنی کل کائنات جانا تھا۔ یہی سوچ کر خدیجہ کو ایاز کی زوجیت میں دیا۔

چند مہمان جو تھے کھانے کے بعد چلے گئے۔ خدیجہ کو ایاز کی خواب گاہ میں پہنچادیا گیا۔

میری روح بے چین ہورہی تھی۔ کمال کا ضبط میں نے اپنے اوپر طاری کر رکھا تھا۔ آنکھیں بے رونق تھیں۔ چہرے کی رونق کہیں کھوگئی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں، کوئی اشک، کوئی آنسو چہرے کو نم نہیں کررہا تھا۔

''میں تمہارے پاس رہوں گا۔ یہ تم نے کیا کردیا سلمیٰ!'' ایاز خدیجہ کے بجائے میرے پاس آئے۔

''نہیں، یہ گناہ ہے۔ خدیجہ آپ کی بیوی ہے۔ آپ اس کے پاس جائیں۔ وہ آپ کا انتظار کررہی ہوگی۔'' میں نے ایاز کو سمجھایا۔

''مجھے کس امتحان میں ڈال دیا تم نے؟'' ایاز نے کہا۔

''آپ نہیں جانتے کہ میرا یہ قدم آپ کی ذات کے ساتھ انمٹ پیار کی نشانی ہے۔'' وہ ٹوٹے

قدموں سے اپنے کمرے میں چل دیے اور میں بیڈ پر اٹھے گئی۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے جلدی کرم نوازی کردی۔ خدیجہ جلد ہی امید سے ہوگئی۔ گھر کے در و دیوار جیسے جی اٹھے۔ میں خوش تھی کہ اب میرا محبوب شوہر بے نام نہ رہے گا۔ خدیجہ بہت خوش تھی۔ میں نے اسے اپنے گھر کی عزت بنایا۔ ایاز کا نام اس کے نام کے ساتھ جوڑا تھا۔ اسے اپنے برابر بٹھایا تھا۔ اس کی حق تلفی نہ ہونے دی۔ اسے ایک عظیم مقام دلایا۔ خوشی مجھ سے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ ایک ننھا فرشتہ اس گھر میں آرہا ہے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ آخر وہ دن آ گیا جب خدیجہ ماں بن گئی۔ میں نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔ لوگ میرے صبر اور ضبط پر حیران تھے اور میں بھی۔ خدیجہ گھر لوٹی تو ننھا سا پھول میری گود میں تھا۔ گھر

معطر ہوگیا۔ گھر کی ویرانی دم توڑ گئی۔ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایاز، خدیجہ، میرے اور ننھے عمر کے خوب لاڈ اٹھاتے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے۔ مرے لیے ان کے دل میں بے انتہا احترام تھا کیونکہ میں نے ان کے لیے قربانی جو دی تھی اور میرے صبر پر بھی ایاز حیران تھے۔

رات کو میں گریہ ایوب کرتی اور صبح صبر یعقوب۔ یہ سب کچھ میں نے اپنے محبوب شوہر ایاز کے لیے کیا تھا۔ میں ایاز کا بجھا ہوا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے لیے دکھ چن لیے اور سارے سکھ ایاز کو دے دیے۔ گھر میں ملازمین تھے مگر میں نے خدیجہ اور بچے کی دیکھ بھال کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ عمر کی ایک ایک حرکت مجھے شاد رکھتی۔ ننھا عمر تین سال کا ہوگیا۔ میرا سارا دن عمر کے ساتھ گزر جاتا۔

ایاز میرے حوصلے اور ظرف کے قائل تھے۔ زندگی میں بڑے بڑے ظالم لمحات آئے مگر میں نے برداشت کا دامن نہیں چھوڑا۔ خدیجہ دوبارہ امید سے ہوگئی۔ میں خدیجہ کو جوسز اور فروٹ کھلاتی، وقت پر دوائیاں دیتی۔ ہر پندرہ دن بعد چیک اپ کے لیے لے جاتی۔

خدیجہ مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی۔ اپنے بیٹے عمر کو میرے پاس آنے سے روک لیتی مگر میں نے برداشت کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایاز خدیجہ کو ڈانٹیں۔ صبر کی گٹھڑی بہت بھاری تھی جو میں نے اپنے سر پر اٹھا رکھی تھی۔

رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ میں خدیجہ کے بیڈ روم میں اسے دوائیاں اور دودھ دینے گئی۔ میں نے دوائیاں اور دودھ ٹرے میں رکھا اور خدیجہ کے کمرے کی طرف چل دی۔ اندر خدیجہ ایاز کے ساتھ تلخ کلامی کر رہی تھی۔ میرے قدم دہلیز پر رک گئے۔

''میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں، ایک لمحہ سکون سے نہیں گزرا۔ مجھے آپی سلمٰی سے سخت نفرت ہے۔ یہ میری سوتن ہے۔ میں اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ اسے طلاق دے دو۔ یہ میری ایڑی کا کانٹا ہے، اسے میرے پاؤں سے نکال دو اور ویسے بھی تمہاری جائداد میں اس کا حصہ بھی بنتا ہے۔ اگر تم اسے طلاق دو گے تو یہ حصہ بھی ہمارے بچوں کے کام آئے گا۔''

وہ میرے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ آج میرا کڑا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ بلکہ چکنا چور ہوگیا۔

''سلمٰی نے میرے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔'' ایاز نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر تم سلمٰی آپی کو طلاق نہیں دے رہے تو میں بچے لے کر میکے چلی جاؤں گی۔ تمہیں اور سلمٰی کو گھر مبارک۔ پھر میں تم سے طلاق لے لوں گی۔ بچے میرے ہیں، میرے ہی رہیں گے۔ تم بچوں کو دیکھنے کے لیے ترستے رہو گے۔

''میں تمہاری تجویز پر غور کروں گا۔'' ایاز نے خدیجہ کو تسلی دی۔

دوائیاں اور دودھ کا گلاس میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ برتن گرنے کی آواز سن کر ایاز باہر آئے تو میں گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ایاز اور خدیجہ کو میرے بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔ چند دنوں بعد خدیجہ پھر زہر اگلنے لگی۔

''تم مجھ سے اور ننھے عمر سے محبت نہیں کرتیں۔ تمہارا بھائی اور بھابھی تمہیں گھر گھسنے نہیں دیں گے۔ اس لیے تم میری خدمت میں لگی رہتی ہو۔'' یہ خدیجہ کے الفاظ تھے۔

''تم نے اس گھر پر راج کیا، مگر اب یہ گھر میرا ہے۔ میرے بچوں کا ہے۔'' خدیجہ منہ سے شعلے اگل رہی تھی۔

''خدیجہ! جو درخت پھل نہیں دیتا، کم از کم سایہ تو دیتا ہے۔'' میں نے ٹوٹے دل کے ساتھ کہا۔ ایاز

خدیجہ کی زہریلی گفتگو سن رہے تھے مگر خاموش تھے۔ وہ بچوں کی جدائی سے ڈر گئے تھے۔ ایاز کو ڈر تھا کہ کہیں خدیجہ بچے لے کر میکے نہ چلی جائے۔ جب میں نے دیکھا کہ ایاز خاموش ہیں تو میں نے چادر اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

میرے محبوب شوہر نے مجھے نہیں روکا۔ دریا محبتوں کے جو بہتے تھے، تھم گئے۔ میں میکے آ گئی۔ بھائی، بھابھی اور بچوں نے میرا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ سکینہ بہت سا پیسہ اور تحائف لے کر آئی ہوگی۔ پیسے ہمیں دے گی اور پھر گھر چلی جائے گی۔ مگر جب میں نے اپنی داستان حسرت بیان کی تو بچوں اور بھابھی کے چہرے کے رنگ اڑ گئے۔

وقت تیزی سے اڑنے لگا۔ مجھے یاد ہے میری سولہ سالہ بھتیجی نے مجھے کہا۔

''تم ہم پر ایٹم بم بن کر گری ہو۔ کس نے کہا تھا اتنی نیک پروین بن جاؤ اور سوتن لے آؤ۔''

بس اسی چند جملوں سے میکے میں میرے مقام کا اندازہ لیں۔

میں ملکہ کی طرح اپنے گھر اور ایاز کے دل پر حکومت کرتی رہی تھی۔ ایک فیکٹری میں کام کرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے ایاز کو ایک اور بیٹا دیا۔ بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ بہت خوشیاں منائی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے گھر کا وارث جو دیا تھا۔ ساتھ ہی اس پر سونے چاندی کے سکوں کی بارش بھی ہونے لگی۔ میں اسے کیسے یاد آتی، اس نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ میں دل شکن گھڑیاں میکے میں گزارنے لگی۔

☆☆☆

بیس سال گزر گئے۔ ایک دن میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ ایاز کے بڑے بیٹے نے خودکشی کر لی ہے۔ میں دھک سے رہ گئی۔ مجھے عمر کے مرنے کا سخت رنج ہوا۔ چار سال میں نے اسے پالا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔

میں نے فیکٹری کے بجائے ایاز کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بھائی کو کچھ نہ بتایا۔ میں ایاز اور خدیجہ کے گھر پہنچ گئی۔ لوگوں کا سمندر گھر کے باہر جمع تھا۔ جیسے قیامت آ گئی ہو۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ عمر اپنی پسند سے ایک طوائف سے شادی کرنا چاہتا تھا، بہت سی جائداد طوائف کی اداؤں پر لٹا چکا تھا۔ آج کل ایک پلاٹ فروخت کرنے کے چکر میں تھا۔ باپ نے منع کیا تو جذباتی ہو کر خود کو گولی مار لی۔ دوسرا بیٹا بھی لٹ گیا ہے۔ خدیجہ بے چاری بہت دکھی عورت ہے۔ جب ہم کسی مسکین، بے بس کو تنگ کر رہے ہوتے ہیں تو اصل میں ہم اپنے بچوں کے لیے دکھ اکٹھے کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے گناہوں کی سزا ہمارے بچوں کو ملتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔

عمر کی تدفین ہو چکی تھی۔ میں نے چہرے کو چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ خدیجہ کو میں نے بیس سال بعد دیکھا۔ رنج الم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ میں خدیجہ کے پاس گئی، منہ سے چادر کا پلو ہٹایا۔ خدیجہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''خدیجہ! مجھے گھر سے نکال کر تمہیں کیا ملا؟'' میں نے ہجوم کے سامنے کہہ دیا۔ ''تم نے میرے شوہر کے دل میں سیندھ لگائی اور میری ہنستی بستی زندگی پر شب خون مارا۔ کیا ملا تمہیں؟'' خدیجہ نے لب سی لیے تھے۔

میں اٹھ کر مردوں والے ٹینٹ کی جانب بڑھی۔ بیس سال کے بعد میں نے ایاز کو دیکھا۔ ایاز بہت کمزور ہو گیا تھا۔ خوب صورت آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے۔ میں ایاز کی جانب بڑھی۔ چہرے سے پردہ ہٹایا۔ ایاز مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

''مجھے گھر سے نکال کر تمہیں کیا ملا ایاز؟ کہاں گئی اولاد؟ کہاں ہے گھر کا وارث؟''

☆☆

نسیم سحر قریشی

عذاب سراب گلاب

مکمل ناول

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ پر اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے چارپائی پر وہ گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔

"ہونہہ!" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے پیر پٹخا۔

"کل تک میرے سامنے سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی تھی، آج دلہن بن کر بیٹھ گئی ہے جیسے میں تو اس کی صورت کو ترس رہا ہوں۔"

"اتارو یہ گھونگٹ ونگٹ۔ کیا چکر بازی ہے۔ نفرت ہے مجھے تم سے، نفرت ہے۔ تم تو زبردستی میرے سر منڈھی گئی ہو۔ میرے گلے کا کانٹوں بھرا ہار ہو۔ تمہاری اذیت سہنا بھی مشکل ہے اور تمہیں گلے سے اتار پھینکنا بھی مشکل ہے۔ میرے ساتھ یہ نخرے بازی نہیں چلے گی۔ سیدھے سبھاؤ یہ لہو رنگ کپڑے اتار کر کوئی اپنی شکل سے میل کھاتے کپڑے پہنو اور سو جاؤ۔"

وہ آگے بڑھا۔ اس نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

"شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟ ڈائن ہو ڈائن۔ تم نے میری آرزوؤں کو نگل لیا ہے۔ اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں میری مسرتوں اور خوشیوں کے سینے میں۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں جا رہا ہوں..... لیکن خبردار جو تم نے کسی کو میرے بارے میں کچھ بتایا۔ یا منہ بنا کے ماں کو دکھایا۔ انجام جانتی ہو کیا ہوگا۔ بھائی کی طرح کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں پکڑا کے گھر کی دہلیز پار کرا دوں گا۔ سمجھیں۔"

اس نے سختی سے پکڑے بال چھوڑ دیے اور باہر کھلنے والی کھڑکی کھول کر گلی میں کود گیا۔ اسے پل سے قبل کوچہ جاناں پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔ دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا تھا، بڑا شرمندہ تھا۔ احساس جرم سے زیر بار جھکی جھکی نظریں لیے اس کے سامنے تھا۔

وہ سوگوار سی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ زرد لباس۔ میک اپ سے عاری چہرہ۔ بکھرے بال۔ متورم آنکھیں۔

وہ قریب جا کے رک گیا۔

میں آ گیا ہوں۔ تمہارے بنا ایک پل نہیں گزار

سکتا۔ میں کسی عذاب میں مبتلا تھا۔ یقین کرو زیب.....! میں نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی۔ وہاں رکا ہی نہیں۔ ایک رسم دنیا نبھانا تھی۔ وہ بھی نہ نباہ سکا۔ لوٹ آیا ہوں..... میں، میں..... زیب! تم خاموش ہو۔ خدا کے لیے کوئی بات کرو۔ مجھے سہارا دو۔ تمہاری ذات میرا سکون ہے۔ اپنے خوب صورت الفاظ کو میرے زخموں کا علاج بنادو۔''

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔

''زیب۔ خدا کے لیے میرا یہ جرم معاف کر دو۔ میں قسم کھاتا ہوں، پلٹ کے اسے نہ دیکھوں گا۔ دیکھو تم یقین کیوں نہیں کرتیں۔ میں ابھی تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ ابھی اسی وقت۔ تاکہ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جاؤ۔''

''بے وفائی تو ہو ہی گئی۔ تم نے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر ہی لیا۔ اب یہ تو عذر لنگ ہے۔ کیا خبر، آئندہ کیا ہو۔ تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔ کیا رویہ برتو۔''

''میرا دل چھلنی نہ کرو زیبی۔ مجھے چرکے نہ لگاؤ۔ میں..... میں تم سے بے وفائی کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ بے وفائی کیسے کر سکتا ہوں۔ تم نے مجھے اسیر کر رکھا ہے۔ اس حسن کی بھول بھلیوں سے نکلوں گا تو کسی اور کی طرف نظر کر سکوں گا۔ تم میری زندگی ہو، میری سانسوں کی آمد و رفت کی ضمانت ہو۔ جانتی ہو، میں یہ شادی نہ کرتا تو گھر میں بھونچال آ جاتا۔ بابا بڑے غصے کے تیز ہیں۔ میرا گلا گھونٹ دیتے۔ ماں خفا ہو جاتی۔ تم جانتی ہو نا۔ عطو میری خالہ زاد ہے۔ دراصل تمہیں اس ساری حقیقت کی خبر ہی نہیں ہے کہ تمہارا سلمان کس عذاب سے دوچار ہے۔''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ مجھے تمہارے پیار کی ضمانت چاہیے۔''

''ضمانت..... کہہ تو رہا ہوں، ابھی ہم چل کے شادی کر لیتے ہیں۔''

''شادی کیسے کر سکتے ہیں۔ سلمان! تم بھول رہے ہو۔ میں کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے والدین ہیں۔ بھائی ہیں۔، میرے والد اور بھائی جب تک غیر ملک سے واپس نہ آ جائیں۔ شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔''

سلمان خوش ہو گیا۔

''زیب..... زیبی محبت کرنے والے دکھ اور سکھ کے ساجھی ہوتے ہیں۔ اس کڑے وقت میں تم نے ساتھ چھوڑ دیا تو میرے درد کون بانٹے گا'' اس نے سلمان کا گریبان اپنے خوب صورت ہاتھوں میں جکڑ کے اسے جھنجھوڑا۔

''کیا محبت کرنے والے صرف قربانی کی خاطر ہوتے ہیں اور عیش کرنے کے لیے دوسرے لوگ۔''

''کیا مطلب؟''

''آج اس نے عروسی جوڑا پہنا ہوگا۔ سونے کے زیورات پہنے ہوں گے..... تم تو خوش ہوئے ہوگے۔ میرے لیے تو تم پچاس روپے سے زیادہ کی کوئی چیز بھی نہ لا سکے۔''

''زیب! تم تو پگلی ہو۔ اس سے پہلے میں کچھ کمانے کے لائق ہی کب تھا۔ ہر ماہ پانچ چھ سو روپے امی کو دے دیا کرتا تھا۔ باقی ماں کو..... تمہارے لیے کچھ کیسے لا سکتا تھا۔ قسم لے لو جو میں نے اس کے لیے ایک پائی کی کوئی بھی چیز خریدی ہو۔ جو بھی دیا ہوگا ماں نے دیا ہوگا۔ تم میرے دل کی ملکہ ہو۔ رانی ہو۔ میں تمہارے لیے خوب محنت کروں گا۔ دنیا کی ہر آسائش خریدنے کی کوشش کروں گا۔ تمہارے لیے خوب صورت گھر بناؤں گا۔''

''ہاں ہاں۔ مستقبل کے جھوٹے خواب دکھاؤ لیکن میرے لیے لانا کچھ بھی نہ۔''

''کک..... کیا..... کیا لاؤں تمہارے لیے؟ بولو؟ قسم سے آج جو بھی حکم کرو، پورا کروں گا۔ سعودیہ والے احسان بھائی نے رات دس ہزار روپے مجھے دیے تھے۔ ابھی بھی میری جیب میں ہیں۔ ان سے حساب ہوتا رہے گا۔ یہ تم لے لو۔ رکھ لو اپنے پاس، جو دل چاہے لے لینا۔ رہی احسان بھائی کی بات تو انہیں میں یہ رقم کسی نہ کسی طور لوٹا دوں گا۔'' زیب نے

آنسو پونچھ کر اٹھلاتے ہوئے کہا۔
''میں رکھ لوں اور تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جا کر بازار سے میرے لیے کچھ لے آؤ......''
''زیب......ایک فائدہ ہو گا اس شادی سے۔''
سلمان چہکا تو زیب نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔
''ہاں ہاں' اب میں تمہیں لے کر بازاروں میں پارکوں میں کہیں بھی گھومتا رہوں۔ لوگ یہی سمجھیں گے' بیوی ساتھ ہے اب کوئی ڈر نہیں رہا۔ اور...... اور......پھر ایک دن آخر تم بیوی بن ہی جاؤ گی۔''
وہ مسکرادی۔ کمرے میں کوئی داخل ہوا۔
''سلمان بیٹے۔ تم......!''
''جی امی۔ میں......کیسی ہیں آپ؟''
''تم کیسے ہو...... اور یہ...... شادی کی رات سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کیسے آ گئے؟''
سلمان چپ رہا۔ کتنی دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔
''امی! میں وہاں چین نہیں پا سکا۔ سو یہاں چلا آیا۔''
''خود کو تماشا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ آ جاتے کل کسی وقت۔''
''ہیں امی! میں وہاں رہ جاتا' زیب پریشان ہوتی۔ میں اسی لیے آ گیا۔''
''کس بات کے لیے پریشان ہوتی۔ یہ تو بالکل پاگل ہے۔ تم نے سب کچھ اپنی خوشی سے تو نہیں کیا پھر......وہ لڑکی اب تمہاری بیوی بن چکی ہے۔ بیٹے! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
سلمان سوچ میں پڑ گیا۔
''آپ نے ٹھیک کہا امی! میں جا رہا ہوں۔ زیب! یہ پیسے تم رکھ لو۔ کل ہم دونوں بازار چلیں گے اور خریداری کر آئیں گے۔''
''کم بخت! تجھے پتا نہیں تھا' آج رات سیٹھ کرمانی آنے والے ہیں' تو نے اس باپ کو بلالیا۔ ایسی یاری نبھانے کی ضرورت نہیں۔ اپنی حدود میں رہا کرو۔''
''میں تو حدود میں رہتی ہوں۔ وہ ہی دیوانہ ہے اور پھر میں نے کب بلایا تھا' خود ہی آ گیا۔ تو ہی تو

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل
300

چلمن

نادرہ خاتون
قیمت -/300 روپے

بڑی امی

نسیم سحر قریشی
قیمت -/400 روپے

دست کوزہ گر

فوزیہ یاسمین
قیمت -/750 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سمجھاتی ہے مجھے۔ آج تو مجھے زیادہ مشکل ہوئی' سخت قسم کی اداکاری کرنا پڑی۔ آنسو بہانا پڑے۔''

''اچھا اچھا۔ وہ پیسے کہاں ہیں؟'' امی کے لہجے میں بے زاری تھی۔

''میرے پاس ہیں۔''

''لاؤ مجھے دو۔ سیٹھ کرمانی آچکے ہیں۔ تحائف کے انبار کے ساتھ۔ اس کے کہہ دینا کہ میں امی کے ساتھ جا کر کپڑے خرید لائی ہوں۔ ہونہہ' دس ہزار روپے کی اہمیت ہی کیا ہے۔

سیٹھ صاحب کے لائے ہوئے زیوروں کا ایک ہلکا سا سیٹ اس سے کئی گنا زیادہ مالیت کا ہے۔ عشق کرنے چلا ہے لونڈا..... اور وہ بھی زیب النساء سے۔ اسے خبر نہیں، یہاں بڑے بڑے ناک رگڑتے نظر آتے ہیں۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے دریا میں قطرے جتنی۔ پھر آئے تو موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا طعن و تشنیع کا۔ پاگل کے بچے نے شاید پہلی بار کسی عورت کا منہ دیکھا ہے۔ جو کہو گی کرتا چلا جائے گا۔ شادی کا نام لے تو ہمیشہ کی طرح ٹال دیتا۔ کسی نہ کسی طور وقت گزرتا ہی چلا جائے گا۔''

وہ کمرے سے نکل گئی۔ زیب النساء نے باتھ روم کا رخ کیا۔

☆☆☆

رات سلمان کے لیے بہت بھاری تھی۔ گھر سے نکلا تھا' یہ رات زیب کی محبت کی چھاؤں میں گزارنے' لیکن اس کی امی نے وہاں رکنے نہیں دیا۔ سلمان ان کی سمجھ داری کا قائل ہوگیا۔ وہ تو پہلے بھی ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ ان کا حکم سر آنکھوں پر رکھتا تھا۔ انہوں نے کتنے مشفقانہ انداز میں اسے رات گھر پر بسر کرنے کا حکم دیا تھا۔

مگر آج وہ ان کا حکم نہ مان سکا۔

وہ گھر واپس کیسے جاتا..... جاتا تو رات اسی کمرے میں گزارنی پڑتی جہاں عطیہ موجود تھی۔

عطیہ..... جس کے وجود سے اسے سدا نفرت رہی تھی۔ جسے وہ ایک پل کے لیے برداشت نہیں کرتا تھا۔

اور آج بیوی کے روپ میں اس کے کمرے میں لا کر ڈال دیا گیا تھا۔

عطیہ سے اس کی شادی بھی قدرت کا ایک مذاق تھی۔

اور زیب جیسی حسین اور طرح دار لڑکی سے محبت ہوجانا ایک رنگین و سنگین حادثہ تھا۔ جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھا۔ پس رہا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ نہ فرض سے غافل رہ سکتا تھا' نہ محبت سے دست بردار ہوسکتا تھا۔ راہ فرار کوئی تھی نہیں۔ کیا کرتا؟ کہاں جاتا؟

سڑک پر چلتے چلتے اس نے جیب ٹٹولی۔ جیب میں دو تین سو روپے موجود تھے۔ اس نے خالی رکشہ روک کر اس سے انحمر ا ہوٹل چلنے کو کہا۔ ہوٹل کے کمرے میں تن تنہا بیٹھا وہ اپنے بارے میں' زیب کے بارے میں' عطو کے بارے میں..... اور وقت اور حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھنے لگی۔ مگر پہلی رات کی دلہن تھی۔ دلہن بھی کیسی' جس پر شرم و حیا کا بوجھ اس کے تن پر سجے زیورات کے بوجھ سے کہیں زیادہ تھا اور اسی شرم و حیا نے اس کا سر جھکا کر اسے بیٹھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ تو سلمان کی سخت کلامی پر آنسو بھی نہ بہا سکی تھی۔ اس کی شادی بھی کیا شادی تھی' بس فرض کی ادائی تھی۔ خالہ نے اسے سلمان کے کمرے میں منتقل کر کے فرض نبھا دیا تھا۔ عروسی جوڑے کے طور پر سلک کا چارگز کپڑا اس کے تن پر تھا۔ شلوار میں سرخ کاٹن کے بڑے سارے جوڑ کے ساتھ۔ دوپٹے پر زہرا بھابھی نے دو چار اشرفیاں ٹانک دی تھیں۔ زیور کے نام پر فدا بھابھی نے ایک پرانی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی تھی اور بس۔

بھلا سوکھی چرخ عطو کو کسی قیمتی شے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کا بدصورت چہرہ میک اپ سے اور بھی برا لگنے لگا تھا۔ عذرا اس کے سیاہ لبوں پر سرخی لگا کر خود ہی زیر لب مسکرانے لگی تھی۔ اس کے پاس تو آئینہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنی مضحکہ خیز نظر آنے والی صورت دیکھ

سکتی۔ ہاں ایک خوبی تھی۔ ایک حسن تھا اس کے پاس اور وہ تھے اس کے شب و بیجور کی مانند سیاہ اور لمبے بال۔ جن میں ڈھیروں ڈھیر تیل ڈال کر کس کے چوٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے جانے کب سوگئی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی' آوازوں پر اس کی آنکھ کھلی۔ خالہ اور زہرا بھابھی اس کے سامنے تھیں۔

''بی بنو! اب اٹھ بھی جاؤ۔''

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

''سلو کہاں ہے؟'' خالہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

''جی' پتا نہیں۔ کہاں ہیں۔''

''تو تو چین کی نیند سو رہی تھی' تجھے کیا خبر ہوگی میرے جگر کے ٹکڑے کی۔ ہائے میرا بچہ! کس عذاب میں پھنس گیا۔ جانے کہاں ہوگا اس وقت۔ منحوس ڈائن! تو ہی ہے میرے بچے کی بربادی کی ذمہ دار۔ کم بخت! جان کے لالے پڑ گئے تھے' میں خوش تھی مرے گی تو پاپ ٹل جائے گا مگر تو تو کفن پھاڑ کے اٹھ بیٹھی۔ جانے کب میرے بیٹے کی جان چھوڑے گی۔ چل اٹھ' غسل خانے میں دفع ہو..... اور ادھر صندوق میں فیروزی گوٹے والا جوڑا اور صغریٰ کے زیور پڑے ہیں' نہا کے پہن لے اور باہر چل۔ ساری برادری تیرے سوکھے چہرے کے دیدار کو تیار بیٹھی ہے۔ روئیں گے سب میرے چاند کی قسمت کو' مگر کیا کروں رسم دنیا نبھانی پڑے گی۔''

عطیہ نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔

''چل اب اٹھ جا۔ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں اور ہاں سن خبردار جو منحوس نظر آنے کی کوشش کی۔ خوش خوش نظر آنا ورنہ جان سے مار دوں گی' سمجھی۔''

''جی خالہ۔'' عطو نے ساری آہیں اندر کہیں دفن کر دیں۔ باہر ڈھولک بج رہی تھی۔ میراثنیں گلا پھاڑ کے گا رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ناشتے کا انتظام ہو رہا تھا۔ حلوائی ساتھ والے خالی مکان میں حلوہ پوری تیار کر رہے تھے۔ چائے کی دیگ چولہے پر تھی۔ بھنی ہوئی کلیجی کا دیگچہ باورچی خانے میں پڑا تھا۔ گاؤں سے آنے والی مائی فاطاں شپا شپ روٹیاں پکا رہی تھی۔ لڑکیاں اس کے ساتھ لگی تھیں' ہنسی' قہقہے' رنگینیاں..... سرسراتے ریشمی لباس' عطر پھول ہر شے اپنی جگہ ٹھکانے پر تھی۔ پر نہیں تھا ٹھکانے پر تو عطو کا دل۔ وہ نہ ہنسنے کی پوزیشن میں تھی نہ رونے کی۔ بے چارگی کے احساس کے ساتھ اٹھی اور عقب کی گیلری میں موجود غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ لباس بدلا۔ زیور بدن پر سجائے اور بیٹھ گئی۔ جانے کون اندر داخل ہوا۔

''اچھا۔ تو تیرے کالے چہرے کی لیپا پوتی تو تیرا باپ قبر سے آ کر کرے گا۔''

''جی..... وہ خالہ۔ مجھے نہیں آتا سرخ پوڈر لگانا۔''

''ہاں ہاں، تجھے صرف نحوست پھیلانا آتا ہے۔ کم بخت۔ مرن جوگی۔ ایک بیٹے کو بلا کی طرح چٹ گئی تھی' اس سے ہٹی تو میرے چندا کی زندگی کا داغ بن گئی۔ ہائے میرا بدنصیب بیٹا۔ مگر کسی غرور میں نہیں رہنا۔ دو چار دنوں میں ہی اس کی دوسری شادی کر دوں گی۔ مرد' مرد ہے' آزاد ہے۔ مرد کی راہ کون روک سکا۔''

وہ زہر میں بجھے تیر چلاتی کمرے سے نکل گئیں عطیہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ آنکھ کے سارے آنسو چپکے سے پی لیے اور آئینہ سامنے رکھ کے الٹا سیدھا میک اپ کرنے لگی۔

زہرا بھابھی اسے باہر لے آئیں۔ محفل میں شریک لوگوں سے عطیہ کا بھی برابر کا رشتہ تھا اور ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے اسے دس بارہ سال پہلے سات آٹھ سالہ بچی کے روپ میں دیکھا تھا۔ تب وہ سرخ و سفید خوب صورت بچی تھی اور اب.....

اب تو لگتا تھا تیس چالیس سالہ صدمات کی ماری کوئی خاتون ہے۔

کئی ایسے تھے جن کی اس سے شناسائی نہ تھی۔

''آئے ہائے۔ صداقت نے یہ کیا کیا۔ بچے کا نصیبہ پھوڑ دیا۔ ڈائن سے بیاہ دیا۔ ارے لڑکا تو بہت خوب صورت ہے۔ صداقت کا بیٹا تو لگتا ہی نہیں۔ کسی ریاست کا شہزادہ نظر آتا ہے۔ اپنی عارفہ کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ عارفہ بتاتی تھی کالج کی ساری لڑکیاں اس

کی دم دیوانی تھیں۔ اس نے کسی کو مڑ کے دیکھا نہ پلٹ کے پوچھا۔ اے خدا! یہ شرافت کا صلہ ملا۔ ارے صداقت نے آنکھیں بند کر کے یہ رشتہ کیا تھا۔''

''ہمیں کیا معلوم۔ سنا ہے لڑکی جائیداد کی مالک ہے۔''

''ارے خاک جائیداد۔ بارہ سال سے اسی گھر میں رہ رہی ہے۔'' تیسری خاتون نے مداخلت کی۔

''مگر کیوں؟''

''اے بہن بڑی لمبی داستان ہے۔ پھر کسی وقت بتاؤں گی۔''

''نہیں پھر کسی وقت کیوں' ابھی بتاؤ' پتا تو چلے۔''

تینوں خواتین اٹھ کر نسبتاً پرسکون اور خالی جگہ جا بیٹھیں اور لگیں باتیں کرنے۔

☆☆☆

سلمان جانے کب واپس آیا تھا مگر اس وقت دلہن کے پلنگ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھا اپنی پریشانیاں چھپا کر' ہنس ہنس کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عارفہ اس کی کلاس فیلو بھی تھی اور محلے دار بھی۔ ایک زمانے میں عارفہ اسے دل و جان سے پسند کرنے لگی تھی لیکن وہ کوئی خوب صورت لڑکی نہ تھی اور سلمان ماورائی حسن کا متلاشی تھا۔ وہ عارفہ کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکا۔ تب ہی عارفہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ دو بچوں کی ماں' سر سے پیر تک سونے اور موتیوں سے لدی ہوئی۔

''منہ دکھائی مجھے نہیں انہیں دینا چاہیے۔ کیوں غلط تو نہیں کہا میں نے..... پردے میں چھپ کے بیٹھنے کے لائق تو ہم ہیں' یہ نہیں۔''

عطیہ بھی یہ سب سن رہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی تیر سا چبھا۔ دل زخمی ہوا' آنکھ بھر آئی۔

''اللہ' سلمان بھائی! آپ تو سدا کے خود پرست ہیں۔ خود کو یوسف ثانی سمجھتے ہیں۔ اب اللہ ہر ایک کو اتنا حسن نہ دے تو وہ کیا کرے۔''

''بھاڑ جھونکے۔'' سلمان کے لبوں پر طنزیہ ہنسی تھی۔

''خیر' آپ کی بات درست بھی مان لی جائے' تو آپ اپنی منہ دکھائی کے طور پر کیا لینا پسند کریں گے؟''

''دوسری شادی کا اجازت نامہ۔'' سلمان نے ٹھوس اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ عطیہ نے ایک دم سلمان کی طرف دیکھا' نیوی بلو شلوار سوٹ اور سرمئی جرسی میں اپنے سرخ و سفید رنگ اور اپالو کے مجسمے جیسے نقش و نگار کے ساتھ بے انتہا خوبرو لگنے کے ساتھ ساتھ بے رحم جلاد بھی نظر آ رہا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے اپنی حسین آنکھوں میں حسین زیبی کو بسائے' وہ کسی نشے کے خمار میں ڈوبا ہوا مسکرائے جا رہا تھا۔ ایک خوب صورت امید اور دلکش آس کے سہارے وہ رات کا سارا غم بھول گیا تھا۔

''دوسری شادی۔''

''آف کورس دوسری شادی۔ تم تو پڑھی لکھی خاتون ہو مسز عارفہ نجم الدی سیٹھ۔ تمہیں خبر ہے نا شادی تو دو دلوں کے بندھن کا نام ہے اور میرے دل نے اس بندھن کو کبھی قبول کیا ہی نہیں۔ میں اپنی زندگی میں اتنا بھی بے اختیار نہیں ہوں کہ اسے قبول کر لوں۔ ماں نے یہ وعدہ کر کے ہی مجھے اس ڈرامے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ قربانی زہرا آپا کے لیے ہے' احسان بھائی کے لیے ہے۔''

''یہ زیادتی نہیں سلمان بھائی؟ اس سارے حادثے میں عطو کا کیا قصور..... آپ انکار کر دیتے۔''

''نہیں عارفہ! میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجبور تھا لیکن اس نام نہاد شادی کے بعد مجبور نہیں ہوں۔ بس ایک پیپر پر اس کے انگوٹھے کی ضرورت پڑے گی اور بس۔ ویسے میں حیران ہوں' عجب قانون ہے اس دنیا کا۔ بدمعاشی کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی اور جب اخلاقی تقاضوں پر عمل پیرا ہونے لگو تو قانون آڑے آ جاتا ہے تب ہی تو لوگ آسان راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ جہاں سزا کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔''

''لڑکی آپ نے ڈھونڈ رکھی ہے؟''

''ہاں' دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔ کالج کی ساری لڑکیوں کا حسن ایک پلڑے میں ڈال کر تولا

جائے تو وہ اس کے حسن سے کم ہوگا۔ بس قسمت تھی کہ وہ مجھے مل گئی۔ بی اے کرکے میں کسی دفتر میں کلرک کی جاب کررہا ہوتا تو وہ پری چہرہ میری زندگی میں کیسے آتی۔ میں ویگن ڈرائیور بنا ہی اسی لیے تھا کہ ایک دن وہ میری زندگی میں آجائے۔''

وہ عارفہ کے سامنے کھلا جارہا تھا اور عطیہ تیروں کی بارش سے چھلنی ہوئی جارہی تھی۔

''ہے کون وہ؟''

''بھئی بنت آدم ہی ہے۔ قوم جنات سے ہرگز نہیں ہے۔'' سلمان بے حد خوش وخرم تھا۔ عارفہ نے عطیہ کو ترحم کے ساتھ دیکھا۔

رسم ورواج کی زنجیریں انسانوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتی ہیں۔ اسے عطیہ پر ترس آنے لگا۔

''بے چاری لڑکی۔ جانے کس ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنے کو ایک بے رحم اور خود پرست انسان کی زندگی میں بوجھ بن کر آگئی۔'' اس نے سوچا۔

''بہرحال سلمان بھائی۔ آفٹر آل وہ آپ کی بیوی ہے۔ اس کے آپ پر حقوق ہیں۔''

''یہ حقوق کی ادائیگی ہے عارفہ بی بی کہ اس چڑیل کا نام میں اپنے نام کے ساتھ سن رہا ہوں۔ برداشت کررہا ہوں اور خوش ہوں۔''

پھر ایک رات نے کائنات کی روشنیوں کو اپنے سیاہ سینے میں چھپالیا۔ وہی تنہائی اور عطیہ..... نہ کوئی ہمدرد نہ ساتھی..... نہ غم خوار نہ غم گسار۔ سلمان نے تو آج کمرے میں داخل ہونے کا فرض بھی نہ نبھایا کیونکہ آج گھر پر مہمان نہیں تھے اور گھر میں روک ٹوک والا تو سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

''بی بنو! یہاں تمہارے نوکر نہیں بیٹھے جو آکے کھانے کی ٹرے تمہارے حضور پہنچادیں گے۔ چلو چل کے اپنا کھانا لے لو..... اور ہاں یہ بن سنور کے بچے کے کمرے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں' اپنی اوقات میں رہا کرو۔ رہنے کے لیے سامان والی کوٹھڑی اتنی بری نہیں۔ وہ غصے میں آگیا تو گھر ہی چھوڑ دے گا۔'' زہرا بھابھی اس کے سر پر کسی جلاد کی طرح کھڑی تھیں۔

''دو دن دنیا دکھاوے کو یہاں کیا لائے۔ خود کو کمرے کا مالک سمجھنے لگی۔'' خالہ نے اسے گھورا' ان کی سرخ آنکھوں سے اسے ہمیشہ سے خوف آتا تھا۔

''جی اچھا۔ میں ابھی چلی جاتی ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل آئی۔ اسی پرانے مسکن میں جو پچھلے بارہ سال سے اس کا مقدر تھا۔ اس کی بھتیجی سمیرا اس کا کھانا وہیں رکھ گئی۔ کھانا اسی طرح پڑا رہا۔ وہ اوندھے منہ لیٹی آنسو بہاتی رہی۔ اسے تو وہ دن یاد بھی نہیں رہے تھے جو اس نے بے فکری کے ساتھ اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر میں گزارے تھے۔ یاد تھے تو وہی دن جو اس نے ظلم وستم کی چکی میں پستے گزار دیے۔ ابھی سات آٹھ سال کی ہی تھی کہ فدا بھائی کی شادی زہرا بھابھی سے ہوگئی۔ فدا بھائی دیہات سے خالہ کے پاس پڑھنے کے لیے بھجوائے گئے تھے تاکہ پڑھ لکھ کے نوکری کرکے گھر سے غربت کے اندھیرے دور کرسکیں۔ غربت کی تاریکی تو روشنی میں نہ بدلی پر فدا بھائی کی دنیا زہرا بھابھی کے حسن سے جگمگا اٹھی۔ میٹرک کرتے ہی وہ کلرک کیا لگے' اماں کا پہنچا پکڑ لیا۔

بے چاری اماں بھاگم بھاگ بہن کے پاس پہنچیں۔

خالہ بھی دراصل دیہات کی رہنے والی تھیں۔ خالو شہر میں مستری کا کام کرتے تھے۔ تجربے نے انہیں کاریگر بنادیا۔ شہر کی ہر چوتھی عمارت خالو کی بنی ہوئی تھی۔ وہ شہر آئے تو خالہ کو بھی لے آئے۔ شہر سے کچھ دور ایک پلاٹ خرید کر دو کمرے بنا کر رہنے لگے۔

خالہ شہر کیا آئیں ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب وہ گاؤں آتیں تو ان کے قدم زمین پر نہ ٹکتے' بچوں کو انہوں نے اسکول میں داخل کرادیا۔ بھائیوں میں احسان بھائی سب سے بڑے تھے پھر سلمان تھا۔ اس کے بعد صغریٰ' کبریٰ اور پھر چھوٹے دو بھائی نعمان اور عرفان۔ خالو کا کاروبار ذرا چل نکلا تو وہ کام کے ٹھیکے لینے لگے۔

مہینے میں بیس پچیس ہزار کما لیتے لیکن ایک بڑے خاندان کے لیے یہ رقم ناکافی تھی۔ بچوں کی پرورش' خوراک' تعلیم وتربیت یہ سب کچھ اسی پیسے میں ہونا مشکل تھا۔ لیکن اپنے عزیز رشتہ داروں میں

پیسے کے لحاظ سے وہ سب سے آگے تھے۔

فدا بھائی کا رشتہ انہوں نے جھٹ سے قبول کرلیا کیونکہ فدا بھائی فرماں بردار قسم کے بندے تھے۔ جی حضوری کرنے والے اور خالہ شہر آ کر اور بھی حکومت پسند ہوگئی تھیں۔

پھر خالہ نے ایک شرط بھی رکھ دی تھی۔ عطو کا رشتہ احسان سے کرنے کی شرط۔ اماں کو یا ابا کو کیا اعتراض ہوتا۔ انہوں نے ہامی بھرلی۔ یوں بھی وہ چھوٹی سی بچی ہی تھی کہ خاندان کے رواج کے مطابق اس کا نکاح احسان بھائی سے کردیا گیا۔ خالہ نے اسے سرخ غرارہ سوٹ پہنا کر ننھے منے زیوروں سے سجا کر اپنی گود میں بھرلیا۔

زہرا بھابھی بیاہ کر دو دن کے لیے گاؤں آئیں' واپس گئیں تو وہیں کی ہو رہیں۔ خالہ نے خالی زمین پر دو کمرے بنوا کر بیٹی کو دے دیے اور فدا بھائی ایک تابع فرماں بردار داماد کے روپ میں اس گھر کے ہو کر رہ گئے۔ آٹھ گھنٹے کی سرکاری ڈیوٹی کے بعد وہ گھر کے کاموں میں لگ جاتے۔ سارے بیرونی کام ان کے ذمے تھے۔ گھر میں ہوتے تو گھر کے کام کاج اور بچوں کی پرورش میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے۔

احسان بھائی کو ٹرمل کے بعد خالو نے اپنے ساتھ کام میں لگالیا۔ بے چارے نفاست پسند احسان بھائی والد کے ڈر سے کام پر لگ تو گئے مگر ان کا دل نہ لگا۔ گھر آتے ہی نہا دھو کر کپڑے بدلتے اور مٹر گشت کو نکل جاتے۔ کبھی تایا کے ہاں کبھی پھوپھو کے گھر۔ اس آنے جانے میں ایک دن وہ تایا کی بیٹی زریں کو اپنا نرم و نازک سا دل دے آئے۔ اب کیا تھا دن رات کے ہر لمحے ان کا دل تایا کی گلی میں جانے کو مچل اٹھتا اور وہ دل پر بہت دیر کنٹرول نہ کر سکے۔

تائی کو تو اس دن بھی بہت ملال ہوا تھا۔ جب ان کی دیورانی نے احسان کا نکاح اپنی بھانجی سے کردیا تھا۔ اب احسان کا جھکاؤ دیکھ کر ان کو موقع مل گیا۔ دل کے زخموں کا علاج ان کے پاس خود چل کر آ گیا تھا۔ انہوں نے زریں اور احسان کو مل بیٹھنے کے مواقع فراہم کیے۔

احسان دم دیوانہ ہوگیا۔ دل میں دبی چنگاری جو سلگی تو دھواں دھواں ماحول میں بالآخر آگ لگ ہی گئی۔ احسان نے عطو سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اس انکار نے گھر بھر میں ہل چل سی مچادی۔ خالہ نے احسان بھائی کو ٹوکا۔ سختی سے اس بات کو رد کیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ زریں کے حصول کی خواہش نے انہیں ہوش و حواس سے بے گانہ کردیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔

''اگر گھر والے ان کی اس خواہش کا احترام نہ کریں گے تو وہ یہ گھر چھوڑ کر تایا کے گھر چلے جائیں گے۔'' سخت الجھن کا شکار خالہ خالو آخر ہار مان گئے۔

فدا بھائی اور گاؤں والوں سے چوری چوری زریں اور احسان بھائی کی منگنی ہوگئی۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی مگر یہ خبر کہاں تک چھپتی ایک دن سب کو علم ہوگیا۔ شادی میں صرف دو دن باقی تھے۔ جب فدا بھائی نے جیسے کھڑے پانی میں پتھر پھینک دیا۔

''خالہ اماں! عطو کی موجودگی میں احسان دوسرا نکاح کیسے کرسکتے ہیں۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔ عطو میری بہن ہے۔ میں اسے احسان کی خوشیوں پر قربان نہیں کرسکتا۔''

''فدا بھائی! میں زندگی بھر اسے بیوی کے طور پر قبول نہیں کرسکتا۔ عمروں کا فرق ہماری راہ کی سب سے اونچی دیوار ہے۔''

''یہ اس وقت سوچا ہوتا، جب نکاح کیا تھا۔''

''نکاح میں نے نہیں' بابا نے کیا تھا۔''

''مگر دستخط تو تم نے کیے تھے؟''

''میں تو ان رسموں رواجوں کے خلاف ہوں۔ شادی کوئی کھیل تماشا تو نہیں۔''

''یہ پہلے کہہ دیتے۔ اب تو وقت گزر چکا ہے۔ احسان خالو سے کہو وہ اپنے بھائی کو انکار کردیں۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''تب تمہاری شادی بھی ناممکن ہے۔''

''کیا کریں گے آپ میرا؟''

''سوچ لو کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ جانتے ہو شادی کے لیے تمہیں پہلی بیوی سے اجازت کی ضرورت ہے۔''

''ہونہہ پہلی بیوی۔ وہ آٹھ نو سال کی بچی میری بیوی ہے۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ کیسی اجازت' کہاں کی اجازت؟''

''یہ نکاح کا بندھن ہے' کوئی مذاق نہیں۔ خبر تو اس وقت ہوگی جب میں عدالت میں تمہارے خلاف مقدمہ دائر کروں گا۔ بلا اجازت دوسری شادی کا۔''

''آپ کس زعم میں ہیں فدا بھائی کہ یہ معمولی سی بندش مجھے میری آرزو کے رستے سے ہٹادے گی' ناممکن ہے۔ اسلام کے قوانین کی رو سے یہ بندھن مضبوط ہے تو انتہائی کمزور بھی ہے۔ پل میں ٹوٹنے والا ناتا ہے۔''

''تم اسے توڑ کے دیکھ لو۔''

''یہ کون سا مشکل ہے۔ دو لفظ کہنے سے ہی ٹوٹ جائے گا۔''

''وہی تو کہتا ہوں کہ دو لفظ کہہ کے دیکھ لو۔''

''آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے لہجے سے ڈر جاؤں گا۔ یہ آپ کی بھول ہے۔ میں نے عطیہ کو طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔''

سب دم بخود ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''سچ کہہ رہا ہوں' پھر سے کہہ رہا ہوں۔ آپ سب گواہ ہیں میں نے طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔''

''احسان! اپنے الفاظ اپس لے لو۔ نتیجہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' فدا بھائی کے لہجے میں شکست کا احساس تھا۔ غصے کا طوفان تھا۔ ٹھکرائے جانے کا غم تھا۔

''میں کسی نتیجے سے نہیں گھبراتا۔ اور میں قربانی کا بکرا ہرگز نہیں ہوں کہ آپ کے اور زہرا آپا کے عشق کو دوام بخشنے کے لیے اپنی خوشیاں قربان کردوں۔''

''تم نے میری بہن کو طلاق دی ہے۔ میں تمہاری بہن کو.....''

''فدا.....'' خالد لپک کر اس کی طرف بڑھیں۔ ''اپنی زبان سے یہ الفاظ مت نکالنا۔ اپنے بچوں کی طرف دیکھنا۔''

خالہ نے عامر اور سمیرا کی طرف دیکھا' چھوٹا ناصر زہرا بھابھی کی گود میں تھا۔

''یہ بات آپ نے اپنے بیٹے سے کہی ہوتی۔''

''وہ نادان ہے۔ تم سمجھ دار ہو۔''

''خالہ..... ! مجھے بہن کی عزت بیوی اور بچوں سے کم عزیز نہیں ہے۔ میں جارہا ہوں۔ چند دنوں میں مہر کی رقم اور طلاق نامہ بھجوادوں گا۔ گھر داماد ضرور تھا لیکن عزت کا سودا نہیں کیا تھا میں نے آپ سے۔''

''بے شک دے دو طلاق۔ زہرا آپا ہمارے لیے بوجھ نہیں ہیں۔ لے جاؤ اپنے بچوں کو۔'' احسان بھائی بدتمیزی پر اتر آئے۔

فدا بھائی اسی وقت گاؤں روانہ ہوگئے۔ اماں کو پتا چلا تو گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ بارہ سالہ عطو حیرانی سے ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی۔ اماں اسے گلے لگا کر رونے لگیں۔

''آئے ہائے میری بدنصیب بچی! تیرے نصیب تو جاگنے سے پہلے ہی سو گئے۔ تجھے طلاق ہوگئی۔ اب کون تجھے بیاہنے آئے گا؟ کب تیری ڈولی اٹھے گی؟ کیسے تو دلہن بنے گی؟''

وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ عطو تو نکاح اور طلاق دونوں کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ پنگھٹ پہ گھڑا بھرنے گئی' سہیلیوں نے پوچھا تو جھٹ سے بتادیا۔

''وہ احسان بھائی ہیں نا شہر والے انہوں نے مجھے طلاق دے دی۔'' جیسے کوئی لطیفہ سنا رہی تھی' ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔ لڑکیاں اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

ابا شاید اسی خبر کے منتظر تھے۔ سنتے ہی دنیا چھوڑ گئے۔ عطو گھڑا اٹھا کے گھر گئی تو صف ماتم بچھ چکی تھی۔ فدا بھائی سر نیہوڑائے ایک طرف بیٹھے تھے' اسے گلے لگا کر رونے لگے۔ کچھ دیر میں بڑی بہنیں بھی آگئیں۔ ابا کے مرنے کی خبر خالہ کے گھر بھی پہنچ گئی۔ احسان بھائی کی شادی میں ایک دن رہ گیا تھا' شادی رک گئی۔ پورا خاندان ان کے گھر جمع ہوگیا۔ احسان بھائی بھی ان میں شامل تھے۔ اماں انہیں دیکھتے ہی

بے ہوش ہوگئیں۔ ہوش میں ہی نہ آئیں' ابا کی میت گھر پر پڑی تھی کہ اماں کو ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ پورا ایک ماہ دو جنرل وارڈ میں رہیں' اماں کی بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک رات وہ بھی عطو کی صورت تکتے تکتے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یوں عطو ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوگئی۔ فدا بھائی نے دو تین ماہ کی چھٹی لے لی اور اس کے ساتھ رہنے لگے۔

☆☆☆

اماں کا چالیسواں گزر گیا۔ ایک شام خالہ کا پورا خاندان گاؤں آ گیا۔

''فدا! تو میرا بیٹا ہے' مجھے بہت عزیز ہے۔''

''نہیں خالہ! میں بیٹا ہوتا تو آپ یہ ظلم نہ ہونے دیتیں۔''

''میں شرمندہ ہوں۔ تیرے حوصلے کی قائل بھی ہوں فدا! زہرا بہت پریشان ہے۔ بچے تیرے بغیر اداس ہیں۔''

''میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ وہاں میری معصوم بہن کی خوشیوں کا قبرستان ہے۔ میرا دل دکھے گا۔ آپ اس لیے آئی ہیں نا کہ میں بہن کی آرزوؤں کے لاشے کو کندھا دوں، یہ ناممکن ہے۔ آپ شوق سے شادی کیجیے احسان کی۔ اب تو اس پر کوئی پابندی نہیں رہی۔''

''فدا! بیٹے! رشتے ٹوٹنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ایک ناتا ٹوٹا ہے، دوسرا جڑ بھی سکتا ہے۔ میں عطو کو اپنی بہو بناؤں گی' تم آج ہی سلمان سے اس کا نکاح کردو۔''

خالہ ایک بار پھر بیٹی کی خاطر بیٹے کی قربانی دینے کو تیار تھیں۔ زہرا کے اجڑے گھر کو آباد کرنا خاصا مشکل تھا۔

فدا بھائی خاموش ہوگئے۔

برداری والوں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ خالہ کی پیش کش کو ان کا خلوص قرار دیا۔ فدا بھائی جھک گئے۔ ایک بار پھر عطو کا نکاح ہوگیا سلمان سے' جو اس وقت مڈل کا طالب علم تھا۔ خوبرو سلمان' جس کی صورت پر کسی الف لیلوی شہزادے کا گمان ہوتا تھا۔ فدا بھائی کو شہر آنا تھا' عطو اکیلی کس کے پاس رہتی ٹوٹے پھوٹے صندوق میں اماں کی چند نشانیاں اور سونے کے زیورات سمیت وہ فدا بھائی کے ساتھ آ گئی۔

چند دن ابتدائی ایام تھے۔ سب نے اس کا خیال رکھا پھر احسان بھائی کی شادی آ گئی۔ وہ بھی اوروں کی طرح خوشی خوشی اس میں شریک تھی۔ اس کی گاؤں والی سہیلیاں بھی شادی میں آئی تھیں۔ سب نے سلمان کو دیکھا' اس کی تعریف کی۔

''تو تو بڑی خوش نصیب ہے عطو! ایک سوہنا گبھرو تیرا جیون ساتھی ہوگا۔''

اب عطو خاصی سمجھ دار ہوچکی تھی۔ رفاقت کی کہانیوں کا مفہوم اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا، اسے بھی خود پر رشک سا آیا۔

خوب صورت سا، مغرور سا، خاموش سا سلمان اسے اچھا لگا تھا۔ شادی کی تقریب میں، ولیمے میں وہ سب سے الگ تھلگ نظر آیا۔ فدا بھائی نے شادی کی لیے عطو کو بھی جوڑے بنوا کر دیے۔ سرخ سوٹ میں وہ اڑی اڑی پھر رہی تھی مردانے کے قریب سے گزری تو سلمان اس کو دیکھ کر رک سا گیا۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگ آئی۔

سلمان کی نظریں کتنی دیر اس کے تصور میں ہلچل مچاتی رہیں۔

شادی ہوگئی احسان بھائی کی۔ دلہن گھر میں آ گئی۔ اسے بھی علم تھا عطیہ اس کے احسان کی منکوحہ تھی۔ وہ ازخود ہی عطو سے پرخاش رکھنے لگی۔ دنوں میں زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ فدا بھائی نے وہیں محلے میں کریانہ کی دکان کھول لی۔ نوکری سے آف ہوکر وہ دوکان پر چلے جاتے۔ کھانا چائے بھی دکان پر پہنچا دیا جاتا۔ اس گھر میں عطو کا کوئی اپنا تھا تو فدا بھائی۔ مصروفیت نے انہیں بھی عطو سے چھین لیا۔ عطو سب کے دل کا داغ تھی۔ وہ نہ ہوتی تو بہت سے مسائل نہ ہوتے۔ زہرا بھابی نے اسے اپنے بچوں کی آیا بنا ڈالا تھا۔

''عطو! فیڈر دھونا۔''

''عطو! سمیرا کو پانی کرا دینا۔''

''عطو! عامر کے کپڑے استری کر دینا۔''

''عطو! ناصرہ کے فراک دھو دینا۔''

عطو ہر کام میں آگے آگے۔ پھر تو کام اور بھی بڑھ گئے۔ صغریٰ، کبریٰ کمرے میں گھسی کتابیں پڑھتی رہتیں۔ اور وہ باورچی خانہ سنبھالے رہتی۔ خالو کو صبح دم ناشتہ بنا کے دینا۔ احسان بھائی اور ان کی دلہن کے لیے ناشتہ کمرے میں پہنچانا۔ بچوں کے منہ ہاتھ دھلانا کپڑے بدلنا۔ سارے کمروں کا جھاڑو پوچھا۔ پلنگ باہر نکالنا' اندر ڈالنا' بستر لپیٹنا۔ غرض کوئی کام ایسا نہ تھا جو عطو کے بغیر ہو جاتا ہاں مگر ایک کام۔

کھانے کے وقت خالہ سدا اس کو بھول جاتیں۔ سب کھا پی لیتے۔ عطو سامان کی کوٹھری میں بیٹھی کوئی رومال کاڑھتی رہتی۔ خالہ بچا کھچا کھانا لے آتیں۔

''ارے عطو! خدا کی مار تو یہاں گھسی بیٹھی ہے کھانے پر تجھے بلاتی رہی۔ پر تو تو سنتی ہی نہیں' چل کھانا کھالے۔''

وہ چنگیر اس کے آگے رکھ دیتیں۔ اور وہ بچا کھچا کھانا چپکے سے کھا لیتی۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی۔ رات کو جسم کا انگ انگ دکھ رہا ہوتا۔ مگر وہ کہتی کس سے۔ فدا بھائی رات کے گیارہ بجے لوٹتے اور پڑ کر سو جاتے۔ صبح آفس چلے جاتے سلمان نے کبھی اسے پلٹ کے دیکھا ہی نہیں۔ ایک دن وہ سمیرا کو اسکول کے لیے تیار کر رہی تھی بستر سمیٹتے ہوئے اس کی کتابیں کھول کر دیکھنے لگی۔

''اتنی تمیز نہیں ہے تو مت کھولو کتاب۔'' جانے کہاں سے سلمان آ گیا تھا۔

وہ اسے احمقوں کی طرح دیکھنے لگی۔

پاگل ہوا ایک دم، پتا بھی ہے۔''

''پھپھو! تم نے کتاب الٹی پکڑ رکھی ہے۔'' سمیرا نے کہا۔

''تم سے تو یہ بچی ہی اچھی ہے۔ احمق کہیں کی۔'' وہ بھاگ کے خالہ کے پاس گیا۔

''ماں! کئی بار کہا ہے اس اونٹ کو میرے پلے باندھا ہے تو چار حروف پڑھا دیں اس کو۔''

''ارے میں کیا کروں بیٹے! کند ذہن ہے۔ مجال ہے جو ایک لفظ پڑھ سکے۔ صغریٰ دماغ خوری کر کے تھک گئی ہے۔''

انہوں نے صاف جھوٹ بول دیا۔ پہلی بار ایک جھوٹ پر عطو کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن وہ چپ رہی سلمان جاتے جاتے رک گیا۔

''میرے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھتی ہو تو انسان بھی بنو۔ ورنہ احسان بھائی کی طرح ایک ٹھوکر میں گھر سے باہر پھینک دوں گا۔ سمجھیں۔''

وہ تھیں لگا کے چلا گیا۔ آنگینے پھوٹ پڑے۔ کتنی دیر وہ کوٹھری میں گھسی روتی رہی۔ پورا دن وہ اداس اور پریشان رہی۔

☆☆☆

زرین کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ اس نے عطو کو بلا لیا۔ شوکیس سے نکالے ہوئے برتنوں کو دھونے کے لیے کہا۔ سارے برتن عطو نے پل بھر میں دھو دیے۔ اندر لاتے ہوئے اس کے جہیز کا قیمتی جگ عطو کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گیا۔ زریں نے دیکھتے ہی دھموکا اس کی کمر میں جڑ دیا۔

''تمہارے ہاتھ ٹوٹیں۔ اندھی ہو، میرا قیمتی جگ توڑ دیا۔'' خالہ بھاگی آئیں۔

''کیا بات ہے؟''

''کیا بات ہوگی..... مارے حسد کے میرا جگ توڑ دیا۔'' خالہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کس کے تھپڑ جڑ دیا۔

''حرام خور ہوتی جا رہی ہے۔ بدبخت سوکنوں جیسا رویہ رکھتی ہے۔ اب تو تجھے سلمان کا نصیبہ پھوڑنا ہے۔ احسان اور اس کی دلہن کا پیچھا چھوڑ دے۔''

زہرا بھابی کیوں پیچھے رہتیں۔

''گاؤں میں ہوتی تو ٹھیک رہتی۔ شہر کے آرام نے ہاتھ پاؤں کا دم نکال دیا ہے۔ اپاہج ہو گئی ہے۔ آئندہ ایسا کیا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔'' زہرا بھابی نے ہاتھ میں پکڑا پکانے والا چمچہ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ کلائی کی ہڈی زور سے بجی عطو کی چیخ نکل گئی۔

''ہائے اماں!'' وہ بھاگ کے بے اختیار

دروازے کی طرف بڑھی اور اسی طرح دوڑتی ہوئی چوتھے گھر میں داخل ہوگئی۔ یہ گھر ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر کا تھا۔ جو بے اولاد تھے۔ ان کی بیوی بہت اچھی خاتون تھیں۔ عطو کبھی کبھار ان کے ہاں چلی جاتی تھی۔ وہ بڑی محبت سے پیش آیا کرتیں۔ اب جو عطو روتی چلاتی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا عطو! کیوں رو رہی ہے؟''

''ماں جی... ! میرے ہاتھ کی ہڈی.....''

انہوں نے جلدی سے اس کا ہاتھ ٹٹولا۔ عطو کی چیخیں اور تیز ہوگئیں۔

''میں نے کہا، بات سنیے گا۔'' انہوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو پکارا۔ وہ دوڑے چلے آئے۔

''بچی کو جانے کیا ہوا ہے، لگتا ہے کلائی کی ہڈی پر چوٹ لگی ہے۔ کیا ہوا ہے عطو! گر گئی ہو؟''

''جی، جی ہاں گر گئی ہوں۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب اسے جھٹ سائیکل پر بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

''ہڈی فریکچر ہوگئی ہے' اسے فوراً ہاسپٹل لے جائیں۔'' ہڈی کے ڈاکٹر نے بازو پر پلستر چڑھا دیا۔ درد کے لیے دوائیں لکھ دیں۔ وہ گھر آ گئی۔ ماں جی اسے چھوڑنے گئیں۔

سب کے منہ بنے ہوئے تھے۔ ماں جی کے جاتے ہی سب نے جھگڑنا شروع کر دیا۔

''ایسی ہی موت آ گئی تھی تو ہمیں بتایا ہوتا' محلے میں ہماری بے عزتی کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاتھ کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ قیامت نہیں آئی۔'' زہرا بھابی نے زہر اگلا۔

رات کو فدا بھائی آئے تو وہ بھی خفا ہونے لگے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے عطو! گر ہی گئی تھیں تو خالہ کو بتایا ہوتا۔ میرا انتظار کیا ہوتا۔ غیروں کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔''

دنوں تکلیف اٹھا کر وہ قدرے ٹھیک ہوئی۔ اس درد نے اسے ادھ موا کر دیا۔ روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ سفید رنگت میلی سی ہونے لگی۔ بازو ٹھیک ہوا تو پھر سے گھر کے کام اس کے ذمے لگ گئے۔ اسے ساتھ والی ماں جی سے از حد محبت تھی۔ کام کاج سے فارغ ہوتے ان کے ہاں چلی جاتی۔ ماں جی اس کا انتظار کرتیں۔ اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں چھپا کر رکھتیں۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں میں تیل لگا کر انہیں سلجھا دیتیں۔

''عطو! تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی شکل تو دیکھ آئینے میں۔'' وہ چپ ہو جاتی۔

دن رات کا چکر چلتے چلتے کئی سال بیت گئے۔ عطو بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اب تو ماں جی کا سہارا بھی چھوٹ گیا۔ زہرا بھابی نے فدا بھائی سے جانے کیا کہا۔ انہوں نے عطو کے باہر جانے پر پابندی لگا دی۔

''مجھے محلے میں جینا ہے عطو... ! گلی کے سارے لڑکے تجھ پر آوازے کستے ہیں' خبردار جو باہر نکلی۔''

یوں یہ سہارا بھی چھن گیا۔

☆☆☆

سلمان اب ایک بھرپور نوجوان تھا۔ بی اے تو کر لیا تھا لیکن اچھی نوکری کے لیے سفارش ضروری تھی۔ ڈھیروں ڈھیر پیسہ نا گزیر تھا اور دونوں کی عدم موجودگی میں نوکری دیوانے کا خواب تھی۔ اسے کلرک بننا منظور نہ تھا۔ نہ ہی وہ احسان بھائی کی طرح بابا والا کام کر سکتا تھا۔ دنوں نکما پھرتا رہا۔ جانے کیسے ڈرائیونگ سیکھ لی۔ ایک دوست کی وساطت سے ہیوی وہیکل کا لائسنس بھی حاصل کر لیا۔ باہر جانا چاہتا تھا۔ ایک ٹریول ایجنسی کے مالک نے اس سے وعدہ کیا تھا۔

پیسے جمع کرنے کی خاطر اس نے ایک پرائیویٹ بس کمپنی میں نوکری کر لی اور بس چلانے لگا۔ وہ روایتی ڈرائیوروں سے ایک دم مختلف تھا۔ جہاں جاتا اپنے رکھ رکھاؤ اور تعلیم یافتہ ہونے کے سبب سب میں منفرد نظر آتا۔ دو سال میں اس نے دولاکھ سے بھی زیادہ رقم جمع کر لی۔ ٹریول ایجنسی والے کسی فراڈ کیس میں پکڑے گئے۔ اس کا جانا ملتوی ہو گیا۔ پچیس ہزار نقد دے کر اس نے قسطوں پر ٹویوٹا ہائی ایس خرید لی اور ایک لمبے روٹ پر چلانے لگا۔ اسے دنیا میں دو کام تھے۔ اپنی اور اپنی ویگن کی حفاظت اور

دیکھ بھال، کبھی کبھار گھر والوں کے کہنے پر ٹویوٹا بھر کے وہ انہیں کسی تفریحی مقام پر لے جاتا۔ اور کسی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی عطو سب کچھ دیکھتی رہتی۔ کسی کو نہ اس کی ضرورت ہوتی نہ اس کا خیال۔

ان سالوں میں جانے کون سا غم اسے کھائے جا رہا تھا کہ وہ سیاہ پڑتی چلی گئی۔ آنکھیں جو کبھی خوب صورت نظر آتی تھیں اب ڈرانے لگیں۔ موٹی موٹی محروم محبت آنکھیں۔ سلمان کو اس کی صورت سے نفرت ہوگئی۔ وہ اس کے سائے سے بھی بچ کے چلتا اس کا نام سننا گوارا نہ کرتا۔

گھر میں شادی کا ذکر دور دور تک نہ تھا۔ سلمان نے تو یہ بات اپنے وہم و گمان سے بھی نکال دی تھی کہ عطو اس کی منکوحہ ہے۔ سارے گھر کے لوگ اس پر حکم چلاتے تھے مگر سلمان کو تو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ اس کے کپڑوں کو چھو لے یا کھانے کو ہاتھ لگا لے۔

ان ہی دنوں جب وہ اپنی جوانی کی مستی میں سرتاپا ڈوبا اپنے مردانہ حسن کے زعم میں سرشار تھا۔ واپسی کے سفر میں ایک حسین لڑکی اس کی ہم سفر بن گئی۔ لڑکی اکیلی تھی۔ اخلاقاً اس نے کنڈیکٹر کو ہدایت کی کہ اسے اگلی سیٹ پر بٹھا دے۔ نسوانیت کے احترام میں اس نے دوسری سیٹ خالی ہی رکھی۔

''آپ ایک اور مسافر کو بھی بٹھا لیتے۔''

''اتفاق سے اس ویگن میں اور کوئی خاتون سوار ہی نہیں ہوئی۔ ایک مرد کو آپ کے ساتھ کیسے بٹھا دیتا۔''

''آپ بھی تو ایک مرد ہیں۔'' اس نے کافر ادائی سے سلمان کو دیکھا۔ گویا اس کی مردانگی کی تعریف کی۔

''مجھ میں اور دوسرے لوگوں میں ایک فرق ہے۔''

''کیا؟''

''یہ بات بتانے کی نہیں، سمجھنے کی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''آپ ایک لڑکی ہیں، تنہا ہیں۔ آپ کی عزت اور فی الوقت اس کی نگہبانی میرے ذمے ہے۔''

''آپ کا جذبہ قابل قدر ہے۔ اس احساس پر بے حد شکریہ۔''

''آپ کا بھی۔'' وہ مسکرا دیا۔

''ایک سوال پوچھوں؟'' وہ پھر بولا۔

''جی.....''

''آپ تنہا سفر کیوں کر رہی ہیں؟''

''مجبوری کے تحت..... میں بھی ایک سوال کروں۔''

''جی ضرور.....؟''

''آپ ڈرائیوری کیوں کر رہے ہیں؟''

''بڑا عجیب سوال ہے۔ سارے ڈرائیور میرا خیال ہے، انسان ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی انسان ہوں۔''

''لیکن ذرا مختلف۔''

''وہ کیسے.....؟''

''بھئی، ڈرائیور ایسے تو نہیں ہوتے۔ صاف ستھرے، ویل ڈریسڈ، مہذب اور عزت کے رکھوالے۔'' سلمان ہنس دیا۔

''تو کیسے ہوتے ہیں۔''

''شکل دیکھتے ہی خوف آجاتا ہے۔''

''مجھے دیکھ کر نہیں آیا؟''

''نہیں۔ بلکہ آپ کو دیکھ کر.....''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''چھوڑیے۔''

''پھر بھی۔''

''آپ کو دیکھ کر بہت سے خیال ایک ساتھ آئے ہیں۔ کس کس کو بیان کروں۔''

''چلیے رہنے دیجیے۔ پھر کسی وقت۔''

''کیا مطلب؟ کیا ہم پھر مل سکتے ہیں؟''

''وائی ناٹ محترمہ! دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا' کیا نہیں ہوتا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے میں پھر کبھی باہر نکلوں ہی نا۔ کوئی مجبوری میرا دامن ہی نہ تھامے۔''

''یہ بھی ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ.....''

سلمان کچھ سوچ کے چپ ہو رہا۔

"کہیے نا......"
"کچھ نہیں..... آپ کو جانا کس طرف ہے؟"
"اقبال ٹاؤن۔"
شہر آنے کو تھا۔
"مم..... مگر......"
"مگر..... کیا؟"
"ویگن تو سرکلر روڈ کی طرف جائے گی اور آپ......"
"میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"
"نہیں نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں بھئی وہیں ان سب کو اسٹاپ پر اتار کر میں آپ کو اقبال ٹاؤن چھوڑ آؤں گا۔"
"وہ کیوں؟"
"آپ کی حفاظت ان لمحوں میں میرا فرض جو ٹھہری۔"
"اچھا!" وہ مسکرائی تو اس کے خوب صورت چمک دار دانتوں کی قطار نے سلمان کے دل پر بجلی سی گرادی۔
وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ مسافر اتر گئے۔ اس نے اقبال ٹاؤن کا رخ کیا۔ فلیٹوں کی ایک قطار کے آگے اس نے گاڑی رکوادی۔
"یہ رہا میرا گھر..... فلیٹ نمبر ۵۸۔" سلمان نے زیرلب دہرایا۔
وہ اترنے لگی تو سلمان بھی نیچے اتر آیا۔ اس کا سامان سلمان کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے لب خاموش تھے مگر نظریں سوال کر رہی تھیں۔
"پھر کب ملو گی؟"
وہ سمجھ گئی تھی شاید۔
"ارے نہ آپ کا نام پوچھا نہ اپنا نام بتایا۔ آپ چلے جاتے دل میں خلش سی رہ جاتی۔ امی آپ کا نام پوچھیں تو میں کیا کہوں؟"
"کیا آپ اپنی امی سے میرا ذکر کریں گی؟"
"ضرور کروں گی۔ آپ نے میری حفاظت کی، میرا احترام کیا بلکہ میری خاطر پیسے قربان کیے۔ ایک سیٹ خالی رکھ کے ویگن کرائے کی ہے یا......؟"
"نہیں میری اپنی ہے۔"
"تب ایسی فکر کی بات نہیں۔ اگر کرائے کی ہوتی تو مجھے دکھ ہوتا۔"
"یعنی میرے نقصان کا آپ کو دکھ نہیں۔"
"ہرگز نہیں۔" وہ ہنس دیا۔
"میرا نام سلمان احمد ہے، آپ کی تعریف؟"
"میں زیب النساء ہوں۔"
"واقعی زیب النسا ہیں۔ جس نے نام رکھا سوچ سمجھ کے رکھا۔"
"شکریہ.....!" اس نے سر جھکا لیا۔
"اچھا خدا حافظ.....!" نہ چاہتے ہوئے وہ پلٹ آیا۔
گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دیکھا۔ زیب النسا اسی طرح اپنی جگہ کھڑی تھی۔

☆☆☆

یہ ملاقات کیا ہوئی سلمان نے آنے جانے کا راستہ ہی بدل دیا۔ اب وہ اقبال ٹاؤن کی اسی سڑک سے گزر کے جاتا اور واپس آتا اور زیب کے گھر کے پاس ہارن دینا نہ بھولتا لیکن اس کے گھر تک جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اسے افسوس ہوتا کہ اس نے زیب سے فون نمبر کیوں نہیں لیا یا کم از کم اپنا نمبر ہی دے دیتا۔ زیب کا حسین تر چہرہ خوابوں میں آ کر اسے پریشان کرتا رہا۔
ایک شام وہ بابا کی دوا لینے شہر چلا آیا۔ زیب ایک معمر خاتون کا ہاتھ تھامے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں جا رہی تھی۔ اس نے جھٹ پہچان لیا۔ ایک انجانی کشش اسے اس کے قریب لے گئی۔
"مس زیب النساء.....!"
اس نے پلٹ کے دیکھا اور گویا پھول کی طرح کھل اٹھی۔
"امی، امی دیکھیے نا، کون ہے؟"
"کون ہے؟" امی نے رعونت بھرے انداز میں پوچھا۔ ان ان کے قریب پہنچ گیا۔
"میں سلمان ہوں جی۔ السلام علیکم۔"
"امی یہ وہی سلمان ہیں جن کا ذکر میں نے کیا

تھا۔ سلمان صاحب آپ تو پلٹ کر آئے بھی نہیں۔ ہم انتظار کرتے رہے۔"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹے؟" تمہاری تعریفوں نے میرے کان کھالیے۔ زیبی تو ویسے بھی دیوانی لڑکی ہے۔ مگر تم تو واقعی تعریف کے قابل ہو۔"

"میں آپ کے ساتھ اندر آسکتا ہوں۔ آپ کہاں جارہی ہیں؟"

"ڈاکٹر کو دکھانا ہے بیٹے۔"

"تو چلیے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔" سلمان کی بھاگ دوڑ سے جلد باری آ گئی۔ امی ڈاکٹر کے پاس گئیں تو وہ دونوں تنہا رہ گئے۔

"آپ مجھے بہت یاد آئے۔"

"آپ بھی ہر دم میرے خیالوں میں رہیں۔"

"مگر آپ ملنے نہ آسکے۔"

"ڈرتا رہا۔"

"کس بات سے؟"

"آپ کے عتاب سے۔ آپ کے گھر والوں سے۔"

"گھر میں صرف امی ہیں۔ جنہیں آپ نے قائل کرلیا ہے اپنا۔" وہ ہنس دی۔

"پھر کس دن آؤں؟"

"ابھی چلے چلیں۔ اب تو آپ امی کے بھی محسن ہوگئے ہیں۔"

"شکریہ۔" کمپاؤنڈر نے سلمان کو اندر بلایا۔

"بیٹے پرس زیب کے پاس ہے۔ ڈاکٹر کو فیس دینی ہے۔"

"کوئی بات نہیں امی! میرے پاس پیسے ہیں۔"

"نہیں، رہنے دو۔"

"واہ کیسے رہنے دوں۔ میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔" وہ مسکرادیں۔

سلمان نے ہزار روپے کا نوٹ ڈاکٹر کی طرف بڑھادیا۔ پرچی ہاتھ میں لے کر ساتھ والے میڈیکل اسٹور میں گھس گیا۔ بابا کی دوا بھی خرید لی اور آ گیا۔ ساتھ ساتھ چلتے وہ سڑک تک آ گئے۔ انہیں ٹیکسی میں بٹھا کے اس نے موٹر سائیکل سنبھال لی۔

☆☆☆

یہ التفات رنگ لایا۔ جذبوں نے کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی وہ زیبی کے حسن کا اسیر ہوگیا۔ زیبی اس کے نام کی مالا جپنے لگی دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھالیں۔ باتوں باتوں میں سلمان کو خبر ہوئی۔ بھرے جہاں میں زیبی کا ماں بھائیوں اور باپ کے سوا کوئی نہ تھا۔ باپ اور بھائی سعودیہ میں تھے۔ یہاں ماں بیٹی اکیلی تھیں۔ سلمان نے دنوں میں اس گھر میں جگہ بنالی۔ وہ زیبی کو سچے دل سے چاہنے لگا۔ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا۔ اس میں کمی بھی کیا تھی؟ خامی کون سی تھی سوائے اس کے کہ وہ مجبوری کا قیدی تھا۔ اس کا نکاح عطو سے ہو چکا تھا۔ اس نے زیبی سے صاف کہہ دیا۔ اس سے وعدہ کیا ہر حال میں اسے اپنانے کا.....

محبت کی راہ پر چلتے چلتے وہ بہت آگے نکل آیا۔ پرخار راہ پر۔ فاصلے مٹ گئے۔ اب تو زیب کا بوجھ اٹھانا وہ اپنی ذمہ داری بھی سمجھتا تھا۔ اس نے امی کو ماں کہا تو حق ادا کردیا۔ آتے بہانے گھر کا سودا سلف لانا۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرنا۔ دوا دارو لے آنا۔ کئی بوجھ اس نے ازخود اٹھا لیے۔ اکثر وہ زیب کے لیے کپڑے لے آتا۔ کوئی پسند کی سینڈل، پرفیوم غرض کچھ بھی، اس کی پسند بہت اعلا تھی۔ زیب کو بھی قائل ہونا پڑتا۔

☆☆☆

زندگی ان ہی خوابوں اور سرابوں کے پیچھے بھاگتی گزر رہی تھی کہ گھر میں رخصتی کا شور مچ گیا۔

فدا بھائی کا کہنا تھا۔ عطو کو اب اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے۔ سلمان نے سنا تو خوب پیر پٹخے۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ سب خوش تھے۔ بلکہ سب خوف زدہ تھے۔ فدا بھائی جتنے بھی زن مرید ہوں، بہن کی خوشی سے آنکھیں نہیں چرا سکتے تھے سو شادی ہوگئی۔ سلمان کے دن رات بے قرار ہو گئے ایک پل کو چین نہ تھا۔

عطو ایک بے زبان گائے تھی۔ کسی سے کچھ نہ

کہہ سکی۔ سامان صرف بیگانہ رہتا تو غم نہ تھا۔ وہ تو موقع ملنے پر اپنی شدید نفرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہتا۔

اب تو وہ گھر میں بہت کم ٹکتا۔ سفر سے واپس آتے ہی پھر چل دیتا۔ جانے کہاں شب بسری کرتا۔ صبح صرف خانہ پری کے لیے گھر آتا اور چل دیتا۔ وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ کئی دنوں سے زیب بھی اس سے بے رخی برت رہی تھی۔ امی نے کہہ دیا تھا شادی کے لیے اسے پچیس تولے سونا ادا کرنا ہوگا۔ اس کے پاس بھلا اتنی رقم کہاں تھی۔ ایک ایک پیسہ وہ زیب کی ذات پر خرچ کر رہا تھا اور عطو سے شادی کے بعد تو گویا وہ ایسا مجرم بن کر رہ گیا تھا جس کا اقبال جرم اسے سزا کا حق دار بنا دیتا ہے۔ زیب کے حصول کی خاطر وہ پچیس تولے سونا کیا دنیا کی ہر چیز خرید سکتا تھا۔ لیکن فی الحال وہ پیسہ جمع کرنے کی دھن میں تھا۔ دن میں دو مرتبہ گاڑی لانا اور لے جانا۔ شام اس نے ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر نوکری کر لی۔ حساب کتاب کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ ماں نے ایک دن اس کی راہ روکی۔

''سامان! آج کل تو اپنے آپ میں ہی نہیں ہے، خیر تو ہے؟''

''جسے زمانہ فراموش کر دے، اسے اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں ماں جی! میں بہت جلد شادی کر رہا ہوں۔ اسی لیے محنت بھی کرنا پڑ رہی ہے۔''

''کون ہے وہ؟ کس سے کر رہے ہو؟''

''کوئی بھی ہو۔ آپ نے تو ایک بلا میرے گلے میں ڈال دی۔ آخر مجھے بھی زندگی گزارنا ہے۔''

''بیٹے! میں مجبور ہوں۔ تمہیں یہ قربانی تاعمر دینی پڑے گی۔ احسان کی طرح تم اسے طلاق نہیں دے سکتے۔ بے شک تم دوسری شادی کر لو۔ اسے گھر کی نوکرانی ہی سمجھ لینا۔ دو جوڑے کپڑے اور روٹی دیتے رہنا۔''

''یہ زہر آپ کی خاطر میں نے پیا ہے ماں جی۔ آپ کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔''

''کہو بچے کیا چاہیے۔''

''مجھے سونا چاہیے۔''

''سونا..... کتنا سونا؟''

''پچیس تولے۔''

''اوئی ماں..... یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''یہ لڑکی والوں کا تقاضا ہے اور میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں ماں جی! وہ بہت حسین ہے بہت پیاری۔ آپ کے گھر میں آ گئی تو آنگن جگمگا اٹھے گا۔''

''مم..... مگر بیٹے! میرے پاس تو پندرہ تولے سونا ہے۔ جو میں نے تمہاری بہنوں کے لیے رکھا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے، دس تولے میں خود خرید لوں گا۔ آپ پندرہ تولے دے دیں۔''

''اچھا سامان! تم بے شک شادی کر لو۔ یہ وعدہ میں نے پہلے بھی کیا تھا۔ بس ہمارا نام نہ ہو۔ اور اسے طلاق بھی نہ دینا۔''

''ماں! کہہ جو دیا، ایسا ہی ہوگا۔''

اس نے قطعیت سے کہا۔ دوسرے دن ماں سے سونا لے گیا۔ کچھ جمع شدہ رقم تھی۔ پورے بیس ہزار میں دس تولے سونا خریدا اور زیب کے ہاں آ گیا۔

''امی! میں نے آپ کا حکم پورا کر دیا۔''

''ارے بیٹے میرا حکم کیسا۔ شادی کے بعد تو زیب بھی تمہاری ملکیت ہو گی، یہ سونا کیا ہے۔ مگر.....''

انہوں نے پوٹلی کھول کر چادر پر پھیلائی۔

''یہ تو پرانے ڈیزائن کے زیور ہیں۔''

''تو کیا ہوا، آپ نئے بنوا لیں۔ یہ مزید دس ہزار روپے ہیں زیب اپنی مرضی سے کپڑے وغیرہ خرید لے۔''

''ہاں بیٹا! میں نے زیب کے والد کو لکھ دیا ہے۔ ان کے آتے ہی شادی ہو جائے گی۔ اب ان

کے آنے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔"

سمان خوش ہو گیا۔ خوب صورت گھر اور خوب صورت ساتھی کے تصور نے اسے سرشار کر دیا۔

"امی! آپ تو میری مجبوریاں جانتی ہیں۔ میرے گھر والے اس شادی میں شریک نہیں لیکن وہ دل و جان سے راضی ہیں۔ یہ پرانے زیورات ماں جی نے ہی بھجوائے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! میں نے بھی تو اعتراض نہیں کیا۔ تم جانو اور تمہارا کام، جب مناسب سمجھو لے جانا اسے اپنے گھر۔ ورنہ یہ گھر بھی تو تمہارا ہی ہے۔"

"امی! یہ سب آپ کی محبت ہے۔ ورنہ....."

"نہیں۔ تم ہو ہی بڑے پیارے بچے اور سناؤ وہ تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"امی! اس کا کیا پوچھنا۔ گھر میں نوکرانیوں سے بھی بدتر حالت میں رہ رہی ہے۔ زہرا آپا کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال اسے۔" اس کے لہجے میں زہر بھر گیا۔

"چھوڑو بیٹے! زندگی میں بہت سی ناگوار چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ نے سچ کہا۔"

زیب اندر کمرے میں تھی۔ وہ اندر آ گیا۔ کتنی دیر مستقبل کی باتیں کرتا رہا۔ وہ پالش سے ناخن سجا رہی تھی، سفید مخروطی انگلیاں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ یہ وہ انگلیاں تھیں جنہوں نے سمان کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ وہ اس کی سرخ و سفید ہتھیلیوں کی لکیریں دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اپنی اور تمہاری زندگی۔"

"ان ہاتھوں میں؟ زندگی اللہ کے پاس ہے۔"

"کبھی کبھی وسیلہ انسان بھی بن جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"زندگی کا ہی نہیں موت کا وسیلہ بھی۔"

"لیکن تم تو میری حیات ہو۔ موت نہیں۔"

"کسے خبر؟"

"کس بات کی؟"

"موت و حیات کے فلسفے کی۔"

"میں یا تم فلاسفر نہیں انسان ہیں، صرف محبت کرنے والے۔"

زیب آج بے حد خاموش سی تھی لیکن سمان خوشیوں کی یلغار میں اس خاموشی کو محسوس ہی نہ کر سکا اور چلا آیا۔

☆☆☆

رات گئے گھر پہنچا۔ فدا بھائی اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔

"سمان! زندگی صرف پیسہ کمانے کا ہی نام نہیں ہے۔"

"کیا ہوا فدا بھائی؟"

"عطیہ سخت بیمار ہے اور تمہیں خبر ہی نہیں۔"

"اوہ! کب سے؟"

"کیسے شوہر ہو تم۔ بیوی سے اس قدر غافل۔"

وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے میں آ گئے۔ عطیہ اس کے بستر پر بے سدھ پڑی بخار میں جھلس رہی تھی۔

"یہ دوائیاں میں لے آیا ہوں۔ رات بھر خیال سے دیتے رہنا اور اگر زیادہ تکلیف ہو جائے تو مجھے بلا لینا۔"

وہ چلے گئے۔

عطیہ اس کے کمرے میں۔ اس نے تو اسے مدت سے اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ وہ عقبی کمرے میں جہاں صندوق وغیرہ رکھے تھے سویا کرتی تھی۔ آج مزے سے اس کے بستر پر براجمان تھی۔

"ہونہہ!" اس نے نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ دوائیاں کھول کر دیکھیں اور پاس پڑی میز پر پٹخ دیں۔ اور خود دوسرے پلنگ پر اوندھا سیدھا بستر ڈال کے سو گیا۔

"اس کم بخت کو بھی آج ہی بیمار ہونا تھا۔ یہ میری جان کی دشمن ہی ہے۔ اسے میری خوشیوں سے

خدا واسطے کا بیر ہے۔"

وہ منہ سر لپیٹ کر سو گیا۔

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو وہ بیٹھی دوائیاں الٹ پلٹ رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ دوائی پینے لگی تھی۔"

"نہیں مرو گی دوا کے بغیر۔ بہت شوق ہے تمہیں جینے اور مجھے جلانے کا۔"

"نہیں نہیں میں تو اس لیے پی رہی تھی کہ صبح فدا بھائی آپ پر خفا نہ ہوں۔"

سلمان نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سو گیا۔

صبح جاگا تو وہ ایک اور خوراک لے رہی تھی۔ سلمان کو ایک دم خیال آیا۔ جانے کیسے لی ہوگی اس نے دوا۔ جاہل نادان جو ٹھہری۔ پھر وہ خاموش رہا۔ بھلے مر ہی کیوں نہ جائے۔

فدا بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔

"اب کیسی طبیعت ہے عطو؟"

"ٹھیک ہوں بھائی جان۔"

"سلمان! دوا وقت پر دی تھی نا۔"

"جی ہاں بھائی جان! دے دی تھی دوا انہوں نے۔" عطیہ بولی۔

سلمان نے حیران ہو کے اسے دیکھا۔ فدا بھائی اس کی نبض دیکھ رہے تھے۔

"اب تو ٹھیک ہو عطو! واہ واہ بھئی، یہ کمال نہ دوا کا ہے نہ ڈاکٹر کا۔ سلمان کے ہاتھوں کا ہے۔ بخار بھاگ گیا۔"

وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

عطیہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ چلے گئے۔

"جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ دیتیں کہ میں نے خود پی لی تھی دوا۔ میں جانتا ہوں تمہاری مکاری، ایسی باتوں سے تم میرا دل نہیں جیت سکتیں۔ تمہارا یہ خیال ایک خواب ہی رہے گا حقیقت نہیں بنے گا۔"

وہ پیر پٹختا کمرے سے نکل گیا۔

صبح اسے جانا تھا۔ اپنے روٹ پر۔ شام کو درحبیب پر حاضری بھی ضروری تھی۔ اور پھر اسٹور بھی جانا تھا۔ آج اس نے دوپھیرے نہیں لگائے، فارغ وقت ملتان میں گھومتا رہا۔ صدر سے زیب کے لیے عروسی جوڑا بھی خرید لیا۔ خوب صورت بنارسی سوٹ جس کے کام دار دوپٹے پر نظر ہی نہ ٹھہرتی تھی۔ خوشی خوشی وہ اقبال ٹاؤن آیا۔ گاڑی روکی۔ ہارن دیا۔ اوپر کھڑکی کی طرف نگاہ کی۔ کھلی کھڑکی سے کسی نے نہ جھانکا۔ وہ گاڑی سے اتر کے اندر گیا۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ اس نے بیل بجائی۔ کوئی باہر نہ نکلا۔ وہ بیل بجاتا ہی رہا۔ سامنے والے فلیٹ سے کوئی باہر نکلا۔

"کیا بات ہے صاحبزادے! کیوں کھڑے ہو یہاں؟"

"جی، مجھے اندر جانا ہے۔"

"کہاں اس فلیٹ میں۔ میاں یہاں رہنے والے تو آج صبح ہی فلیٹ چھوڑ گئے۔"

"کیوں؟ کہاں گئے۔ یہ فلیٹ تو ان کا اپنا تھا۔"

"کرائے کا مکان اس وقت تک ہی اپنا ہوتا ہے جب تک آدمی اس میں آباد ہے۔ ان فلیٹوں کا مالک میں ہوں، وہ کرائے دار تھے۔"

"جی!"

"اور چلے گئے۔ بالکل اچانک ہی لیکن تھے بڑے ایمان دار، دنوں کا کرایہ بھی ادا کر کے گئے۔"

"آپ کو بتایا نہیں، کہاں گئے ہیں۔" وہ گھبرایا ہوا تھا۔

"نہیں میاں اور مجھے کیا پڑی ہے کہ ایک ایک کا پتا نشان پوچھتا پھروں۔ مسافر تھے آئے، چلے گئے۔"

سلمان پریشان ہو گیا۔

"نہیں نہیں۔ وہ ضرور میرے نام کوئی پیغام چھوڑ گئے ہوں گے۔"

"شاید ایسا ہو تم ساتھ والوں سے معلوم کر لو۔"

سلمان نے دوسرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیل دی۔ دروازہ

عورت نے کھولا۔ خاصی معمر عورت تھی۔
''دیکھیے خاتون! ساتھ والے فلیٹ والوں کی کوئی خبر۔''
''تم کون ہو بچے؟''
''جی۔ میں ان کا عزیز ہوں۔''
''ایسے کئی عزیز آج صبح سے اب تک آ چکے ہیں۔ لیکن میرے پاس ان کا کوئی پیغام ہے نہ پتا نشان۔ لگتا ہے تم بھی لٹ جانے والوں میں سے ہو۔''
''جی؟''
''ہاں ہاں۔ وہ سیٹھ کرمانی تو اب تک پولیس میں رپورٹ کرا چکے ہوں گے۔ پوری تیس لاکھ قربان کر چکے تھے شادی کے نام پر۔ تم نے کتنا لٹایا؟''
''جی کچھ بھی نہیں۔''
وہ پلٹ آیا۔ کتنی دیر سڑک پر کھڑا رہا۔ اسے پیسہ یا زیور لٹ جانے کا غم نہیں تھا۔ دھوکے کا غم تھا۔ زیب نے اسے محبت کے نام پر لوٹ لیا تھا۔ میٹھے زہر سے مارا تھا۔ اس کے جذبوں کا مذاق بے دردی سے اڑایا تھا۔
وہ گاڑی کی طرف آیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ بمشکل وہ گھر تک پہنچا۔
''ارے آج تو جلدی آ گئے بھیا!'' صغریٰ دروازے میں مل گئی۔ کبریٰ نے پوچھا۔ زہرا آپا حیران ہوئیں۔
عطیہ دھوپ میں رکھی چارپائی پر پڑی تھی۔ وہ کمرے میں جا گھسا۔ ماں دوڑتی دوڑتی اندر آ گئی۔
''کیا بات ہے سلو؟''
''کچھ نہیں ماں جی! طبیعت خراب ہے۔ آرام کروں گا۔''
وہ کپڑے بدلے بنا بستر میں گھس گیا۔ جوتے ماں نے اتارے۔
رات بھر وہ سسکتا رہا۔ عورت کی مکاری اور جفا کا دکھ نشتر کی طرح چبھ رہا تھا سینے میں۔ زیب کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ اس کی ادائیں پیار بھری باتیں۔
عطیہ حسب معمول اسی کوٹھڑی میں تھی۔

☆☆☆

صبح ہو گئی۔
فدا بھائی برآمدے میں تھے روز کی طرح اخبار کی سرخیاں پڑھتے۔
''خالہ! غضب ہو گیا۔'' وہ چلائے۔
''کیا ہوا فدا؟'' انہوں نے زور سے کہا۔
''دو عورتیں شہر کے بڑے بڑے آدمیوں کو لوٹ کر چلتی بنیں۔ لاکھوں روپے کے زیورات، لاکھوں روپے نقد۔''
''آئے ہائے وہ کیسے؟''
''خالہ! شادی کا جھانسہ دے کر اور کیسے۔ سیٹھ کرمانی کو تو میں بھی جانتا ہوں شہر کے بڑے رئیس ہیں۔ شادیاں رچانے کے شوقین ہیں۔ لڑکی حسین ہوگی، دھوکے میں آ گئے، لاکھوں روپے لٹا بیٹھے۔ لڑکی اور اس کی ماں لوٹ کر چلتی بنیں۔''
سلمان کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔ خالہ سن کر اندر دوڑیں۔
''سلمان بیٹے! وہ سونا کہاں ہے؟'' انہیں اپنی فکر ہونے لگی۔
''جہاں بھی ہو، آپ سے مطلب؟ یہ مجھ پر آپ کا قرض ہے۔ اتار کر ہی دم لوں گا۔ فکر نہ کریں۔'' وہ دھاڑا پھر رضائی لپیٹ کر سو گیا۔

☆☆☆

صدمے اور غم نے انتقام کی صورت اختیار کر لی۔ اب تو سلمان کو دنیا جہاں کی عورتوں سے نفرت ہو گئی۔ ہر چہرہ اسے زیب کا چہرہ لگتا۔
حسین اور بے باک عورتوں کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا۔ وہ ان سب کو گولی سے اڑا دے۔
زیب کی بے وفائی نے اسے ایک جفا جو سنگ دل ظالم اور ہرجائی کا روپ بخش دیا۔ اکثر اکیلی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا کرتیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نہ ایک عورت اس کے جال میں پھنس جاتی۔ دعوتِ نظارہ دے جاتی۔ اسے بے

وقوف بنانے کا سوچ کر۔ لیکن اب سلمان محبت سے پردل والا نوجوان نہیں ایک مکار شکاری تھا۔ اکثر امید فردا دے کر سودا طے کر لیتا اور دل بہلا کر بھول جاتا۔ اب تو وہ اس قدر ماہر کھلاڑی بن گیا کہ اسے سارے اسرار و رموز سے آگاہی ہوگئی۔ بدمعاشی کے اڈے۔ ان عورتوں کے ٹھکانے۔ ہر جگہ سے وہ آشنا تھا۔ عورت کی ایک ادا سے پل میں پہچان لیتا تھا کہ وہ کس قماش کی ہے۔

اس کا رویہ عطیہ کے ساتھ اور بھی تلخ ہوگیا۔ گھر والوں نے عطیہ کو مفت ہاتھ آنے والی نوکرانی تو سمجھا ہوا تھا۔ سلمان کی بے توجہی اور نفرت نے اسے سب کی نظروں میں گرا دیا۔ بڑے تو بڑے بچے بھی اس سے ناروا سلوک کرنے لگے۔ خالہ صبح ہی صبح اسے کان سے پکڑ کے اٹھا دیتیں۔

''رات کو بال بچوں نے تجھے نہیں جگایا۔ نہ شوہر کے ناز اٹھائے ہیں تو نے۔ جواب تک پڑی سو رہی ہے چل اٹھ کے جا باورچی خانے میں۔'' وہ باورچی خانے کی طرف چل دیتی۔

ناشتا بنا لیتی۔ ایک دو روٹیاں باقی ہوتیں تو صغریٰ پرات اپنی طرف کھینچ لیتی۔

''بھیا نے تجھے پکاتا دیکھ لیا تو ناشتا بھی نہیں کریں گے۔ ہٹ جا، میں خود ان کے لیے پراٹھا بناتی ہوں۔ تو جا کے صحن میں جھاڑو لگا۔'' اس کے لہجے میں حقارت ہوتی۔

وہ جھاڑو لگاتی اور برآمدے میں بیٹھا سلمان شیو کر رہا ہوتا۔ صغریٰ چائے کی پیالی لے آتی۔

''ناشتا کر لیں نا بھیا۔ آپ کے لیے میں نے خود بنایا ہے خستہ پراٹھا۔''

''سگی۔ جلدی سے میرے کپڑے نکال کر استری کر دے۔ دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بہن سے کہتا۔

ایک صبح صغریٰ کو زکام کی وجہ سے حرارت ہوگئی وہ بستر میں تھی۔ سلمان چائے، ناشتے اور کپڑوں کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ عطیہ نے جلدی جلدی ناشتا بنایا اور اس کے کمرے کی طرف گئی۔ الماری کھول کر کپڑے اور جوتا نکالا۔ ہاتھ میں پکڑے وہ برآمدے میں جا رہی تھی جہاں اونچی میز پر استری رکھی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' وہ سہم گئی۔

''جی، وہ آپ کے کپڑے.....''

سلمان نے ایک جھٹکے سے کپڑے اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

''تمہیں اپنے مریل ہاتھوں سے میرے کپڑے چھونے کی جرأت کیسے ہوئی۔'' اس نے تھپڑ جڑ دیا۔

آنکھوں میں آنسو جمے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ ایک ٹک غصے میں لال پیلے ہوتے سلمان کو دیکھتی رہی۔

''خبردار، جو آئندہ میرے کمرے میں بھی گھسیں تو، تمہاری منحوس صورت جس دن نظر آجائے دن بھی اچھا گزرنا محال ہو جاتا ہے۔'' وہ کپڑے لے کر باہر چلا گیا۔

عطیہ کوٹھڑی میں آئی اور چارپائی پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔

''کس کے مرنے کا ماتم کر رہی ہو؟ کس کے سوگ میں ہو؟ اللہ میرے چندا کو سلامت رکھے۔ رونا دھونا ہے تو کہیں اور چلی جاؤ۔'' خالہ نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کر دیا۔

''کمروں کی صفائی۔ صحن کی جھاڑو تمہارا باپ قبر سے آ کر نہیں کرے گا۔ یہ سب کر کے پھر بیٹھ کے رونا اپنے نصیبوں کو۔''

''خالہ۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''اپنا کام کرو۔ چونچلے دکھانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ کمرے سے نکل گئیں۔

عطیہ باہر آئی۔ سلمان خود ہی استری کر رہا تھا۔ اس نے عطیہ کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

☆☆☆

وہ تباہی کے راستے پر تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اب باقاعدگی سے بازار حسن بھی جانے لگا۔

اپنی کمائی بازاری عورتوں کے عشوہ وغمزہ پر لٹانے لگا۔ بُرے لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر جوا بھی کھیلنے لگا رفتہ رفتہ پینے بھی ـــــ لگا۔ راتوں کو دیر سے گھر میں داخل ہوتا۔ سب لوگ سو رہے ہوتے۔ نشے میں دھت وہ اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ عطیہ دروازے میں، برآمدے میں، باورچی خانے میں کہیں نہ کہیں مل جاتی۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''دروازہ خالو نے بند کر دیا تھا۔ جاگ رہی تھی آپ کو پریشانی نہ ہو۔''

''میری پریشانی کی فکر نہ کیا کرو اور، اور میری سب سے بڑی پریشانی تو تم خود ہو۔'' اس نے سختی سے عطیہ کا کندھا اپنے ہاتھ میں جکڑا۔

''کیا تم میری جان نہیں چھوڑ سکتیں خدا کے لیے کہیں دور چلی جاؤ۔ میری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔'' عطیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کہاں جاؤں۔ اس گھر کے سوا کہاں ہے میرا ٹھکانا؟'' وہ رونے لگی۔

''جہنم میں جاؤ۔ وہ بہتر جگہ ہے تمہارے لیے۔'' وہ ہنس دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

عطیہ اسی کوٹھڑی میں اپنی چارپائی پر آ گری۔ رونا دھونا، گزرے کئی سالوں سے اس کا مقدر تھا۔ اب بھی رونے لگی۔

زندگی نے اسے ٹھوکروں اور نفرتوں کے سوا دیا ہی کیا تھا۔ مگر کیسی عجیب بات تھی۔ سلمان کے تحقیر آمیز سلوک کے باوجود وہ اس سے ایک پل کے لیے نفرت نہ کر سکی تھی۔ اس کے دل میں سلمان کی محبت کا پودا لہلہا رہا تھا اور جڑیں روح سے جسم تک پھیل چکی تھیں۔ سلمان کی کج ادائی، بے رخی، غصہ۔ جھنجلاہٹ سب ہی اسے بے حد عزیز تھے۔

اس کی غیر موجودگی میں اس کے سارے کام وہ خود کیا کرتی۔ اس کے کمرے کی ایک ایک شے کو محبت کے ساتھ صاف کرتی۔ احتیاط سے رکھتی۔ سالن انتہائی توجہ سے پکاتی۔ اس کے جوتے پالش سے چمکاتی۔

اپنے لیے تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ ہوتا بھی تو وہ کب پہنتی اوڑھتی، خود کو سجاتی سنوارتی۔ یہ سب کچھ تو ایک عورت اپنے مرد پر ہی کرتی ہے۔ مرد کے ستائشی الفاظ سننے کے لیے اور سلمان کے پاس تو اس کے لیے طنز و تشنیع کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ اس نے تو آج تک ایک پیسہ اس کی ذات کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ خالہ جو بھی لا دیتیں وہ پہن لیتی۔ خالی پانی سے منہ دھو لیتی۔ بال الجھے سلجھے رہتے تو اسے خبر ہی نہ ہوتی۔ بس دن رات گزرتے جا رہے تھے۔ اس کے دامن میں تلخیاں، حسرتیں اور ارمان ڈالتے ہوئے وہ بے زبان ضرور تھی یا سمجھ نہیں۔ کئی راتوں سے وہ سلمان کو دیکھ رہی تھی۔ ہوش سے بیگانہ۔ سرخ آنکھیں، بکھرے بال۔ کپڑوں سے جسم کی صفائی ستھرائی سے بے نیاز۔

ایک دن اس نے پوچھ لیا۔ تو لگا قیامت آ گئی ہے۔

''تمہیں کس نے حق دیا مجھ سے سوال کرنے کا۔ خبردار جو آئندہ جرأت کی۔'' وہ گرجا۔

''میں..... میں تو.....''

اس نے ایک بھرپور تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔

''مجھے اپنے اچھے برے کا خود پتا ہے۔ دفع ہو جاؤ، دور ہو جاؤ۔ میری نظروں سے ..... آئندہ نہ دیکھوں یہ منحوس صورت۔'' وہ ڈر کے کوٹھری میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

کئی دنوں سے وہ ایک بدنام زمانہ بدقماش عورت تاجی کے ساتھ شب و روز گزار رہا تھا۔ جان بوجھ کر لٹا جا رہا تھا۔ اس عورت کے تعلقات کئی ایک سے تھے۔ ان میں سے ایک شہر کا مشہور غنڈہ گاما تھا۔ گاما اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا بلکہ اس سے نکاح کر کے اپنے گھر رکھنا چاہتا تھا اور وہ مسلسل اسے دھوکا دے رہی تھی۔ گامے نے اڑتی اڑتی سنی بھی کہ ایک خوبرو یگن

ڈرائیور کو تاجی نے اپنے دام میں الجھا رکھا ہے اور وہ گامے کی غیر موجودگی میں تاجی کے گھر پایا جاتا ہے۔

گاما اس کو تلاش کرتا کرتا ویگن اسٹینڈ آ گیا۔

"کیوں بے دو ٹکے کے ویگن ڈرائیور..... سنا ہے، تیرا آنا جانا تاجی کے ہاں ہے۔"

"ہاں ہے..... پھر.....؟" سلمان کے اعصاب پر رات کا نشہ سوار تھا۔ "مگر تم کون ہو پوچھنے والے؟ مامے لگتے ہو تاجی کے..... ارے ایسی عورتوں کے پاس تو سب آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی بہن نہیں ہوتی وہاں۔" سلمان ہنس دیا۔

گامے نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کر دیا۔ سلمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے جوابی گھونسہ مارا۔

"سالے! تیری یہ جرأت"

گامے نے ایک پل میں پستول نکالا اور دوسرے پل سلمان کے سینے میں گولی اتار دی۔ پل بھر میں لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔ گاما پستول لہراتا وہاں سے فرار ہو گیا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

"ارے یہ تو اپنا سلمان ہے۔ کس نے مارا اسے؟" مینیجر وہیں آ گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

"جلدی کرو..... بھاگو..... اسپتال لے چلو۔ غضب ہو گیا دن دہاڑے قتل..... ایک شریف اور جوان آدمی کا قتل۔"

ایک بولا..... دوسرا کوئی سمجھ دار آدمی تھا۔

"صبر کرو..... صبر کرو پہلے زخمی کی فکر کرو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔ ابھی زندہ ہے، شاید بچ جائے۔"

کسی نے ایمبولینس کے لیے فون کر دیا تھا۔ فوراً ایمبولینس آ گئی۔ اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایمرجنسی سے وہ آپریشن تھیٹر پہنچا دیا گیا۔

یہ لرزہ خیز خبر گھر میں بھی پہنچ گئی۔ کہرام مچ گیا۔ سب روتے پیٹتے ہسپتال چلے گئے۔ کسی نے عطیہ کی طرف دیکھا تک نہیں، عطیہ کے پیروں کا دم نکل گیا۔ وہ کتنی دیر بے ہوش پڑی رہی، ساتھ کے گھر کی ماں جی آئیں، انہوں نے اسے ہوش میں لانے کے لیے کئی ترکیبیں استعمال کیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ ان سے لپٹ کے رونے لگی۔

"عطو تو ہسپتال نہیں گئی؟"

"کوئی لے کے ہی نہیں گیا ماں جی..... ویگن بھر گئی تھی، میں باہر کھڑی رہی۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔"

"چل ہم دونوں چلتے ہیں۔"

وہ اسے ساتھ لے گئیں۔ عطیہ ویران آنکھوں کے ساتھ ایک ایک کو دیکھتی رہی۔ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا نہ اسے تسلی تشفی دی۔ پورا دن اور پوری رات وہ ایک کونے میں بھوکی پیاسی بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی، روتی اللہ سے التجا کرتی۔

پورے چوبیس گھنٹے بعد سلمان نے آنکھ کھولی۔ گولی اس کے دل سے تھوڑی سی دور رہ گئی تھی۔

عطیہ کو یہ سن کر جھرجھری سی آ گئی۔

گلی محلے میں، شہر میں یہ بات پھیل گئی تھی۔ اقدام قتل کی اس واردات کا سبب ایک عورت تھی۔ بدنام زمانہ عورت..... سلمان کا کردار تبصرے کی زد میں آ گیا۔ لوگ جو جانتے تھے وہ بھی اور جو نہ جانتے تھے وہ اپنی طرف سے بنا کے ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

عطیہ دوسرے دن گھر آ گئی۔ گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، کسی کو اپنی خبر نہ تھی۔ عطیہ دن رات سجدے میں گری اس کی زندگی کی بھیک مانگتی رہی۔ ختم قرآن، دورد، دعائیں جو بھی اس سے ہو سکا پوری پوری رات جاگتے گزار دیتی۔

پورے پندرہ دن سلمان ہسپتال میں رہا۔ ملنے جلنے سے بالکل قاصر تھا۔ ڈاکٹر نے چھٹی دے دی۔ علاج پرہیز سب بتا دیا، ہلنا بھی منع تھا۔ سلمان گھر آ گیا۔ عطیہ کا جہان آباد ہو گیا۔ اس کی وجہ سے رشتے داروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ لوگ برابر عیادت کو آ رہے تھے۔ سلمان بڑا نادم اور دل گرفتہ سا تھا۔ یہ تو بین کم تو نہ تھی کہ یہ زخم اس نے یک فاحشہ عورت کی خاطر کھایا تھا۔ گاما گرفتار ہو گیا۔ جیل چلا گیا۔ احسان بھائی نے

کہا، پیسہ جتنا بھی خرچ ہو، سلمان کی صحت کا مکمل خیال رکھا جائے اور مجرم کو بھی سزا ملنی چاہیے۔

عطیہ دن رات اس کی خدمات پر مامور تھی۔

وہ تو آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ کبھی اس کا سر دباتی، کبھی ٹانگیں، وقت پر جوس، یخنی، دوا ہر شے اس کے ذمے تھی۔ کوئی کچھ نہ بول سکا، یہ سارے کام فدا بھائی نے اس کے ذمے لگائے تھے اور گھر میں عزیز و اقارب بھی روز موجود ہوتے تھے۔

رات کو وہ اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی رہتی۔ ذرا ہلتا جلتا کچھ کہتا فوراً اس پر عمل کرتی۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد اس کا حلق خشک ہو جاتا۔ پانی مانگتا۔ عطیہ اسے اپنے سہارے بٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیتی۔ ایک نظر اسے دیکھ کر پانی پی کر وہ پھر سو جاتا۔

ایک ماہ بعد وہ کافی حد تک روبصحت ہو گیا تھا۔ صبح صبح وہ گرم پانی سے اس کا منہ دھلا رہی تھی۔ وہ ہاتھ آگے کیے بچوں کی طرح اس کا منتظر تھا۔ عطیہ نے صابن اس کے ہاتھ پر لگا کر اپنا ہاتھ اس پر رگڑا۔ پھر ہاتھ دھلائے۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارے، منہ ہاتھ دھلا کر تولیے سے رگڑ کے صاف کیے۔

"اگر ہمت ہو تو شیو کا سامان لے آؤں، شیو کر لیجیے۔" سلمان اسے دیکھتا رہ گیا۔ مسکرا کے بولا۔

"شیو بھی تم ہی بنا دو..... اور تو سب کچھ کر لیتی ہو۔"

عطیہ مسکرا بھی نہ سکی۔ سر جھکا لیا۔

"عطو! دن رات میری خدمت میں لگی رہتی ہو۔ کبھی آرام بھی کر لیا کرو۔"

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"میں تو اب ٹھیک ہوں عطو! تم رات بھر جاگا نہ کرو۔ پانی میرے سرہانے رکھ دیا کرو، اٹھ کر خود ہی لے لوں گا۔ باقی سب تو چین سے سوتے ہیں، تم بھی کیوں جاگو؟"

"مجھے نیند ہی نہیں آتی۔"

"کیوں؟" اس نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"بس ویسے ہی....." وہ پانی کا بڑا تسلہ اٹھانے لگی۔

"عطو! آج میں پراٹھا کھاؤں گا۔ توسٹ نہیں۔"

"جی..... مم..... میں..... بنا دوں..... آپ کے لیے؟"

"ارے اتنے کام کر رہی ہو، یہ احسان بھی کر دو۔ اکتا گیا ہوں پرہیزی غذاؤں سے۔"

"میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا جی۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے۔"

"اچھا اور کیا کیا پوچھا تھا؟"

"اور کچھ نہیں۔"

"تو چلو، بنا کے لے آؤ۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

وہ خوش خوش باورچی خانے میں چلی آئی۔

پراٹھا بنا کے انڈے کے آملیٹ کے ساتھ وہ ٹرے کمرے میں لے آئی۔ ابھی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ کبریٰ اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔

"مجھے کہا ہوتا بھیا! کسی کام کا نہیں ہوگا آملیٹ۔ آپ رکیں، میں پھر بنا دیتی ہوں۔"

"نہیں کبریٰ! رہنے دو۔ آج عطو کے ہاتھوں کا کھا لیتے ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی تاثیر ہے۔ دیکھتے ہیں، ذائقہ بھی ہے یا....." کبریٰ نے حیران ہو کے بھائی کو دیکھا پھر عطیہ کو اور باہر چلی گئی۔

سلمان ناشتا کرنے لگا۔

"کوئی مزا نہیں..... سچ کہہ رہی تھی کبریٰ! خیر اب تو کھانا ہی پڑے گا۔"

عطیہ بجھ سی گئی۔ سلمان مسکرانے لگا۔

اک روز کہنے لگا۔ "عطو! کیسے حلیے میں رہتی ہو۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ صورت دینا رب کا کام ہے لیکن صفائی ستھرائی تو انسان کا اپنا مسئلہ ہے، چلو ابھی جا کے نہاؤ۔ صاف کپڑے پہنو۔ مجھے بستر پر لیٹے لیٹے روزانہ کپڑے بدلواتی ہو اور خود....."

شام کو اسے نئے سوٹ میں ملبوس دیکھ کر خالہ نے منہ بنا لیا۔

''سلو کی بیماری کی خوشی میں نیا جوڑا پہنا ہے۔ اتار کم بخت! میرے سینے پر مونگ دلتی ہے کمینی۔''

وہ پھر کوٹھڑی میں گھس گئی۔ کپڑے بدلنے کا ہوش نہ رہا۔

جانے کب سمیرا بلانے آ گئی۔

''پھوپھو! سلمان ماموں بلا رہے ہیں۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چلی آئی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اس نے کمرے میں روشنی میں۔

''کہاں رہ گئی تھیں؟ سر میں درد ہو رہا ہے۔ گولی دے دو۔ ادھر دراز میں ہو گی۔''

عطیہ نے سامنے دیکھا' سوجی آنکھیں سلمان کو نظر آ گئیں۔

''عطو! تم روتی رہی ہو؟''

''جی نہیں۔''

''جھوٹ بولتی ہو' کھاؤ میری قسم..... رکھو میرے سر پر ہاتھ۔''

''جی.....وہ.....وہ.....وہ.....''

''ہاں ہاں کہو نا۔''

''آپ نے کپڑے بدلنے کو کہا' خالہ ناراض ہو گئیں کہ کپڑے کیوں پہنے۔''

''ماں نے کہا کہ کپڑے نہ پہنو۔ کیوں کس کے سوگ میں؟ میں تو زندہ ہوں' مرا تو نہیں..... ادھر آؤ۔''

وہ رک گئی۔

''ادھر میرے پاس آؤ۔''

اس کے دراز بال کمرے پر لہرا رہے تھے۔

''کنگھی کیوں نہیں کی؟ تیل بھی نہیں لگایا۔''

وہ رونے لگی' آنسو ٹپ ٹپ اس کے دامن میں گرنے لگے۔

''کیوں رو رہی ہو؟''

''بس ویسے ہی۔'' ڈر کے مارے اس نے جواب دیا۔

''آئندہ مت رونا۔ اور سنو..... لگتا ہے کھانا تمہیں کھاتا ہے' تم کھانا نہیں کھاتیں۔ اتنی کمزور ہو' کھایا پیا کرو۔ میرے ساتھ ہی کھانا کھایا کرو۔ دیکھوں گا کیسے نہیں کھاتیں۔''

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سلمان نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''عطو!'' اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

''جی.....''

''تمہیں مجھ سے پیار ہے؟''

عطو نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ سلمان نے اس کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ سے اونچی کی۔

''بہت پیار ہے تمہیں مجھ سے۔ میری زندگی کے لیے کتنی دعائیں مانگی تھیں تم نے..... بولو پیار ہے نا۔''

عطو کا اقرار آنسوؤں کی صورت اس کے سامنے تھا۔

''آپ کے بغیر میں کیسے جیتی۔ میرے نہ سہی' آپ زندہ تو رہیں' خوش تو رہیں۔ میں تو آپ کو خوش دیکھ کر خوش رہ لوں گی۔ میرا کیا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلمان ایک دم اٹھ بیٹھا۔ جا کر دروازہ بند کیا۔ اس کی طرف آیا۔

''عطو.....تم.....تم.....تم.....''

اس نے عطیہ کے گھنیرے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

''مجھے معاف کر دینا عطیہ! میں نے تم سے زیادتی کی' حسن کی تلاش میں بھٹکتا پھرا۔ حسن تو اصل میں سیرت کا ہوتا ہے۔ تم تو ایک عظیم لڑکی ہو۔ باوفا بیوی ہو۔ میں نے تمہارے دامن میں کانٹے بھر دیے' پھر بھی تم نے مجھے اپنی محبت سے مالا مال کر دیا۔ تم کتنی اچھی ہو عطیہ! کتنی اچھی..... مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ صرف تمہارا ہو جانے کا صرف تمہارا.....''

وہ اس کے بالوں پر اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا اور عطیہ دم بخود کھڑی تھی۔ پسینہ پسینہ' ہاتھ پیر سرد ہوئے جا رہے تھے۔ یہ سب کیا تھا' ابر رحمت تھا جو اس کی

خزاں زدہ زندگی پر برس گیا۔ سلمان کے لب اس کی پیشانی پر جھکے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

''اے خدا یہ التفات' یہ توجہ' یہ پیار کوئی خواب نہ ہو۔''

☆☆☆

صحت مند ہوتے ہی سلمان سعودی عرب چلا گیا۔ ایک یورپی فرم میں اسے جاب مل گئی۔ وہ اسے چھوڑنے ایئرپورٹ تو نہیں گئی پر جاتے جاتے وہ اس سے تنہائی میں ملا ضرور۔

''عطو! اپنا خیال رکھنا۔ ٹھیک سے کھانا پینا' اور گھر کے کام کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ ڈالنا۔''

''جی اچھا۔''

''میں تمہیں فون بھیجوں گا۔ ساتھ والی ماں جی سے استعمال کرنا سیکھ لینا۔ ٹھیک ہے۔''

''جی۔''

''اور ہاں یہ پیسے رکھ لو۔ اس وقت میرے پاس اتنے ہی ہیں۔ جاتے ہی تمہارے لیے چیزیں اور کپڑے بھیجوں گا۔''

اس سے رخصت ہو کے وہ باہر آ گیا۔

عطو کو خبر نہ تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ سلمان گھر والوں سے کچھ کچھ خوف زدہ تھا۔ بس اسی سبب اظہار نہ کرسکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اسے عطیہ سے نفرت ہے۔ اس نے ایک دن کے لیے اسے وہ حق نہیں دیا جو بیوی کو حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆

عطو کی قسمت میں سلمان کے قرب کی چند راتیں بھولے سے آ گئی تھیں اور یہ راتیں اس کی زیست کا سرمایہ تھیں۔ ان راتوں کے بدلے اللہ نے اسے ایک نعمت بخش دی تھی جس کی موجودگی سے وہ بے خبر تھی' انجان تھی۔ سلمان چلا گیا۔ عطیہ کی زندگی اسی پرانی ڈگر پر چلنے لگی۔ دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کام کرنا اور رات کو سو جانا۔ وہ روزانہ سلمان کے کمرے کی صفائی کرتی۔ اس بستر کو پہروں تکا کرتی جہاں اس کی محبت نے سلمان کو جیت کر اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا۔ اس کے رخساروں کی زردی' سرخی میں بدل جاتی اور وہ گھبرا کر باہر نکل آتی۔

وہ کمزور تھی یا بیمار' مگر اسے نہ کبھی چکر آئے تھے نہ ابکائی۔ اب صبح صبح اٹھتے ہی ابکائیاں آنے لگتیں، دل کمزور ہونے لگتا۔ سانس رکنے لگتی۔ سر چکرا جاتا۔ وہ ہمت کر کے باورچی خانے میں آ جاتی۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتی۔

☆☆☆

ایک دن سب گھر والے کسی شادی میں گئے تھے۔ کالو اور عرفان اندر کمرے میں سوئے تھے' وہ ماں جی کے پاس آئی۔

''کیا حال ہے بیٹی؟''

''ماں جی! میرا جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا کچھ کھالوں' تے آ جاتی ہے۔ سر چکراتا ہے' جانے کیا ہوگیا ہے۔''

ماں جی نے اس کی کلائی تھامی۔

''ارے تجھے تو بخار ہے۔ اسی لیے چکر آ رہے ہیں۔'' وہ وہیں گر سی گئی۔

''عطو..... کیا ہوگیا ہے تجھے..... بیٹی خود کو سنبھالا۔''

''ماں جی..... ماں جی..... میرا دل.....'' ماں جی نے اپنے میاں کو پکارا۔

''اجی سنتے ہو۔ ذرا رکشہ تو پکڑ لاؤ۔ عطو بے ہوش ہوگئی ہے۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ بچی جلادوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے' کسی دن ختم ہو جائے گی۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب فوراً بھاگے۔ رکشہ لے آئے۔ میاں بیوی نے اسے پکڑ کر رکشے میں بٹھایا۔

ڈاکٹر خان نے اسے پوری توجہ سے دیکھا۔ چیسٹ ایکسرے لکھ دیا۔

''بی بی! آپ کو کب سے بخار ہے؟''

''جی پتا نہیں۔'' عطیہ نے جواب دیا۔

''ماں جی! آپ جلد یہ ایکسرے کرا لائیں۔ بخار صرف انہیں ہی نہیں ان کے بچے کو بھی نقصان

دے سکتا ہے۔"

"بچے کو؟" ماں جی حیران تھیں۔

"ہاں ہاں..... ہونے والے بچے کو۔ مریضہ پریگننٹ ہیں۔"

ماں جی نے عطیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔

ایک معصوم بچے کا تصور اس کے اندر گدگدی کرنے لگا۔ لب مسکرانے لگے۔

"آپ ایسا کریں' انہیں میری مسز کو دکھائیں۔" مسز خان گائناکولوجسٹ تھیں۔

ماں جی اسے دوسری طرف لے جارہی تھیں۔

"عطو! یہ سب کیا ہے؟"

وہ شرما گئی۔

"اے اللہ تیرا احسان ہے۔ عطو کے سارے دکھ ٹل جائیں گے۔"

ڈاکٹر مسز خان نے اسے چیک کیا۔ اس کے لیے دوائیاں تجویز کیں۔ دوسرے دن الٹراسائونڈ دکھایا گیا۔ پھیپھڑے میں تھوڑا سا نقص تھا۔

ماں جی گھبرا گئیں۔

"کوئی ایسی بات نہیں ماں جی! یہ تو معمولی سی کمی ہے ورنہ آخری اسٹیج پر پہنچی ہوئی ٹی بی کا بھی علاج ممکن ہے' انہیں خوش رکھا کریں۔ یہ سب کچھ ذہنی پریشانیوں کے سبب ہوا ہے۔"

علاج پر سارے پیسے ماں جی نے ازخود خرچ کیے' وہ سارے حالات جانتی تھیں۔

سلمان نے فون پر کہا۔

"عطیہ کچھ روز کے لیے اپنی بہن کے گھر چلی جائے۔"

سب حیران تھے۔ عرفان اسے چھوڑنے گیا۔ ماں جی نے دوائیوں اور ہدایتوں کے ڈھیر اس کے ساتھ کردیے۔ گھر میں کسی کانوں کان خبر نہ تھی۔

صفیہ آپا اسے دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ اس کی خاطر مدارت کرنے لگیں۔ تازہ مکھن' خالص دودھ' مرغیاں' سبزیاں' پھل ہر شے اس کے سامنے ڈھیر کردی۔

"عطو ماں بننے والی ہے۔" اس کی خبر صفیہ آپا کو بھی ہوگئی۔ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ دوا نے' غذا نے' محبتوں نے اپنا کام دکھایا۔ ایک ماہ رہ کے وہ گھر لوٹی تو کوئی سے پہچان نہ سکا۔ سوکھی چرخ عطو کی جگہ صحت مند عطو نے لے لی تھی۔ چہرے کے داغ دھبے مٹ گئے۔ رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی۔ ہونٹ قرمزی ہوگئے۔ آنکھوں میں ممتا کا نشہ ڈولنے لگا۔ پورے پانچ ماہ گزر رہے تھے' اس میں جسمانی تبدیلیاں آنے لگیں۔ اسے دیکھ کر شک تو پہلے تھا۔ اب تو یقین ہوگیا۔ خالہ نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"کتیا! میں بھی کہوں تیری ادائیں ہی نرالی ہوگئی ہیں۔ تو صفیہ کے ہاں بدمعاشی کرنے گئی تھی۔ بول یہ کیا کرتوت کرکے آئی ہے۔"

"خالہ! میں نے سب کچھ سنا ہے۔ یہ الزام برداشت نہیں کروں گی۔" وہ ایک دم اٹھی اور خالہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"اس کا جواب اپنے بیٹے سے لیجیے۔ وہ بتادے گا۔"

"مت لے نام میرے بیٹے کا' اس نے تو کبھی تیرے منہ پر تھوکا ہی نہیں۔ ابھی فون کرتی ہوں۔"

"ضرور کیجیے اور پوچھیے اس سے۔"

"وہ تو پوچھ لوں گی۔ پر تو ابھی یہاں سے دفعان ہوجا۔"

"یہ میرے شوہر کا گھر ہے تو میرا گھر ہے' جب تک وہ نہ کہے، میں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتی۔"

ممتا نے ایک بزدل اور دبولڑکی کو جرأتیں بخش دی تھیں۔

"کیسے نہیں جاتی۔ میں تیرے کرتوت فدا کے سامنے کھولوں گی۔"

"وہ تو ہیں ہی بدھو! آپ کے ہاتھوں میں ناچنے والی کٹھ پتلی۔ وہ میرے بھائی ہوتے تو میرے ساتھ ایسا ظلم ہوتا۔ آج آئیں تو سہی وہ۔ میں ان

سے بھی گئے سالوں کا حساب مانگوں گی۔ آپ نے مجھ پر ظلم کی انتہا کردی۔ ایک بیٹے نے مجھے ٹھکرایا تو اپنی بیٹی کا سہاگ قائم رکھنے کے لیے دوسرے بیٹے کے پلو سے باندھ دیا۔ اس کی ٹھوکروں میں رکھ دیا۔ اس کی نفرت نے' آپ کے رویے نے مجھے زندہ درگور کردیا۔ وہ غلط راستوں پر چلتا موت کے منہ میں جا پہنچا۔ آپ نے اسے روک ٹوک نہ کی' صرف میری وجہ سے کہ وہ میرا ہو کر نہ رہ جائے۔ خالہ گرتی ہوئی عمارت کو بچانے کے لیے ستون کی حفاظت بھی ضروری ہوتی ہے مگر آپ نے تو ایک پل کو بھی مجھے ہمدردی اور پیار کا مستحق نہ جانا۔ بھائی تو چھینا ہی تھا' شوہر کو بھی میرا نہ ہونے دیا۔ تقدیر نے اس کے پیار کا ایک پھول میری جھول میں ڈال دیا ہے تو آپ اسے گناہ کہنے لگی ہیں۔ آپ کو ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ اللہ کا خوف کھانا چاہیے۔''

فدا بھائی جانے کہاں سے آگئے۔

''کس نے تم سے ایسا کہا ہے عطو؟''

عطیہ رونے لگی۔ فدا نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھے۔

''خالہ! ماں جی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ غضب خدا کا میری بہن بی بی جیسے مہلک مرض کا شکار ہونے کو تھی اور میں انجان تھا۔ عطو کو آرام کی ضرورت ہے اور آج سے یہ گھر کا کام نہیں کرے گی۔ اس کی دوائیاں آپ پر بھاری ہوں تو ہوں' مجھ پر نہیں ہیں۔ چلو عطو! میرے کمرے میں۔''

وہ اسے اپنے کمروں کی طرف لے آئے۔

☆☆☆

ڈیڑھ دو ماہ کے مسلسل علاج اور آرام نے اسے نکھار دیا۔ وہ خوش تھی' بے حد خوش تھی۔ فدا بھائی کی تاکید کے باوجود کام میں مگن رہتی بھر بھر بالٹیاں پانی لاکر فرش دھوتی۔ کمرے صاف کرتی۔ کبھی کھانا بنالیتی۔

گھر میں سب کو چپ لگ گئی تھی۔ کوئی سلمان کو فون کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

ان ہی دنوں سلمان اور احسان بھائی کا کوئی ملنے والا آیا تو انہوں نے اس سے کافی سامان بھجوایا۔ انگوٹھیاں' بندے' جاپانی سوٹ' بڑھیا صابن' پرفیوم' کئی چیزیں۔ سامان پرچیٹیں لگی تھیں۔ یہ سامان زہرا بھابھی کے لیے' صغریٰ کے لیے' خالو کے لیے' فدا بھائی کے لیے' چھوٹے بھائیوں کے لیے۔ گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔ عطو ایک کونے میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ جب بھی کبریٰ کوئی چیز سوٹ کیس سے نکالتی' عطو کا دل دھڑک اٹھتا۔

''یقیناً یہ سوٹ میرا ہوگا۔''

صغریٰ پرچی پڑھتی۔

''کبریٰ بی بی کے لیے۔''

وہ مایوس ہوجاتی۔ بات چیزوں کی نہیں' یاد رہ جانے کی تھی تو گویا وہ سلمان کو یاد ہی نہ رہی تھی۔ دل میں ہوتی تو یاد رہتی۔

تو..... تو..... سلمان کی وہ پیار بھری باتیں۔

چندراتوں کی وہ ملاقاتیں۔

وہ سب کیا تھا؟

''پگلی!'' اس نے خود کو مخاطب کیا۔

''وہ تو ایک جذبہ ضرورت تھا اور ضرورت انسان کو جھکا دیتی ہے۔''

وہ تو ایک مرد کی فطری احتیاج تھی۔ تم اس کی تنہائیوں میں داخل ہوگئی تھیں۔

احتیاج کے ہاتھوں مجبور وہ تم سے دامن نہ بچا سکا۔ اس رات مدت بعد وہ پھر روتی رہی۔ صبح صبح فدا بھائی نے اسے بلا بھیجا۔

اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے عطو؟''

''کچھ نہیں۔''

''مجھے پتا ہے' تو کیوں اداس ہے۔ سلمان نے تیرے لیے کچھ بھی نہیں بھیجا۔ ارے پگلی! مت رو۔ تیرا تحفہ میرے پاس ہے۔ سلمان نے تیرا ویزا بھیجا ہے۔''

''ویزا..... اوہ!''

وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''میرا ویزا.....؟''

''دو دن میں پاسپورٹ بنوا کر تجھے روانہ کر رہا ہوں۔ ماں جی نے شاید فون پر اسے خوش خبری دی ہے کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس وقت سے وہ بے چین ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے۔''

''فدا بھائی! میں چاہتا ہوں جب میرا بچہ اس دنیا میں پہلی سانس لے تو اس کے سر پر باپ کا محبت بھرا ہاتھ ضرور ہو۔ عطیہ میری بیوی ہے۔ ایسے وقت میں اسے میری ضرورت سب سے زیادہ ہوگی۔''

عطیہ مارے خوشی کے بے ہوش ہونے لگی۔

☆☆☆

جدہ ایئر پورٹ پر وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ عطو اسے پہلی نظر میں پہچان چکی تھی۔ لیکن وہ مسلسل ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ قرمزی سوٹ میں قرمزی دوپٹا سینے پر اوڑھے کسی میک اپ کے بنا وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سلمان نے ایک نظر اسے دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ پریشان ہوگئی۔

''سلمان..... سلمان.....''

گھبرا کے اس نے پکارا۔ سلمان نے حیران ہو کے اسے دیکھا۔ لمحہ بھر بعد پہچان کے سائے واضح ہوئے۔

''عطو..... عطو..... یہ تم ہو تم..... یعنی میری عطیہ۔''

اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس سے بے خبر کہ وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہے۔

سلمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ جنگلا پار کر کے اس کے قریب آ گئی۔

ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

''میں تو تمہیں پہچان ہی نہ پایا۔'' وہ جھینپا جھینپا سا تھا۔

''ماں جی نے بتایا تھا تمہارے بارے میں اور یہ بھی کہا تھا کہ دیکھو گے تو پہچان بھی نہ پاؤ گے۔ میں نے سوچا ایک ننھے وجود نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہوگا۔ یقین مانو، میں کسی ہڈیوں کے ڈھانچے کی تلاش میں تھا۔ خبر نہ تھی کہ.....''

عطیہ مسکرا دی۔

اس نے ایک گاڑی کے پاس رک کر اسے دیکھا۔

''یہ نئی گاڑی میں نے صرف تمہارے لیے خریدی ہے عطو! صرف تمہارے لیے۔''

اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ عطو جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے عطیہ کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے سوچا تھا عطو! اپنے پیار کی بارش سے تمہارا تن من بھگو دوں گا۔ تر و تازہ کر دوں گا تمہیں، پر تمہارے لیے تو چند چھینٹے ہی کافی رہے۔ قانع لڑکی ہونا میں حسن صورت کی چاہ میں تم سے دور نکل گیا۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ زندگی کے اجالے سیرت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ پچھلی زندگی کو خواب سمجھ کر بھلا دینا عطو! قسم پیدا کرنے والے کی، اپنی ہر خطا کی سزا میں تمہیں وہ محبتیں دوں گا جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ اپنے مجرم کی خطائیں ہو سکے تو معاف کر دینا۔ سنا ہے کہ معاف کر دینے سے اپنے دل کو سکون مل جاتا ہے اور مجرم پر احسان کا بھاری بوجھ آن پڑتا ہے۔ میں تمہارے احسان کے بوجھ تلے بھی سکون محسوس کروں گا۔ بس ایک بار کہہ دوں کہ میں نے معاف کیا۔''

''معافی تو گناہوں کی ہوتی ہے۔ وہ تو آپ کی بھول تھی۔ ایک چھوٹی سی بھول اور سلمان..... بعض لوگ اتنے اچھے لگتے ہیں دل کو اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ ان کی خطائیں بھی بھلی لگتی ہیں۔''

''ہرا..... واہ بیوی واہ۔ جب اس وقت محبت کا یہ عالم تھا تو اب تو.....''

عطیہ دیکھتی رہ گئی۔ خلوص و محبت کی روشنی نے تن من میں اجالا بکھیر دیا۔

☆☆

''اوفوہ امی! یہ اتنے پرانے جوڑے آپ بھائی ان کے رنگ بھی پھیکے پڑ گئے ہیں۔''
کی بری میں رکھیں گی۔ پیٹی میں پڑے پڑے اب تو نائلہ نے ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ کو الٹ

پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں نائلہ! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ دیکھو گلابی جوڑا، اس کا تو کام بھی کالا پڑ گیا ہے۔ اور امی! دیکھیں تو فینائل کی گولیوں کی کتنی بدبو آ رہی ہے اس میں سے۔'' صائمہ بھی کچن کا کام ختم کر کے اپنی امی کے کمرے میں آ بیٹھی جہاں وہ اپنے بیڈ پر کپڑوں کا انبار لگائے بیٹھی تھیں۔

''ارے تم دونوں بہنیں چپ ہی رہو بس۔ اب تمہاری اس گھنی مینسی پھوپھو کی چالاکو بیٹی کے لیے کیا میں دبئی سے کپڑے لا کر بری میں رکھوں۔'' خالہ بیگم نے باری باری دونوں بیٹیوں کے ہاتھ سے سوٹ جھپٹ کر واپس رکھے۔

''اماں! آپ ہماری اتنی نفیس اور نرم مزاج پھوپھو کو گھنی مینسی تو نہ کہیں اور زارا بھابھی تو اتنی اچھی ہیں۔ جب بھی ہم ان کے گھر جاتے ہیں، ہم سب کی اتنی خاطر کرتی ہیں وہ۔''

نائلہ نے اپنی پھوپھو اور ہونے والی بھابھی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ خالدہ بیگم نے غصے بھری نگاہ بیٹی پر ڈالی۔

''امی پلیز، آپ غصہ نہ کریں اور ٹھنڈے دماغ سے یہ بات سوچیں کہ جب ہمارے سب رشتے دار یہ بری دیکھیں گے تو کتنی باتیں کریں گے اور تو اور آپ نے زیور بھی بہت ہلکا بنوایا ہے۔''

صائمہ بڑی تھی اور خاصی سمجھ دار بھی۔ اس لیے ماں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی اور ساتھ ہی بیڈ پر رکھے جوڑے تہہ کرنے لگی۔

''تم دونوں بہنیں جو بھی کہو مگر سچ یہ ہے کہ میرا تو دل ہی بجھ گیا ہے اس رشتے سے۔ کیسے کیسے ارمان تھے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی پسند، اپنی مرضی سے کروں گی اور ایک سے ایک اچھا جوڑا بری میں چڑھاؤں گی، مگر تمہاری پھوپھو کی وجہ سے میرا دل ہی اچاٹ ہو گیا۔ ارے دیکھو تو کیسے ماں بیٹی نے مل کر میرے بیٹے کو پھانس لیا۔'' خالدہ بیگم کپڑوں کو بے دلی سے سائڈ پر کرتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

صائمہ نے نائلہ کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔

''امی پلیز! آپ ایسا نہ سوچیں، یہ سچ ہے کہ پھوپھو کی پوری مرضی تھی سعد بھائی کو اپنا داماد بنانے کی اور انہوں نے کئی بار دبے لفظوں میں ابا سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا مگر ابا آپ کی مرضی کے بغیر کیسے اتنا بڑا فیصلہ کرتے؟ مگر پھر جب سعد بھائی نے خود زارا کا نام لیا تو آپ بھی خاموش ہو گئیں اور یہ رشتہ طے کر دیا۔ اب جب شادی قریب ہے تو آپ یوں بددل اور بدگمان نہ ہوں اور امی! آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اس شادی میں آپ کے اکلوتے بیٹے کی مرضی شامل ہے اور سعد بھائی آپ کے فرماں بردار بیٹے ہیں، ان کی خوشی کے لیے آپ خوشی خوشی شادی کی تیاری کریں۔''

صائمہ نے اپنی امی کو نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی اور خالدہ بیگم کے چہرے پر آتا سکون اور ٹھہراؤ یہ بتا رہا تھا کہ صائمہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکی ہے۔

''یہ لیں جناب، ٹھنڈا ٹھار شربت۔''

نائلہ نے جگ اور گلاس ان کے سامنے رکھا تو وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔

☆☆☆

خالدہ بیگم جب سے بیاہ کر سسرال گئیں تو بڑی نند طاہرہ سے ان کی کبھی نہ بنی۔ چھوٹی اور معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے جھگڑنا، ایک دوسرے کے کاموں میں نقص نکالنا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرنا ان دونوں نند، بھاوج کا معمول تھا۔

پھر طاہرہ بیاہ کر چلی گئیں تو خالدہ بیگم نے سکون کا سانس لیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاہرہ کے مزاج میں ٹھہراؤ آ تا گیا۔ وہ جب بھی میکے آتیں تو بھائی بھابھی اور بچوں کے لیے تحائف لاتیں۔ بچے پھوپھو کی طرف لپکتے اور یہ دیکھ کر خالدہ بیگم جلتی کڑھتی رہتیں۔

''ہونہہ! بڑی چالاک ہے، جان بوجھ کر اتنے تھیلے بھر بھر کے لاتی ہے تحائف تاکہ مجھے دکھا سکے کہ

کتنے امیر اور بڑے گھر کی بہو ہے۔"
وہ ان کے لائے سامان کو نخوت سے دیکھتیں۔ ان کے نرم مزاج شوہر ان کی باتوں پر مسکا کر رہ جاتے۔

☆☆☆

صائمہ کے سمجھانے اور ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے سعد کی شادی دھوم دھام سے کی۔ بری کے کپڑے تو وہی رہنے دیے البتہ زیور بھاری ڈالا۔
"خوش رہو بہو۔ سدا سہاگن رہو۔" دلہن بنی زارا کو خالدہ بیگم نے دل سے دعا دی۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ بہن! ہمیں آپ کی صائمہ بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ ہم اسے اپنے گھر کی رونق بنانے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔"
زارا کی بچپن کی سہیلی تھی شازیہ۔ ان کی فیملی کو صائمہ پسند آ گئی۔ اچھی اور دیکھی بھالی فیملی تھی، یوں آناً فاناً صائمہ کا رشتہ پکا ہو گیا اور وہ اگلے دو سے تین ماہ میں شادی کرنا چاہ رہے تھے۔
"ابھی تو سعد کی شادی ہوئی ہے، اتنی جلدی اب صائمہ کی شادی....." خالدہ بیگم سخت گھبرا رہی تھیں۔
"امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مدد کرے گا اور ہم سب ہیں ناں آپ کے ساتھ، آپ پلیز ٹینشن نہ لیں۔" زارا نے نرمی سے خالدہ بیگم کو سمجھایا۔
"ارے بہو! تمہیں کیا پتا ہمارے گھر کے حالات کا، ایک ہی کمانے والا ہے میرا سعد۔ تمہارے ماموں کی پینشن سے تو ہم دونوں کی دوائیوں کا ہی خرچا پورا ہوتا ہے۔ کہاں سے کرے گا سعد اتنی جلدی بہن کی شادی کے سارے خرچے۔"
زارا چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔ وہ سوچوں میں گم تھی۔

☆☆☆

"امی! یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ زارا شادی سے پہلے اسکول میں جاب کرتی تھی تو اس نے جمع کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس نیت سے کہ شادی کے بعد ہم ہنی مون پر پاکستان ٹور پر جائیں گے۔ مگر مجھے آفس سے چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے ہم ہنی مون پر کہیں نہیں جا سکے۔ اب زارا نے یہ پیسے صائمہ کی شادی کے لیے دے دیے ہیں، یہ کہہ کر اب ان پیسوں کی زیادہ ضرورت آپ کو ہے۔"
"اور امی! یہ زیور بھی ہے جو آپ نے زارا کو بری میں دیا تھا۔ آپ یہ بھی صائمہ کو دے دیں۔ زارا کو میں ان شاء اللہ پھر بنوا کر دے دوں گا۔"
سعد ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی پیسے اور زیور کا ڈبا بھی ان کے سامنے رکھا۔ خالدہ بیگم حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں۔
"مگر بیٹا! یہ زیور بہو کا ہے۔ اس پر صرف اسی کا حق ہے اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ بہو کا زیور لے کر بیٹی کو دے دیا۔"
انہوں نے زیور کا ڈبا واپس بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"امی پلیز! اس طرح غیروں جیسی بات نہ کریں۔ یہ زیور میں نے اپنی خوشی سے صائمہ کے لیے دیے ہیں۔ رخصتی کے وقت امی نے مجھے اچھی طرح سمجھایا تھا کہ نندوں کو اپنی بہنیں سمجھنا اور صائمہ تو میری بہن بھی ہے۔ یہ زیور وہ پہنے یا میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
زارا چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔
سعد نے دل ہی دل میں اتنی سمجھ دار بیوی کو پانے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور خالدہ بیگم دل میں شرمندگی کے احساسات لیے اللہ سے معافی مانگنے لگیں۔ ساری زندگی نندوں کو گھنی اور میسنی کہنے پر اپنی ہی نظروں میں چور بن گئیں۔

☆☆

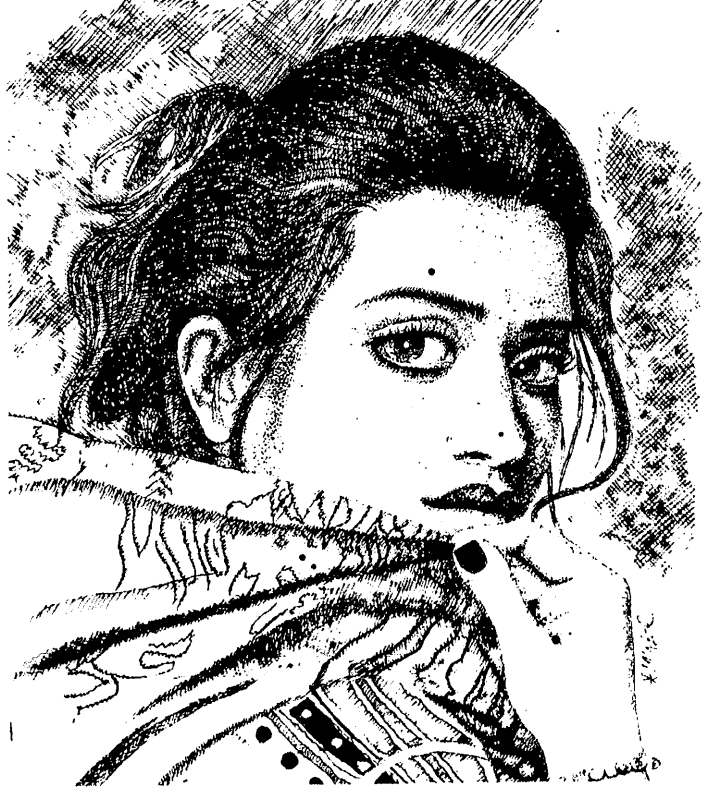

گُل ارباب

مکمل ناول

من کا پپیہارا

تم سنگ نیناں لاگے
مانے ناہی جیارا
پیا پیا بولے پیا
من کا پپیہارا
سپنوں میں آ پیا
کہوں ساری باتیں
رو رو گزاریں پیا
کیسی کیسی راتیں

تم کو بھلاؤں کیسے
مانے ناہی جیارا
پیا پیا بولے پیا من کا پپیہارا۔

اپنی ہی سماعتوں کو سزا دینے کے لیے بڑے ہی بے سرے انداز میں بار بار گنگنا کر میں نے ناشتہ تیار کیا کیونکہ یہ سزا میرے کانوں کو روزانہ کی طرح الارم نہ سننے کے جرم میں ملی تھی۔

"سرمد! اٹھیے نا دیر ہو رہی ہے، کب سے آپ کو

اٹھا رہی ہوں لیکن آپ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔"

اللہ معاف کرے میں نے روزانہ کی طرح سفید جھوٹ سے ہی دن کی ابتدا کی ایسا کرنے کی ایک بہت اہم وجہ تھی میرے پاس بلکہ یہ اک گہرا راز ہے اور آج سارے راز اگلنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اس لیے بتائے دیتی ہوں کہ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح الارم نہ سننے کے بعد جس وقت بھی آنکھ کھلتی ہے، میں یہ ہی جملے نیم سوئے نیم جاگے میاں کے کان میں پھونک کر کچن کی طرف بھاگتی ہوں، اس طرح وہ بے چارے خود کو لیٹ ہو جانے کا قصوروار ٹھہراتے ہوئے جتنی دیر میں تیار ہوتے ہیں، میں ناشتہ میز پر رکھ کر دسترخوان کا منہ ذرا سا کھول دیتی ہوں، اتنا ہی جتنا ہونٹوں کو موٹا کرنے کا ٹیکہ لگوا کر اداکارائیں کھولے رکھتی ہیں مجھے اس کا تجربہ ایک بار ہو چکا ہے، ارے ارے خدانخواستہ میں نے کبھی ہونٹ موٹے نہیں کروائے بلکہ ایک بار اتفاقاً ہو گئے تھے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ چھت کے پنکھے کو صاف کر کے جوں ہی نیچے اتری کسی سوراخ میں سے پہلی

زرد بھڑ نے منہ نکالا اور اس کے منہ نکالنے پر پورا ہفتہ مجھے منہ چھپانا پڑا کیونکہ اگلے ہی گھنٹے میرا منہ صرف منہ نہیں رہا تھا بلکہ تربوز نما بڑی سی چیز بن گیا جہاں بھڑ نے ڈنک مارا تھا وہاں سے میں سوجی ہوئی آنکھ کے ساتھ انڈونیشیا کی حسینہ اور جہاں صرف ہلکی سی سوجن پہنچی تھی وہاں سے میں سو فیصد باجوڑ کی پٹھانی گل جان نہیں بلکہ پٹھان گل خان لگ رہی تھی۔ جنہوں نے باجوڑ کے پٹھان اور پٹھانیوں کا فرق دیکھ رکھا ہے وہ میری بات سمجھ جائیں گے۔

دو دن تک مسلسل منہ کھلا رہا۔ ہونٹوں کی سوجن کی وجہ سے، اور تب ہی مجھے ان خواتین کی اذیت کا احساس ہوا جو خوب صورت نظر آنے کے غیر انسانی پیمانے پر پوری اترنا چاہتی ہیں اور اس کوشش میں ایک پوری تک نہیں نگل سکتیں ہاں حلوے کی بات الگ ہے اسے کھانے کے لیے منہ بند کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی دسترخوان کے کھلے منہ کی وجہ۔ تو وجہ یہ ہے کہ میاں ذرا ٹھنڈے پراٹھے سے یہ اندازہ لگالیں کہ میں کتنی دیر سے ناشتہ تیار کیے بیٹھی ان کے جاگنے کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کئی بار اٹھانے کی کوشش بھی کر چکی ہوں اور وہ معذرت کرتے رہیں۔

''سوری یار! آج پھر میں لیٹ ہوگیا۔ آفس میں سارے کولیگ بمعہ ہمارے باس کے بیگمات کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہوتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ہماری نصف بہتر نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ ہم الٹا اس وقت کی پابند بیگم کا جی جلا دیتے ہیں۔ ناشتے کا انتظار کتنا دشوار ہوتا ہے یہ ہم کیا جانیں؟''

وہ بے چارے روز کے دہرائے جملے کسی نئے انداز میں خدمت اہلیہ میں پیش کرتے اور میں دل ہی دل میں ان کے کولیگز اور باس کی بیگمات کی بے وقوفی پر ہنستی رہتی۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ کی نیند ہی اتنی پکی ہے اس میں آپ کا کیا قصور یہ تو آپ پر اللہ کی خاص رحمت ہے کہ آپ اتنے سکون سے سوئے رہتے ہیں ورنہ تو آج کل لوگ سکون والی نیند کے لیے ترستے ہیں'' میری معصوم ادا پر وہ واری صدقے ہونے والی نظروں سے مجھے دیکھ کر دل ہی دل میں ضرور اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوں گے۔

''کوئی نیا ناول نہیں چھپا؟'' وہ میری دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے چائے کی چسکی لے کر ازراہ کرم و مہربانی پوچھتے ہیں۔ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کے انہیں افسانے ناول مائیکرو فکشن اور کہانی کے فرق کا بھی پتا نہیں لیکن وہ ظاہر بالکل نہیں کرتے۔

''جی لکھ رہی ہوں لیکن وقت ہی نہیں ملتا بچوں کے کام گھر کی ذمہ داری پھر آپا کا چکر ہر دن ضرور لگتا ہے بہت سا وقت ضائع ع ع۔'' آخری جملے پر ان کی آنکھوں سے بہتی پریم کی ندیا خشک ہوتی نظر آئی تو میں نے بھی بات ادھوری چھوڑ کر پینترا بدلا۔

''ہاں وہ بھی کیا کریں انہیں کون سا کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا ہے کم پڑھی لکھی خواتین تو پھر ادھر ادھر کی خبر گیری میں ہی وقت گزار لیتی ہیں۔'' میں ان کی آپا کو صاف صاف جاہل نہیں کہہ سکتی اس لیے لپیٹ کر مارنے کی کوشش کرتی۔

''ہاں یہ ہی تو بات ہے جس کی وجہ سے میں آپا کی بہت زیادہ عزت کرتا ہوں اور ان سے اس قدر محبت بھی کرتا ہوں، جانتی ہو انہوں نے اماں کی بیماری کی وجہ سے ہمیں سنبھالنے کے لیے اپنی پڑھائی چھوڑی تھی حالانکہ انہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔''

میں روز کا دہرایا ہوا سبق مصنوعی اشتیاق سے سنتے ہوئے کہتی۔

''کون سی کلاس میں پڑھائی چھوڑی انہوں نے؟''

وہ میرے سرسری سوال کے جواب میں حسب معمول جھٹ سے بول پڑے۔

''دسویں جماعت کے دو پیپر رہتے تھے لیکن نہ دیے انہوں نے۔''

''لیکن اماں تو چھ مہینے سے بیمار تھیں؟ تو اچانک ایسا کیا ہوا کہ وہ بورڈ کے پیپرز دے نہ سکیں؟''

میرے سوال پر وہ لگے بغلیں جھانکنے تب ہی

انہیں یاد آیا کہ وہ دفتر سے پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں اور اب مزید وقت نہیں گپ شپ کا۔

میں بھی ان کی باتوں کو گپ شپ سمجھ کر انہیں باہر تک چھوڑ کر واپس آئی اور پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو خود ہی داد دیتی۔

میری چچا زاد بہن میری نند شمیما آپا کی کلاس فیلو تھیں اور میری شادی سے پہلے ہی انہوں نے اپنی ایک ساتھی لڑکی کا قصہ سنایا تھا۔

''یار نقل تو آدھی سے زیادہ کلاس کر رہی تھی لیکن بورڈ کے پیپرز میں کافی سختی کی جا رہی تھی کہ کہیں اسکول کا امتحانی ہال بدنام نہ ہو جائے تو ہماری وہ کلاس فیلو جس کا نام ہم نے ناں بی بی رکھا ہوا تھا کیونکہ ہر سوال کے جواب میں وہ نفی میں سر ہلا کرنا کرتی تھی تو بورڈ کے انگلش کے پیپر کے دن اچانک مزید سختی شروع ہوگئی اور سب ہی لڑکیوں سے نقل لے کر انہیں بغیر ہتھیار کے جنگ جیتنے بھیج دیا گیا سب ہی لڑکیاں پیپر کر رہی تھیں اور یہ صاحبہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

سپروائزر نے پوچھا۔ ''تم کیوں خالی بیٹھی ہو، لکھو نا۔''

''میم کیا لکھوں، کچھ یاد ہی نہیں ہے؟''

''کم سے کم نام اور رول نمبر تو لکھ دو نا۔'' وہ عاجز ہو کر بولیں تو جھٹ سے ناں بی بی نے پیپر ہاتھ میں پکڑ کر ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''تو کیا اب نام اور رول نمبر بھی میں بتاؤں؟''

ان کے طنزیہ انداز میں پوچھنے پر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کو دیکھنے لگی تو سپروائزر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''میم ایک کاغذ پر اپنا نام اور رول نمبر لکھ رکھا تھا کیونکہ اتنی لمبی اسپیلنگ مجھے یاد نہیں ہوتی، یاسمین احمد محی الدین پراچہ۔ نام والی نقل کا کاغذ بھی مس طاہرہ نے شوز میں سے نکال لیا ہے۔''

''آپ لکھ دیں نام۔'' سپروائزر نے ملامتی نظروں سے مڑ کر مس طاہرہ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں بروٹس تم بھی؟ وہ خود پھنسنا نہیں چاہ رہی تھی۔

ہم سب کزنز یہ واقعہ سن کر ہنسنے لگیں۔ میرے تو پیٹ میں بل ہی پڑ گئے تھے ہنستے ہنستے۔

بعد میں جب میری شادی ہوئی تو بارات پر شمیما آپا سے ان کزن کی ملاقات ہوئی کیا دیکھتی ہوں کہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دوڑتی ہوئی آتی ہیں اور دلہن بنی مجھ غریب کے کان میں گھس کر بولیں۔

''ہائے جاناں! وہ نالائق پانڈی (پانڈے یعنی کہ برتن کی مؤنث) تیری نند نکلی۔ ارے سچ کہتی ہوں اس کا بھائی بھی ایسا ہی نالائق نکلے گا پہلے سے انگوٹھے کا انتظام کر لو یہ نہ ہو مولوی صاحب کہیں نکاح نامے پر دستخط کروا دو وہ شوز میں چھپا کاغذ ڈھونڈ رہا ہو اور دلہنوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں میرے لیے دعا کرو کہ اس بار بیٹا دے اللہ اور اپنے لیے دعا کرو کہ دولہا کے شوز میں سے کسی مس طاہرہ نے کاغذ نہ نکالا ہو۔''

میں انہیں گھورنا چاہتی تھی لیکن نقلی پلکیں زیادہ تاؤ برداشت نہیں کرتیں اس لیے چپ ہوگئی بنا گھوریاں ڈالے۔

لیکن جیسے ہی مبارک باد کی آوازیں سماعتوں میں پڑیں میں نے شکر ادا کیا۔

رخصتی کے بعد حجلۂ عروسی اور شب زفاف کے سحر انگیز ماحول میں بھی میرے ذہن میں یہ سوال ڈنک مار رہا تھا کہ کیا ہوا ہوگا؟ اس لیے جیسے ہی دولہا صاحب اندر آئے اور ابھی گلے میں پہنے ہار کو جیت بھرے انداز میں صوفے کے گلے میں پہنانے ہی لگے تھے کہ میں نے اس قدر غیر متوقع سوال کر لیا کہ سوال کے جھٹکے نے انہیں ہی صوفے سے گلے ملا دیا۔ ہار ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا اور ان کا تراہ نکل کر ان سمیت صوفے پر گر گیا۔

''سنیے جی شوز میں سے کاغذ نکل آیا تھا نا؟''

وہ قدرے سنبھل کر اٹھے اور میرے مقابل بیڈ پر بیٹھ کر مشکوک انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' میں نے گھونگھٹ

میں ہی سر زور زور سے اثبات میں ہلا دیا۔

''ویسے جتنی جلدی آپ کے والدین نے رشتہ دیا اور پھر شادی کے لیے یہ اصرار کہ جلد از جلد ہو تو ہم پہلے ہی شکوک وشبہات میں پھنسے ہوئے ہیں، شیما آپا نے امکان ظاہر کیا تھا کہ گرمی کا موسم قریب ہے اور پشا کال کا مہینہ ذہنی مریضوں کے مرض میں اضافہ کر دیتا ہے اس لیے کہیں پشا کال سے پہلے شادی کے پیچھے کوئی راز نہ چھپا ہو۔'' وہ قدرے دور کھسک چکے تھے۔

اور بار بار سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی بند کنڈی کی طرف بھی دیکھ رہے تھے، میرے خود ہی گھونگھٹ اٹھا کر پٹ سے کیے گئے اس سوال کے بعد کہ.....

''آپ نے نکاح نامے پر دستخط کیے ہیں یا انگوٹھا لگایا ہے؟''

وہ تھوڑے سے اچھلے ضرور لیکن جلد ہی سنبھل بھی گئے یقیناً یہ سنبھلاؤ میرے حسن اور پارلر والی کی بے پناہ محنت کی وجہ سے تھا۔ ظالم نے مجھے ایسا سنوارا تھا کہ دو بار تو میں آئینے میں کرسی پر بیٹھی دلہن کو دیکھ کر ماشاءاللہ کہہ چکی تھی۔

''خدانخواستہ آپ کو میری ڈگری کے جعلی ہونے کا خدشہ تو نہیں ہے؟''

میں اس بات پر چونک گئی وہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نے پہلے دن ہی ان سے شیما آپا کی بابت استفسار مناسب نہ سمجھتے ہوئے چپ میں ہی خیر سمجھی۔

☆☆☆

''اے دلہن بی بی! اگر خوشیوں بھری زندگی کی چاہ ہے تو اس گھر کے کچھ اصول یاد رکھنے ہوں گے۔'' شیما آپا کا لہجہ تو بورڈ میں ٹاپ کرنے والوں جیسا تھا، میں نے جل کر کہا۔

''آپا! پڑھائی کے دوران میں ریاضی کے اصول یاد رکھ رکھ کر تھک چکی ہوں اب ذہن میں گنجائش کم ہی بچی ہے۔'' وہ تو جیسے اچھل پڑیں۔

''اے یہ دیکھ لو بھیا! مجھے ریاضی اور انگریزی میں فیل ہونے کا طعنہ دے کر کہتی ہے کہ آپا نالائق بچی ہے۔'' (انہوں نے گنجائش بچی ہے کا خوب استعمال کیا)

میں نے انہیں داد دیتی نظروں سے دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔ ''پڑھائی کے علاوہ ہر معاملے میں آپ کا دماغ خوب چلتا ہے شیما آپا!

میاں جی نے مجھے یوں گھورا جیسے میں کبھی کبھی اس بلی کو گھورتی ہوں جو معصوم سی چڑیا کے بچے پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو کر درخت کے نیچے بیٹھی ہوتی ہے کہ بچہ شوق پرواز میں نیچے گرے اور وہ جھپٹ لے۔

''مطلب یہ کہ میاں جی مجھے خونخوار وظالم بلی اور اپنی آپا کو معصوم سا چڑیا کا بچہ سمجھ رہے تھے۔'' جلدی سے شکل پر معصومیت کے تاثرات سجائے اور نرم لہجے میں پوچھا۔

''آپا! مجھے بہت خوشی ہوگی کہ آپ مجھے اس گھر کے اصول سمجھائیں گی۔ میں ہر طرح کے اصولوں کی پاس داری کروں گی۔''

بس وہی دن تھا جب شیما آپا' میاں جی کی طرفداری سے جیت گئیں اور ہمیشہ مجھے دبا کر رکھنے کی کوشش میں کامیاب رہیں۔ میں جو اپنے گھر کا سب سے لاڈلا بچہ تھی یہاں آ کر جیسے رل گئی لیکن بار بار مجھے پنجابی کا ایک گانا یاد آ رہا تھا جو میں گنگنا بھی نہیں سکتی تھی کہ اس گھر کے اصولوں میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ خواتین با آواز بلند گانا نہیں گائیں گی یا گنگنائیں گی۔

گانا یہ تھا ''رل تے گیے ان پر چس بڑی آئی اے۔''

شروع میں تو گھر میں سرمد (میرے میاں) اور میں ہی تھے لیکن یہ فقط رات کو ہوتا، صبح ہوتے ہی گھر کے اہم اصول یاد کرانے شیما آپا پہنچ جاتیں جیسے میں ان کی طرح نالائق پانڈی ہوں جسے روز یاد دہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ ان سے کہوں۔ آپا ایک کاغذ پر سارے اصول لکھ دیں میں شوز میں چھپا کر رکھ لوں گی اور جب جب آپ پوچھیں گی میں نقل کر کے سنا دیا کروں گی۔ بشرطیکہ مس طاہرہ تلاشی میں نقل نکال نہ لیں۔ لیکن

مروت نے یہ کرنے نہ دیا۔
جیسے ہی سرمد آفس کے لیے نکلتے، وہ آموجود ہوتیں۔

''آپا رات لیٹ سویا کریں تو صبح جلدی آنکھ نہیں کھلے گی۔''

میں انہیں بہکانے کی پوری کوشش کرتی۔ رات دیر تک جاگنے کے فوائد گنواتی صرف اور صرف اس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی پرسکون نیند کے لیے جو ان کی آمد کے ڈر سے بھاگ جاتی تھی اور جس سے ملنے کے لیے میں ترستی رہتی تھی، ہائے کیا حسین دن تھے جب ایک بار آپا کو سرمد نے عمرے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن وہیں رہتی تھیں۔ تب میں شادی کے بعد والے اس نیند کے مزے سے روشناس ہوئی تھی اور سچ کہوں تو اک خواہش من میں بے اختیار یوں مچلنے لگی جیسے کوئی بچہ خراب طبیعت کے باوجود آئسکریم کے لیے مچلتا ہے۔

خواہش ایسی تھی کہ میں دبے لفظوں میں میاں جی کے سامنے اس کا اظہار کیے بنا رہ نہ پائی۔

''ہائے کتنے خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں نا وہ جنہیں اس مقدس سرزمین پر فرشتہ اجل سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اس گناہوں سے آلودہ دنیا میں واپس نہیں آتے بلکہ گناہوں سے پاک صاف ہو کر ابدی زندگی پا لیتے ہیں۔''

''بیگم! جب بھی عمرے یا حج کے لیے جانے کا موقع ملا میں سچے دل سے تمہارے لیے یہ دعا مانگوں گا کہ جاؤں تمہیں ساتھ لے کر لیکن واپسی میں بھی تم ساتھ ہو یہ ضروری نہیں اور سب جانتے ہیں کہ میری دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔''

وہ پھاپھے کٹنی بن کر بولے تو میں دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگنے لگی کیونکہ شادی کے بعد دو چار دعائیں تو میں نے ان کی فوری قبول ہوتے دیکھ رکھی تھیں۔

☆☆☆

آپا کی بیٹی کوئی نہیں تھی بس اکلوتا بیٹا تھا جس سے وہ سب ماؤں کی طرح بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کے میاں کی ٹھیک ٹھاک جاب اور سسرال بھی کافی کھاتا پیتا تھا۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ وہ لوگ شیما آپا کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ ان کی شادی عبید بھائی اور سرمد کی دوستی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ویسے تو عبید بھائی عمر میں سرمد سے اچھے خاصے بڑے تھے لیکن آپا سے کافی چھوٹے تھے۔ اور دیکھنے میں لگتے بھی ان سے چھوٹے ہی تھے۔ مجھے اس رشتے پر حیرت ہی ہوتی تھی کہ ایسا کیا تھا آپا میں خوب صورتی کے علاوہ جو ان کی شادی ایسے گھر میں ہوئی۔ سرمد کے مطابق عبید رضا کے گھر والے کسی اونچے گھرانے میں ان کی شادی کے خواہش مند تھے۔ سرمد کی جاب بہت اچھی تھی اور ان کی فیملی مالی طور پر مستحکم تھی لیکن یہ لوگ کوئی خاندانی رئیس نہ تھے نہ ہی ان کی ملز اور مارکیٹیں تھیں جبکہ وہ لوگ ایسے ہی تھے۔ اسی لیے حالات سازگار نہ ہوئے اور آپا یہاں آ گئی تھیں اور ان کے میاں بھی کاٹھ کے گڈے تھے کہ اپنا بھرا پرا گھر چھوڑ کر آ گئے اور یہیں بھائی کے گھر کے قریب گھر لے لیا شاید انہیں کاٹھ کا الو کہنا ٹھیک ہوتا لیکن بڑی عمر کے بندے کو الو کہنا نامناسب لگتا ہے۔ کچھ حیل و حجت کر لیتے اور وہیں رہتے تو آج میں ان کی بیگم کو نہ بھگت رہی ہوتی، میں نے افسوس سے سوچتے ہوئے میاں کے کپڑے استری کرنے شروع کیے اور میاں کو کپڑوں میں موجود تصور کر کے استری خوب گرم کی کہ انہیں بھی تو احساس ہو کہ جلن اور تپش کیا ہوتی ہے۔

☆☆☆

''یہ گھر [illegible]

انہوں نے صبح صبح ایسا سوال کیا کہ مجھے بھی شک ہونے لگا کہ یہ گھر نہیں [illegible] سیل ہے۔

''جی آپا مجھے [illegible] ہوئی ہے جس سے آپ کی نظر یا یادداشت کھو گئی ہے کہ آپ گھر کو گھر نہیں ٹارچر سیل سمجھنے لگی ہیں؟''

مجھے ان کی بے لیاقتی کا اندازہ تھا اس لیے ٹارچر سیل کی اردو تک نہ پہنچ سکنے اور نہ ہی اس جگت پر برا ماننے کا خدشہ تھا۔ ''لفظ بے لیاقتی بے پروائی یا بے عزتی والی بے سے بنایا ہے)

''ارے میری بنو! تمہیں کہانیاں لکھنے سے فرصت ملے تو گھر کی طرف توجہ بھی دو۔ ہائے وہ ہماری خالہ شگفتہ کی بیٹی بیلا ہمارے بھائی نے صرف اس وجہ سے رشتہ نہ جوڑا کہ بیلا بی بی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔ شادی کے بعد کل کو کہیں گی سرتاج بارش میں بھیگتے ہیں، یا چلو گل داؤدی کی نمائش میں چلتے ہیں (ان کے بھائی کو بارش اور گل داؤدی دونوں سے الرجی تھی) لیکن الرجی تو مجھے بھی ان کی آپا سے تھی یہ اور بات کہ آپا کو اس کی خبر نہیں تھی لیکن گل داؤدی اور بارش کو کون سی خبر تھی کہ میاں جی ان سے الرجک ہیں۔

''ویسے آپا! بہت نصیبوں والی تھی جو آپ کے بھائی نے رجیکٹ کردی۔ واہ ڈائجسٹ چھاپنے والے کتنا ثواب کمارہے ہیں۔'' میں بڑبڑاتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔

''گڑیا اٹھ گئی ہے؟''

ان کا سوال عجیب تھا۔ گڑیا اٹھی ہوئی تھی تبھی تو کیلا کھا رہی تھی۔

''جی آپا ہمارے خاندان میں نیند سے جاگ جاتے ہیں تب ہی کیلا کھاتے ہیں..... لیکن آپ کو کیا پتا؟ آپ کے ہاں جاگ بھی جائیں تو ٹھیک سے نہیں جاگتے یا پھر سوتے میں بھی کیلا کھا جاتے ہیں۔'' یہ میں نے دل میں کہا تھا۔

''شاہان کو فیڈر پلا دیا ہے؟''

میں جل جاتی ایسے سوالات پر۔

''جی آپا! فجر سے ذرا پہلے آپ سے پوچھے بغیر ہی پلا دیا تھا۔

چاہیے تو یہ تھا فون کر کے پوچھ لیتی لیکن آپ کی نیند خراب نہ ہو اس لیے گستاخی کردی۔''

یہ بھی دل میں ہی کہہ پائی۔

''اچھا سنو! آج میٹھے میں سوجی کی کھیر بنانا۔ بریانی کے بعد کھیر کھانے کے لیے من مچل جاتا ہے۔'' ان کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

اس طرح انہوں نے مجھے کھانے کا مینو بتا دیا تھا کہ بی بی بریانی بنانے کی تیاری پکڑ لو ابھی سے مجھے لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنے گھر میں کچھ نہ کھانے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔

''ہر کام الٹا کرتی ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ سوجی کی کھیر کہا ہے تو کھیر کی سوجی بنانے لگ جاؤ۔'' طنز بہت لطیف سا تھا، اس لیے مجھے ہضم ہوگیا اب تو ثقیل چیزیں ہضم کر کر کے لطیف چیزیں لطیفے لگنے لگی تھیں

''توبہ ہے۔ یہ کپڑے پھر نہ پہننا کتنے عجیب اور برے لگ رہے ہیں۔'' ان کی اس رائے نے مجھے خوش کردیا، یقیناً یہ نیلا لانگ کرتا اور سفید پاجامہ سفید کلف والے دوپٹے کے ساتھ مجھ پر سج رہا ہے اسی لیے آپا نے اسے ناپسند کیا ہے۔

''چھوٹے! آج تو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔'' ابھی وہ آئے تھے اور آپا کی فرمائشیں شروع میں نے منہ بسور لیا۔

''جی آپا چلیں ابھی چلتے ہیں۔'' وہ فوری تیار ہوگئے۔

''ہمیں بھی کچھ چیزیں چاہئیں۔'' میں نے ساتھ چلنا چاہا۔

''کیوں بی بی! آپ نے کیا کرنا ہے؟'' وہ یوں حیران ہورہی تھیں جیسے میں مر کر اچانک دوبارہ زندہ ہوگئی ہوں۔

''ظاہر ہے آپا! لوگ امتحان دینے تو بازار نہیں جاتے شاپنگ کے لیے ہی جاتا ہے۔'' امتحان کے ذکر سے ان کی تلخ یادیں تازہ ہوگئی تھیں اس لیے کڑوا منہ بنا کر فقط بڑبڑا کر رہ گئیں۔

''لیکن بی بی! شاپنگ تو تم نے ابھی کچھ دن پہلے ہی کی ہے۔ ہر چیز خرید رکھی ہے پھر کس لیے بازار جا کر خود کو تھکانا ہے؟''

جی میں تو آیا کہ کہوں'' آپا یہ اپنے چھوٹے کپڑے واشنگ مشین دھونے کی اہلیت نہیں رکھتی اس لیے آپ مجھ سے دھلواتی ہیں۔ یوں کہ مجھے اپنا آپ نانی پڑنانی کے زمانے کا لگنے لگتا ہے اس وقت میں تھکی ہوئی نہیں لگتی آپ کو؟''

''ابھی کچھ دن پہلے والی شاپنگ کو چھ مہینے گزر

گئے ہیں اور اب تو سیزن بھی بدل گیا ہے۔'' میں سرتاج کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ان کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔

''اے بی بی! کچھ تو اللہ کا خوف کرو تم نے ایک کاٹن کا سوٹ نیٹ دوپٹے والا، دو پشمینے کی شالوں والے سوٹ، ایک سبز اور دوسرا میرون مرینے کے ٹو پیس لیے۔ دو جوتے ایک ہیل والا اور دوسرا پیچھے سے شوز، آگے سے بو والے ڈیزائن کا اور پرس وہ لیا جس کے ساتھ ہم رنگ پاؤچ بھی ملتا ہے، تین انگوٹھیاں آرٹیفیشل اور ایک کڑا۔ بچوں کے لیے بھی۔''

میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ ''پلیز آپا چھوڑیں اس تفصیل کو میرے ساتھ تو آپ نہیں تھیں، نہ ہی گھر آکر میں نے آپ کو شاپنگ دکھائی پھر بھی آپ کو سب چیزیں زبانی یاد ہیں؟''

آپا کے چھوٹے نے اور ہمارے گھر کے بڑے نے بے اختیار نظریں چرالیں۔ نہ بھی چراتے اور ڈھٹائی سے ہمیں پٹر پٹر دیکھتے رہتے تب بھی ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا۔

''آپا! آپ بھائیان کے ساتھ شاپنگ کیا کریں نا میاں بیوی میں محبت بڑھتی ہے اس طرح۔'' میں انہیں بھائی جان نہیں کہہ پاتی تھی اس لیے گلے سے آواز بھائی جان والی اور الفاظ اس سے ذرا کم نکال کر بھائیان کہہ دیتی تھی۔ مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے بالکل پنجابی فلموں کے ہیروز جیسے۔ یعنی کہ انگلش فلموں کے ولن جیسے۔ آپا کے میاں اپنے پیسے کی اکڑ میں ہی رہتے تھے۔ وہ پیسے جو میں نے آج تک خرچ ہوتے دیکھے ہی نہ تھے۔ شادی کے بعد میں نے کبھی ان کے گھر میں ایک کپ چائے کا بھی نہیں پیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں ایک آدھ چکر ان کی طرف لگتا تو گھنٹہ بھر بیٹھ کر کبھی کبھی انہوں نے کچھ کھلایا پلایا نہیں تھا۔ ان کے چھوٹے اور ہمارے بڑے کہتے۔ ''آپا آپ بیٹھیں یہاں ہم صرف آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔''

اور آپا نے بھی یہ نہ کہا کہ ''بھیا! دس منٹ پہلے ہی تو میں تمہارے گھر سے واپس آئی ہوں۔''

لیکن آپا کی زبان پر ہر وقت ان کی تعریف کے کلمات ہی رہتے تھے۔

''ارے وہ تو ہر وقت یہ کہتے ہیں کہ چلو شاپنگ پر لے جاؤں لیکن میں ان کے ساتھ نہیں جاتی۔ ہر چیز پر اصرار کریں گے کہ یہ بھی لے لو بیگم، وہ بھی لے لو۔'' ان کے لہجے میں فخر تھا۔

''تو ٹھیک ہے نا، فرض بنتا ہے ہر شوہر کا کہ بیگم کی خواہشات کا احترام کرے لیکن بیگم اپنی ہونا شرط ہے۔''

میرے اس طرح کہنے پر وہ چبا چبا کر بولیں۔

''بی بی! سارے فرائض شوہروں کے نہیں ہوتے۔ کچھ بیویوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اچھی بیویاں کل کی فکر میں آج کی عیاشی سے بچتی ہیں، جہاں چار کی ضرورت ہو وہاں دو سے کام چلانا سمجھ داری کہلاتا ہے۔''

''میرا تو دل دکھتا ہے شوہر کے پیسوں کے لیے۔''

میرا جی جل گیا اندر کی آگ پر بمشکل صبر کے چھینٹے مار کر میں نے پوچھنا چاہا۔

''آپا صرف اپنے شوہر کے پیسوں کے لیے دل دکھنا اور دوسروں کے شوہر رررر۔'' آپا کے کاکے نے مجھے یوں گھورا جیسے نظروں سے ہی کھا جائیں گے اور میں چپ ہی کر گئی۔

''کیا خریدا آپا نے؟'' رات گئے وہ بازار سے لوٹے تو آپا سیدھی اپنے گھر چلی گئیں اور میاں جی ہاتھ میں شوارمے کا لفافہ ہلاتے ہوئے وارد ہوئے۔

میں نے خالی ہاتھ آنے سے شوارمے کو ہی غنیمت جانتے ہوئے ہوٹل کا شاپر جلدی سے ان کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

''ہیں یہ کیا ہے؟'' فقط پیٹا بریڈ نام کی موٹی سی خمیری روٹی ہی تھی لفافے میں۔

''وہ تم تو جانتی ہو کہ آپا بے چاری پورا شوارمہ نہیں کھا سکتیں تو ہوٹل سے دو شوارمے لیے، میں نے اپنا کھا لیا جبکہ آپا نے محبت بھرے انداز میں کہا کہ آدھا اپنی بھابھی کے لیے لے جاتی ہوں کیونکہ اس کے بغیر تو الہ حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔''

میں نے ان کی طرف دیکھا اور پھر روٹی کی طرف۔

''یہ اسی شوارمے کی روٹی ہے۔'' میں نے انہیں گھورا۔ ''مجھے ثبوت چاہیے کہ یہ شوارمے کی روٹی ہے۔''

''ہیں۔'' ان کا منہ کھل گیا۔

''مجال ہے اس روٹی کی فرانزک یا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس کا شوارمے کے ساتھ ملاپ کا ثبوت مل جائے۔ ثبوت مٹانا تو کوئی آپ کی بہن سے سیکھے۔'' وہ کھسیانے سے اندر چلے گئے۔

شاپر میں سے کاغذ گرا تو میں نے اٹھا کر دیکھا، یہ بل تھا۔

اس پر چار شوارمے لکھے ہوئے تھے۔

''مطلب ایک میاں نے کھایا ہوگا اور باقی تین میں سے پونے تین ان کی آپا نے؟''

میں صبر کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

☆☆☆

دو بچوں کی پرورش کے ساتھ گھر کے سارے کام پھر دن بھر شیما آپا کو بھگتنا۔ عجیب بھاگم دوڑ والی زندگی تھی میری۔ اس پر میاں کی فرمائشیں الگ۔ کبھی انہیں چائنیز چاہیے تو کبھی دیسی کھانا اور کبھی کبھی تو اٹالین۔ کے ساتھ ساتھ افریقن بھی مانگ لیتے تھے ان کے موڈ پر منحصر ہوتا کہ کھانا کیا ہے ایک دن افریقن کھانے کا کہا تو میں نے مزے سے فریج سے دھلا دھلایا چوچا نکالا اور فرائی پین میں کوکنگ آئل کے ساتھ مرچ مسالہ ڈال کر اوپر ڈھکن رکھ دیا اور موقع دیکھ کر افسانہ لکھنے بیٹھ گئی۔

درمیان میں جب ہیرو ہیروئن کے بیچ محبت کی پینگیں لمبی ہو گئیں تو میں نے جا کر الٹ پلٹ کر دیکھا ابھی سری لنکن بنا تھا، اسے افریقن ہونے میں کچھ سین باقی تھے سو میں واپس محبت کی پینگوں والے سین پر آ گئی۔

اور جب دونوں محبت کے راہی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور سماج کی وجہ سے ان کے درمیان طلاق ہونے ہی والی تھی تب وکیل صاحب کو سین کے دوران اٹکا کر میں واپس فرائی پین میں رنگ بدلتے چوچے کی طرف آئی تو وہ مکمل افریقی رنگ میں رنگ چکا تھا، مطلب کالا سیاہ ہو گیا تھا۔

''کھائیں نا سرمد! جانتے ہیں، یہ افریقہ کے قومی کھانوں میں سے ایک ہے؟''

انہیں میں نے متغیر رنگت چھپاتے ہوئے سالم چکن میں سے کوئی سری لنکن بوٹی ڈھونڈنے کی کوشش کرتے دیکھ کر کہا تو وہ کھسیانے سے مسکرا دیے۔

''ہاں میں نے ایک بار دوست کے گھر کھائی تھی یہ ڈش۔ اس کی بیوی افریقن ہے نا۔''

میں اپنی قابلیت اور سگھڑ پن پر خوش ہو گئی کہ بنا کسی سے پوچھے، بنا سیکھے میں یہ خالصتاً افریقی ڈش بنا چکی ہوں۔

''آپ کو پتا ہے اس کا نام کیا ہے؟'' وہ اس نمونے سے ہاتھ کالے کر چکے تھے اور اب منہ بھی کالا ہو رہا تھا۔

''میری سہیلی نے اس کا جو نام بتایا تھا، افریقہ کی زبان میں وہ تو مجھے بھول گیا ہے لیکن اس کا مطلب اب بھی یاد ہے۔''

''اچھا کیا مطلب ہے؟'' وہ بے دلی سے پوچھ رہے تھے۔

میں نے جلدی جلدی سوچا اور منہ میں جو آیا وہ فوری بول دیا۔

''کالا شاہ کالا۔''

وہ سمجھ داری سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''کوئلہ ہی کوئلہ بھی ہوتا تو بھی ہم کیا کر لیتے؟ ویسے ذائقے کے حساب سے تو کوئلہ ہی ہونا چاہیے تھا۔'' میرے زبردستی روکے گئے قہقہے ان کے چہرے پر پھیلی عاجزی دیکھ کر اب اندر ہی اندر گدگدی کرنے لگے تھے۔

''اچھا سنو ذرا اچھا سا قہوہ تو بنا لاؤ ساتھ میں گڑ بھی رکھنا اچھا۔''

میں ان کی چالاکی بھانپ چکی تھی۔

ان کی نظر گڑیا کی اس کھچڑی پر تھی جو باوجود کوشش کے وہ کھا نہیں رہی تھی۔ بھوکے تو وہ رہ نہیں سکتے تھے سو پیٹ بھی بھرنا تھا اور اپنے کہے کی ذمہ داری بھی لینی تھی۔

میں پانچ منٹ بعد واپس آئی تو کھچڑی والا باؤل خالی تھا۔

''ارے واہ سرمد! ساری کھچڑی کھلادی گڑیا کو؟''

وہ جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے اثبات میں اور گڑیا نفی میں سر ہلانے لگی

''بس آج سے آپ نے ہی گڑیا کو کھچڑی، دلیہ، کیلا وغیرہ کھلانا ہے۔ میں تو گھنٹوں لگی رہتی ہوں اور تھک جاتی ہوں لیکن.....''

وہ جلدی سے اٹھے اور واش روم میں گھس گئے شاید ہاتھ دھونے اور میں ضبط شدہ ہنسی پر سے کنٹرول کھو کر کالا شاہ کالا کو گھورنے لگی۔

سرمد اچھے انسان تھے بس ان میں خرابی یہ تھی شیما آپا سے وہ والی محبت کرتے تھے جس کے سامنے ہم ماں بچوں کی محبت کچھ بھی نہیں تھی۔ اور جو بات میں نے بھانپ لی تھی، وہ یہ تھی کہ شیما آپا بھی سرمد سے بہت شدت کی محبت کرتی تھیں بلکہ بچوں سے بھی انہیں بہت پیار تھا۔ بس میری زندگی میں ان کی مداخلت بہت زیادہ تھی، اگر ان میں سے یہ خرابی نکل جاتی تو قابل برداشت تھیں لیکن انہیں سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

زندگی اپنی ہی دھن میں رواں دواں تھی مجھے رات کو سارے کاموں سے فارغ ہو کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے لیے نکالنا پڑتا تھا کیونکہ دن بھر کام کاج کے دوران کہانیاں میرے دماغ میں پکتی رہتی تھیں۔ انہیں کاغذ پر اتارنا ہوتا تھا۔

ان مصروف شب و روز میں بھی مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے، بظاہر تو سب ٹھیک تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ ان دنوں سرمد کچھ بدلے بدلے سے ہیں، اس بدلاؤ کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ ہماری ساری ضرورتیں ویسے ہی پوری کر رہے تھے اور گھر میں بھی ہوتے تھے لیکن مجھے یہ لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہوتے۔ کچھ الجھے ہوئے، کچھ چھپاتے ہوئے لیکن کون سی الجھن، کون سا راز، میں یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

مگر کچھ تھا ضرور اور یہ کچھ کیا ہے اس کی تہہ تک مجھے پہنچنا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

میں نے انہیں مسلسل فون میں گھسے دیکھ کر پوچھا تو وہ اس اچانک چھاپے پر گھبرا سے گئے۔

''میرے دوست کا میسج ہے، رات کو پروگرام ہے۔ اس کے گھر میں سارے دوست جمع ہوں گے۔''

ان کے انداز میں اصرار تھا سو میں بھی چپ ہی ہو گئی لیکن ان کی اڑی اڑی رنگت نے دل میں شک کا بیج ضرور بو دیا تھا۔ میں نے اک آہ بھرتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھ کر سوچا۔

''کبھی کبھی چھاؤں دھوپ سے زیادہ جلا دیتی ہے۔ کیا کمی ہے مجھ میں جو وہ کسی اور کی خواہش دل میں پال بیٹھا ہے۔''

میرے اندر سے کسی نے ڈانٹ پلائی۔

پاگل ہو تم بھی جاناں سرمد! بنا کسی ثبوت کے۔ بنا سچائی جانے تم کیسے اتنی دور تک سوچ سکتی ہو۔ یہ زندگی ہے اس کی کہانی میں اتنے جلدی نئے موڑ نہیں آتے۔ تم افسانوں کی عورت ہو نہ ہی وہ افسانوں کے مرد ہیں۔''

میں نے الجھتے ہوئے اندر کی آوازوں کی طرف سے کان بند کیے۔

''کہانیاں تو زندگی سے ہی جڑی ہوتی ہیں زندگی سے ہی لی جاتی ہیں، ان کے موڑ بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، ان کے راستے بھی یکساں بھول بھلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں پھر میری سوچ غلط کیسے ہو سکتی ہے؟

میں سوچوں کے سمندر سے اچھے گمان کی سیپیاں ڈھونڈ رہی تھی لیکن یہ خوش گمانی اور بدگمانی کی

چھڑی ہوئی جنگ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی میں کسی واضح نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی لیکن پہنچ نہیں پا رہی تھی۔

☆☆☆

''جان! میں نکل رہا ہوں۔ رات کو کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ میرے دوست کی طرف ہے کھانا بھی او کے؟'' یہ کہہ کر صاحب نے موٹے سے تالے میں بند تجوری سے پرفیوم کی ننھی سی شیشی نکالی اور گردن پر تقریباً انڈیل ہی ڈالی

میں حیرانی سے انہیں گھورنے لگی۔ وہ کبھی یوں خوشبو میں بس کر گھر سے نہ نکلے تھے۔ میرے اصرار پر یہ مہنگا پرفیوم جس کا نام ملکہ نور جہاں کے اعزاز میں نور جہاں ہی رکھا گیا تھا خریدا تھا اور پھر اسے یوں سنبھال سنبھال کر استعمال کرتے کہ جیسے ملکہ نور جہاں کے ہاتھ کا پھولوں سے کشید شدہ عطر ہو۔ میں اکثر کہتی۔ ''سرمد! کچھ تو کنجوسی کم کریں بندہ اس سے زیادہ تو آنکھوں میں آئی ڈراپس ڈال لیتا ہے جتنا آپ پرفیوم لگاتے ہیں۔''

''کیا کوئی نیا دوست بنا ہے؟'' میرا سوال کرنا تو بنتا تھا کیونکہ آج تک تو ان کے کسی دوست نے انہیں نان پکوڑوں کی دعوت بھی نہ دی تھی، آج کھانے کی دعوت کیسے؟

''ہاں نیا بھی ہے اور بڑا دل والا بھی ہے۔'' وہ اپنی کھلی ہوئی باچھیں بند ہی نہ کر پا رہے تھے۔

یوں کہ جیسے بدسلیقہ خواتین کپڑوں کی الماری سے گرتے ابلتے کپڑوں کو دھکیل کر پٹ بند کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہتی ہیں مگر وہ بند ہو کر ہی نہیں دیتے۔

میں چپ تھی کیونکہ بنا ثبوت فرد جرم نہیں لگا سکتی تھی۔

''چھوٹا ابھی تک نہیں آیا؟'' انہوں نے شام تک بھائی کا رستہ دیکھا اور مجھے استغفار کی فضیلت سے مصیبتوں سے بچاؤ کا رستہ بتایا، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ میں وہی استغفار ان سے نجات کے لیے پڑھتی جا رہی ہوں۔

''آپا! وہ رات بھی لیٹ آئے تھے اور آج بھی لیٹ آنے کا کہہ کر گئے ہیں۔''

میرے دماغ میں اپنا ناولٹ مکمل کرنے کا خیال تھا سو ان کے جلدی جانے کے لیے جھوٹ بولا۔

''بھائیان آپ کی غیر موجودگی میں بور نہیں ہو جاتے؟'' جی تو چاہ رہا تھا لفظ غیر ہٹا کر یہ سوال کروں لیکن نہ کر سکی۔

''نہیں، بڑے سنجیدہ اور کم گو انسان ہیں۔ آج تک مجھے یہ بھی نہ کہا کہ شیما یہاں سے اٹھ کر وہاں بیٹھ جاؤ ان کی خوشی تو میری خوشی میں ہے۔'' وہ عقیدت سے بولیں تو میں نے جل بھن کر سوچا ہاں آپ تو بیٹھے رہنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں۔ آپا یہاں بھی اور وہاں بھی۔ وہ صبح آجاتیں اور پھر یہ کہہ کر کہ میرا میاں شام کو لیٹ آئے گا۔ یہیں رہتیں دوپہر کا کھانا اور پھر شام کا بھی ادھر ہی کھاتیں اور واپسی میں وہ کبھی بھی شوہر کے لیے بھی کھانا لے جاتیں۔

انہیں تو نہ پکانے کی فکر تھی اور نہ ہی میاں کو کمانے کی ہوگی۔ بس میاں بیوی جمع کر رہے ہوں گے ساری کمائی

''آپا! انہیں برا تو لگتا ہوگا آپ کا ہر وقت ادھر رہنا؟'' میں بہانے بہانے سے انہیں احساس دلانے کی کوشش میں مگن تھی۔

''چلو ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ گڑیا کو بھی لے آؤ۔''

وہ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے چینل سرچ کرنے لگیں اور میں شدید کوفت سے انہیں گھور کر رہ گئی یہ دونوں بہن بھائی میرے لکھنے کی صلاحیت کو زنگ لگا کر چھوڑیں گے۔ دماغ میں کئی تخلیقی جملے بن رہے تھے لیکن لکھنے بیٹھ جاتی تو آپا بگڑ جاتیں میرے ہاتھ میں کاغذ دیکھ کر انہیں اپنے فیل شدہ پیپر کا سفید خالی کاغذ یاد آتا تھا شاید۔

شام کو جب بھائی واپس آئے تو آپا نے انہیں

کھلے کھلے چہرے کی مبارک باد دی۔

''ماشاء اللہ ماشاء اللہ میرا بھائی تو اتنا خوش اپنی شادی والے دن بھی نہ لگا تھا۔ چہرہ تو تمہارا گلاب کی طرح کھلا جا رہا ہے میرے بھیا؟'' وہ خوش تھیں بھائی بھی خوش تھا اور میری خوشی دن بھر پیپر ویٹ تلے دبی مجھے گھور گھور کر دیکھتی اور کرداروں کے داد یلے بھی سنائی دیتے کہ ہمیں بیچ راہ میں چھوڑ کر خود آپا اور ان کے بھائی کی خواہشات کی تکمیل میں لگی ہو ہمیں بھی تکمیل چاہیے۔ ہمیں ادھورا چھوڑ کر کس بات کی سزا دے رہی ہو؟

میں نے اپنی بچھڑی خوشی سے نظریں ہٹا کر میاں کے چمکتے چہرے پر نظر دوڑائی اور جی چاہا ان کے گالوں کی لالی پر اک شعر کہا ہوا شعر کہہ دوں لیکن وزن و بحر وغیرہ کے لیے مکمل یکسوئی دستیاب نہ تھی سو فوری طور پر اک گانا یاد آ گیا۔

اور گانے کے ساتھ رنگیلا صاحب بھی جن پر یہ گیت فلمایا گیا تھا۔ اگر آپ سب آپا کی طرح کند ذہن ہیں تب بھی یقیناً اس گانے کے بولوں تک پہنچ ہی گئے ہوں گے کہ ساری نالائقی پڑھنے لکھنے کے معاملے میں ہی عروج پر ہوتی ہے

''بس آپا! دوستوں کی محفل سے منہ پر رونق تو ضرور آتی ہے نا۔''

وہ بھی اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

میں بڑی گہرائی سے نوٹ کر رہی تھی کہ اب وہ غیر محسوس انداز میں میرے ساتھ کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہنے لگے ہیں۔ ان کے رویے کی خفیف سی تبدیلی غور کے بغیر پکڑی نہیں جا سکتی تھی۔

پہلے فرصت ملتے ہی گڑیا کے ساتھ کھیلنے لگتے تھے لیکن اب تو اس بیچاری کو بھی بالکل نو لفٹ تھی۔

☆☆☆

میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے آپا سے اس معاملے میں بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ ڈرتی ورتی میں کسی سے نہیں تھی سوائے آپا کے۔ سو باوجود کوشش کے ہمت ہی نہ ہوئی کچھ پوچھنے کی۔

''شاید تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

وہ مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھ رہی تھیں سو پوچھ لیا۔

''نہیں آپا! کچھ نہیں ہے۔'' میں اثبات میں مسلسل سر ہلاتے ہوئے اپنے ہی الفاظ کی نفی کرنے لگی۔

''یہاں بیٹھو سکون سے اور پہلے فیصلہ کرو کہ ہاں کہہ رہی ہو یا ناں کہہ رہی ہو۔''

میں نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

''آپا! آپ کے چھوٹے مسلسل چھوٹے کام ہی کر رہے ہیں۔ رات تک گھر سے باہر رہتے ہیں، دن کو تیار شیار ہو کر نکلتے ہیں اور پھر جب گھر آتے ہیں تو سیدھے منہ مجھ سے بات کرتے ہیں اور نہ ہی گڑیا سے۔ وجہ پوچھتی ہوں تو لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ گھر میں لڑائی جھگڑوں سے بچوں کی نفسیات پر برا اثر پڑے۔ اس لیے میں چپ کر جاتی ہوں لیکن اب میرے لیے چپ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔''

میری بات سن کر آپا کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور میں ان کی تیوریاں دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ ان کی ساری ہمدردیاں اپنے بھائی کے ساتھ ہیں، وہ چاہے کچھ بھی کر لیں لیکن انہیں یہ کبھی بھی قصور وار نہیں ٹھہرائیں گی۔ یہ ان کے چہرے پر واضح لکھا ہوا تھا اور میں اتنی نالائق نہیں تھی کہ چہرے پر لکھی ہوئی واضح عبارت نہ پڑھ سکتی۔ اس لیے میرے اندر مایوسی کا اندھیرا پھیل گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ میں اپنا مسئلہ کس سے ڈسکس کروں۔

والدہ دل کی مریضہ تھیں اور بھائی بھابھی اپنے آپ میں مگن۔ بہن کوئی تھی نہیں اور لکھنے لکھانے کے شوق نے زیادہ دوست بھی نہ بنانے دیے کیوں کہ دوستی کے لیے آپ کے پاس وقت ہونا چاہیے جبکہ میرے پاس جو بھی فالتو وقت ہوتا تھا وہ میں لکھنے میں صرف کر دیتی تھی، اس لیے کوئی ایسی سہیلی بھی نہیں تھی کہ جس سے میں کھل کر دل کی بات کرتی اور اس سے

آگے کے لیے کوئی مشورہ لے کر لائحہ عمل ترتیب دیتی۔

''دیکھو جانا! میں تمہیں ایک نصیحت کر رہی ہوں گھر جوڑنا یا چھوڑنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے اگر جوڑنا چاہتی ہو تو شک کو دل میں بالکل بھی جگہ نہ دینا۔'' ان کے لیے جاناں کہنا وہ بھی بھابھی کو مشکل تھا اس لیے میرے نام سے ہمیشہ نون غنہ نکال کر لیتی تھیں۔

''آپا! مجھے اچھی طرح سے اس بات کا اندازہ ہے اس لیے میں شک نہیں کر رہی بلکہ مجھے سو فیصد یقین ہو چکا ہے اس بات کا کہ آپ کے بھائی کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آ چکی ہے۔''

وہ میرے پر یقین انداز پر حیران تھیں۔

''مجھے اپنے آپ سے بھی زیادہ اپنے بھائی کے کردار پر بھروسا ہے وہ کبھی ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا جس سے اس کی اور ہمارے خاندان کی بدنامی ہو۔''

آپا کے انداز میں قطعیت تھی۔ میں خاموش ہو گئی۔ یہ خاموشی ہی آج کل میری پکی سہیلی بن چکی تھی اندر باہر قابض ہو چکی تھی میرے سارے وجود پر۔

دوسرے دن میں انہیں آدھی رات کو فون پر میسج کرتے دیکھ چکی تھی لیکن پھر بھی انجان بن کر کروٹ بدل لی۔ سونے کا دوست بھی ہوتا تو اس وقت نیند خراب کر کے وہ کبھی میسج ٹائپ نہ کرتے، یقیناً بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک جھماکا سا ہوا اور اپنی ایک دوست نما کلاس فیلو مونا یاد آئی جس کا کزن پولیس آفیسر تھا اور یونی میں بھی سب ہی کلاس فیلوز کے ہر مسئلے کا حل وہ چٹکیوں میں نکلوا دیتی تھی اپنے اس کزن کے توسط سے۔

☆☆☆

''اوہ تو یہ کہانی ہے؟''

میں نے سرمدی الدین پراچہ کے فون نمبر کی۔ سی ڈی آر (کال ڈیٹا ریکارڈر) دیکھ کر بمشکل اپنے آنسو چھپانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی۔ سامنے بیٹھی میری اس سہیلی کا کزن ایس پی تھا اور اسی کی مہربانی سے سرمد کے فون کی ہسٹری میرے سامنے پڑی تھی۔

ڈیڑھ مہینے کی اس کال ہسٹری میں میں میرا نمبر فقط اتنا ہی ملایا گیا تھا جتنا آٹے میں نمک ملایا جاتا ہے وہ بھی بلڈ پریشر کے مریض کے لیے۔

ایک ہی نمبر بار بار سامنے آ رہا تھا۔ صبح، دوپہر، شام۔ اور تو اور فون کالز اور میسجز کی تفصیل میں کچھ ہولناک انکشافات بھی تھے۔ سب سے بھیانک انکشاف یہ ہوا کہ سرمد اس وقت بھی اس سے میسجز پر بات کرتے تھے جب میں دن بھر کی تھکی ہاری خراٹے لے رہی ہوتی تھی۔

اب اپنے آنسوؤں پر قابو پانا میرے لئے قطعی ناممکن ہو گیا تھا۔

''مطلب وہ میرے بیڈروم میں ہوتے ہوئے بھی اس عورت کے ساتھ ہوتے ہیں جو ان سے دور تو ہے لیکن ان کے اتنے قریب ہے کہ جب اس کے جی میں آئے میاں بیوی کی تنہائی میں بھی شامل ہو جاتی ہے۔'' میری سسکیاں تیز ہوئیں تو میری دوست مونا نے مجھے گلے سے لگا کر تسلی دی۔

''جاناں پلیز۔ اپنے آپ کو سنبھالو یہ صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں ہو رہا بلکہ آج کل ہر گھر کی کہانی ہے اب یہ سوچو کہ اس کا حل کیسے نکلے گا؟ ایک ایسا حل کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

لیکن مجھ میں حوصلہ نہیں تھا میں یہ سوچ رہی تھی کہ میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ میرے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے مجھے نوازا ہوا ہے اچھی شکل وصورت لیاقت قابلیت عزت اور شہرت اچھی سوچ اور اچھے خاندان کی ہو کر بھی میں اس طرح دوسری عورت کے وجود کی مار کھانے پر مجبور ہوں۔'' مونا نے کافی دیر تک مجھے اس معاملے کی نزاکت کے بارے میں سمجھایا اور سمجھ داری سے سب کچھ ہینڈل

کرنے کی نصیحت کرتی رہی۔

شک تو مجھے تھا لیکن کہیں نہ کہیں دل میں یہ تسلی تھی کہ ہوسکتا ہے، یہ سب کچھ میرا وہم ہو اور سرمد قصوروار نہ ہوں لیکن جب آپ کے شکوک حقیقت کا روپ دھار کر آپ کے سامنے آجاتے ہیں تو تب انسان یہ سوچتا ہے کہ کاش یہ شک یقین میں نہ بدلتا۔

میں بھی ان ہی مایوسی کے کانٹوں کا درد اور چبھن سہتے ہوئے گھر آگئی۔ میں براہ راست ان سے جواب نہیں مانگ سکتی تھی۔ اس طرح گھر میں ہنگامہ ہوتا اور میرے بچے ڈر جاتے۔ میں ان ننھے ذہنوں میں خوف کا زہر نہیں بھرنے دے سکتی تھی۔ بچوں کو مکمل گھر اور پرسکون ماحول دینا والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک فرد اپنی ذمہ داری بھول جائے تو دوسرے پر ڈبل ذمہ داری آجاتی ہے اور میں نے کبھی زندگی میں ذمہ داری سے جان نہیں چھڑائی تھی۔

شام کو وہ ہنستے مسکراتے گھر آئے۔

اور کچھ دیر حسب معمول آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر خود کو بغور دیکھ کر مزید مسکراتے رہے باچھیں تھیں کہ کانوں کو چھو رہی تھیں، میں خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

''کیوں نظر لگانی ہے؟''

وہ مجھے اپنی طرف تکتا دیکھ کر پوچھ رہے تھے۔

میں نے نظریں ان کی پشت پر گاڑ کر اداسی سے کہا۔

''وہ تو کب کی لگ بھی چکی۔''

وہ ہنستے ہوئے مڑے۔

اور میرے مقابل کھڑے ہوکر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اب کہیں کونے میں بیٹھ کر وظیفے کرو، نظر سے ہونے والے مزید نقصان سے بچنے کے لیے۔''

''نقصان تو ہوگیا سرمد پراچہ! جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو مزید کا ڈر کیسا؟ ہاں ورد وظیفے والی بات پر عمل ضرور کروں گی کیونکہ اس کے نام کا ورد اسے مسلسل پکارنے سے وہ میری طرف خاص توجہ کر دے تو بگڑے نصیب سنور جائیں گے۔ اس کی محبت ابدی ہے سنوار دیتی ہے۔''

میں نے ان کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے گہرے انداز میں کہا تو وہ چونکے۔

''کیا ہوا تمہارے نصیب کو؟ اچھی بھلی ہو۔ اچھا گھر، پہننا اوڑھنا، مرضی سے لکھنا لکھانا اور سب سے بڑھ کر میرے جیسا کاٹھ کا الوشوہر جسے تم کہتی ہو بیٹھ جاؤ تو بیٹھ جاتا ہے اور کہو اٹھ جاؤ تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسے شوہروں کو شاید کٹھ پتلیوں سے تشبیہ دیتے ہیں نا؟''

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے ان کے طنز کی کاٹ نے مجھے اندر سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک حصہ کہہ رہا تھا چپ رہو، دوسرا حصہ چلا رہا تھا کہ زبان کھولو۔ میں دوسرے حصے کی مان لی۔

''جی! کٹھ پتلیوں کو نچانے والی انگلیاں بدل بھی جائیں تو انہیں ناچنا تو پڑتا ہی ہے۔'' معنی خیز انداز میں کہہ کر میں باہر نکل آئی۔

☆☆☆

میرے لیے وفا ہی کبھی زندگی ہوا کرتی تھی اور اب زندہ نظر آنے کی اداکاری ہی کرنی تھی جو میں کر رہی تھی۔

میرے زوردار قہقہوں کی گونج سن کر میری سماعتوں کے ساتھ ساتھ گھر کے در و دیوار نے بھی حیرت ضرور ظاہر کی ہوگی مجھے بھی اپنی اداکاری کچھ زیادہ ہی اوور ایکٹنگ لگ رہی تھی لیکن شروعات میں سب ایسی ہوتی ہیں رفتہ رفتہ سیکھ ہی جاتا ہے بندہ۔

''جانا! آج بہت خوش لگ رہی ہو؟''

شیما آپا نے زردے کی پلیٹ خالی کر کے چمچ اس میں پٹخا اور پلیٹ کو ٹیبل سے میری طرف کھسکا دیا مجال ہے، وہ اپنا کپ پلیٹ وغیرہ کچن میں رکھنے کی تکلیف بھی گوارا کرتی ہوں۔ میں نوکرانی تھی نا ہر کام

کے لیے۔

''جی آپا! خوشی کی ہی تو بات ہے۔ دو بچوں کے ابا آپ کے چھوٹے ماشاء اللہ سے بڑے نہیں ہوئے بلکہ مزید چھوٹے ہو گئے ہیں۔'' میرے لہجے کی کاٹ انہیں چبھنے لگی تو وہ چونک اٹھیں۔

''مطلب یہ ہوا کہ تمہارے دل و دماغ سے ابھی تک شک نہیں نکلا؟''

میں نے انہیں بغور دیکھا۔

''آپ نے کبھی یہ سب سہا نہیں نا، اس لیے یہ سب کہہ رہی ہیں۔'' میری ساری اداکاری ختم ہو چکی تھی۔

میری بات سن کر ان کی رنگت متغیر ہو گئی اور آنکھیں دھندلی سی لگنے لگیں۔

''بغیر ثبوت کے تم میرے بھائی پر تہمت لگا رہی ہو اور یاد رکھو میں یہ سب کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' انہوں نے خود کو سنبھال کر غصے سے مجھے گھورتے ہوئے وارننگ دی تو میں نے ثبوت والا کاغذ پرس سمیت لا کر ان کے سامنے میز پر پٹخ دیا۔

''یہ دیکھیں۔ اپنے بھائی کے کارنامے۔''

وہ بغور پڑھنے کی کوشش کرنے لگیں اور مجھے پہلی بار ان کی نالائقی پر شدید غصہ تب آیا جب انہوں نے دس منٹ تک کاغذ پر لکھی تفصیلات پر یوں غور کیا پے سلپ اتفاق سے بیوی کے ہاتھ لگ جائے۔ اور جب بارہویں منٹ پر انہوں نے کاغذ میں گھسے اپنے سر کو اٹھا کر مجھے دیکھا اور انتہائی بے بسی سے پوچھا۔

''یہ کیا لکھا ہے؟'' تب میرا جی چاہا اپنا سر دیوار پر دے ماروں۔

''آپا! یہ سرمد کے فون کی ڈیڑھ ماہ کی کال ہسٹری ہے اور اس کے مطابق ایک ہی نمبر پر سینکڑوں کالز اور ہزاروں میسجز ہو چکے ہیں۔ میری سہیلی نے کہا کہ اس نمبر کی تفصیلات بھی نکلوا دیتی ہوں کہ کس کے نام پر ہے اور ایڈریس بھی معلوم ہو جائے گا کیونکہ شناختی کارڈ کا پتا چل جاتا ہے تفصیل میں۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ نہ مجھے اس عورت کے گھر کا پتا چاہیے نہ ہی نام اور دیگر تفصیلات کیونکہ میرا مجرم میرا شوہر ہے کوئی عورت نہیں۔''

میری آواز آنسوؤں کے بوجھ سے بھاری ہو گئی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ نمبر کسی عورت کا ہی ہے؟'' آپا نے نقطہ نکالا۔

''کیونکہ کوئی مرد کسی مرد سے ایک ہی دن اتنی بار اور اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ سرمد کے قریبی دوستوں کے فون بھی آتے ہیں تو منٹ دو منٹ سے زیادہ بات نہیں ہوتی۔''

میری بات سن کر بھی آپا نے اطمینان سے جو جواب دیا، وہ مجھے تپا گیا لیکن سوائے برداشت کے کیا کر سکتی تھی سو میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے اب شوہر دو گھڑی کسی دوست سے فون پر بات بھی نہیں کر سکتا۔ شادی کی ہے، خود کو بیچا تو نہیں میرے بھائی نے۔''

وہ میرے ہاتھ کی بنی چائے کا اڑاتا دودھ پتی کا بڑا سا مگ سامنے رکھے مسلسل بڑبڑا رہی تھیں اور ان کی آواز میری سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ میرا سر مسلسل جاگنے اور رات بھر رونے سے پھٹنے لگا تھا۔ میری شادی کوئی عشق و محبت کی شادی نہیں تھی لیکن ہر شادی شدہ عورت کی طرح میرے لیے بھی شوہر کی وفا اور اعتبار بہت اہم تھے کیونکہ محبت تو اس شخص سے شادی کے بعد ہو ہی گئی تھی اور اعتبار کی بنیادوں پر ہی شادی شدہ زندگی کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ اب تو فضا میں ڈولتی اینٹ پتھر سے بنی اس رشتے کی عمارت بس میں نے ہی اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ میں چاہتی تو یہ بھاری بوجھ کندھوں پر سے ہٹا کر خود کو اس مشکل سے نکال سکتی تھی لیکن اسی بے اعتباری کی ریتیلی بنیادوں پر بنایا گیا یہ محل اگر گر جاتا تو میرے بچے اس میں دفن ہو جاتے۔ میں کسی بھی طرح زندگی گزار لیتی، اچھی تعلیم، قابلیت، اچھی شکل و صورت اور زندگی

گزارنے کے لیے درکار حوصلہ مجھ میں موجود تھا لیکن میرے بچوں کے باپ سرمد محی الدین پرُچہ صاحب ہی تھے۔ کوئی انہیں باپ والی اہمیت، شفقت اور محبت نہیں دے سکتا تھا سو مجھے جذبات میں آکر اپنے بچوں کا مستقبل برباد نہیں کرنا تھا۔ میں آپا کی چسکیوں کی آواز سن کر سوچوں کی وادی سے واپس لوٹ آئی۔

''آپا! آپ یہ نمبر ملا کر تصدیق کرلیں کہ اس نمبر کو استعمال کرنے والی عورت ہے یا مرد۔''

میں نے وہی نمبر ملا کر کر فون انہیں پکڑا دیا۔

دوسری ہی بیل پر کسی مترنم آواز نے فون ریسیو کرکے بڑے اسٹائل سے ہیلو کہا تو شیما آپا کی رنگت ذرا سی متغیر ہوئی۔

''بہن! یہ عطیہ رانی کا گھر ہے نا؟''

شیما آپا نے بڑی چالاکی سے پوچھا اور دوسری طرف سے لڑکی نے (آواز لڑکیوں والی ہی تھی) بڑی ناگواری سے اوہ یو شٹ اپ کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے دکھے ہوئے دل پر آپا کے چہرے کی شرمندگی کا مرہم لگا تو درد کو ذرا سا قرار آ ہی گیا۔ لیکن آپا کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ وہ سوچوں میں گم سر جھکائے بیٹھی تھیں مجھ سے ایک بار بھی نظریں نہ ملا پائی تھیں، انہیں گہرا شاک لگا تھا۔ میں نے انہیں افسوس سے دیکھا اور استغفار پڑھنے لگی۔

☆☆☆

''تو تم میری جاسوسی کرتی ہو؟''

وہ شدید غصے میں تھے۔

میں اس کے جواب کی پابند نہیں ہوں۔

میرے لہجے کی، اس بے اعتنائی کی توقع انہیں نہیں تھی۔ اس لیے پل بھر کے لیے چپ ہو گئے۔

''پوچھو گی نہیں کہ کون ہے وہ لڑکی؟'' وہ ذرا بھی شرمندہ نہ تھے۔

''میں بہت باہمت ہوں لیکن ہمت ہونے سے کوئی پتھر کا نہیں ہو جاتا۔''

وہ صوفے پر بیٹھے تھے ہاتھ میں ریموٹ تھا اور چینلز بدلے جا رہے تھے۔

''آپا کو تم نے بتایا ہے سب؟''

نظریں ٹی وی پر جمی تھیں۔

''ہاں۔ بہت ناز تھا نا انہیں بھائی کے کردار اور اس کی وفا پر۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم عجیب سائی ہو کر رہی ہو۔ لڑو، جھگڑو، شور مچاؤ۔ اس طرح چپ کیوں ہو؟''

وہ الجھے ہوئے سے لہجے میں بول رہے تھے۔

''جب وفا کی گرمی، محبت کی نرمی اور کردار کی پاکیزگی کے ساتھ خدمت بھی شوہر کے دل میں بیوی کے لیے جگہ نہ بنا سکے تو لڑائی جھگڑے گلے شکوے اور شور شرابے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟''

میری بات سن کر وہ کھڑے ہو گئے۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ معاشرتی اور اخلاقی طور پر نہ ہی دین کی طرف سے یہ کوئی قابل مذمت فعل ہے۔ میں جب افورڈ کر سکتا ہوں تو.....''

میں خاموشی سے اندر آ گئی۔ جہاں شاہان نیند میں کسمسا رہا تھا۔ میرے اندر کا سکوت اتنا بڑھ چکا تھا کہ مجھے خود پر کسی قبر کا گمان ہو رہا تھا جس میں مردہ دفن کر دیا گیا تھا اور اب اوپر سے مٹی بھی ڈال دی گئی تھی۔

زندگی کبھی ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ سوچا ہی نہ تھا اور اب جو ہو رہا تھا تو یہ ہی سوچیں کھائے جا رہی تھیں کہ اس بارے میں کیوں نہیں سوچا جاتا۔ میرے پاس اپنا کچھ نہیں تھا جو میں کہہ سکتی کہ شوہر بدل گیا تو میرے سر پر چھت اور میرے بچوں کا ایک محفوظ مستقبل تو ہے۔ بچوں کے مستقبل اور سر کی چھت کی فکر اچھے دنوں میں ہر عورت کو بروقت کر لینی چاہیے۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آئی تھی۔

نہ میرے نام کوئی اکاؤنٹ تھا نہ ہی نقدی یا کوئی جائیداد تھی یہاں تک کہ زیورات بھی سرمد نے

یہ کہہ کر بیچ دیے تھے کہ ہر سال زکوٰۃ دینی پڑتی ہے آج کل آرٹیفیشل جیولری اتنی پیاری آئی ہوتی ہے کہ سونے کی چمک اور خوبصورتی کو پیچھے چھوڑتی ہے ان پیسوں سے گاڑی خرید کر رینٹ پر دے رکھی تھی۔

کبھی میں نے پوچھا ہی نہیں کہ سرمد مہینے کے کتنے پیسے ملتے ہیں؟ اور یہ پیسے تو میرے ہوں گے کیونکہ زیور بھی میری ہی ملکیت تھا۔ میں وہی پیسے جوڑ کر کچھ جمع کر لیتی تو آج خود کو اس قدر بے بس تو محسوس نہ کرتی۔ نیند کی مہربانی تک میں ان ہی سوچوں کی وادیوں میں امید کی پریوں کا خوشی کے جگنوؤں کا تعاقب کرتے کرتے تھک کر گر گئی تھی پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں؟

☆☆☆

اسی سرد جنگ میں ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

وہ بہت دنوں سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن میں سننا نہیں چاہتی تھی۔

میں حسب معمول سر جھکائے کاموں میں مگن رہتی اور آپا آ کر چپ چاپ لاونج میں بیٹھ جاتیں۔ میں ٹی وی لگا کر دے دیتی تو وہ خلاف عادت ٹاک شو اور حالات حاضرہ کے پروگرام دیکھتی رہتیں حالانکہ انہیں یہ سب ایک منٹ کے لیے بھی دیکھنا پسند نہیں تھا لیکن اتنے دنوں سے گھر میں ٹی وی بولتا یا بچے ہم تینوں بڑے بالکل چپ ہو کر رہ گئے تھے۔

اب آپا میرے ساتھ نظریں ملا کر بات نہیں کر رہی تھیں۔

یہ خاموشی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

اور طوفان کا اندیشہ ہم دونوں کے دلوں میں بیٹھ چکا تھا میں اور آپا اسی لیے سہمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

میں بچوں میں مگن تھی کہ ان کی آواز آئی۔

''سنو!'' آج مجھے ان کی آواز بھی ان ہی کی طرح قطعی اجنبی لگ رہی تھی۔

میں نے بنا کچھ کہے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں لیکن تم بچوں میں ہی مگن رہنے لگی ہو، مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں تمہارے پاس۔''

کافی عرصے بعد انہوں نے مجھ سے اتنی لمبی بات کی تھی میں نے شاہان کی نیپی بدل کر پل بھر کے لیے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری سماعتوں کو صحرا ہوئے اک عرصہ بیت چکا ہے اب بوند دو بوند سی صداؤں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انتظار کی تپتی ریت کے لیے تو محبت اور توجہ کی تیز بارش چاہیے ایسی جل تھل بارش کہ جو صدیوں کی پیاس بجھا دے۔''

وہ میری بات سن کر طنزیہ انداز میں ہنسنے لگے۔

''افسانوی باتیں، خشک فلسفہ فرضی اور ڈائیلاگ یہ ہی تو تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے یار! میں نے تم جیسی بورنگ عورت کوئی نہیں دیکھی آج تک۔''

میں نے ان کی کڑوی زہریلی سی بات ان سنی کر دی اتنی چھوٹی بات اور اتنا گھٹیا طعنہ سن کر جواب دینا بھی میری ذات کی توہین تھا۔ شاہان کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے گڑیا کے ساتھ ہی لٹا دیا اور ان دونوں پر چادر ڈال کر خود خاموشی سے باہر نکل آئی۔ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ جو بات انہوں نے کرنی ہے، وہ ضرور کریں گے اور جس بات کی توقع مجھے ان سے تھی۔ وہ بچوں کی موجودگی میں کہنی تو آسان تھی لیکن سنتی بہت مشکل تھی وہی ہوا وہ میرے پیچھے پیچھے لاؤنج میں آ گئے۔

''میری بات ٹھنڈے دل سے سننا جانا!'' آج انہوں نے بھی نون غنہ کھا لیا تھا۔ اور میرا جسم ہی ٹھنڈا ہو رہا تھا اگلے پل کی تیاری میں دل ٹھنڈا کیا کرتی۔

''دیکھو بیگم! مجھے تمہید باندھنی پسند نہیں اور نہ ہی آتی ہے اس لیے صاف بات کرتا ہوں، میں کئی دنوں سے یہ توقع کر رہا تھا کہ تم یا آپا مجھ سے اس سلسلے میں بات کرو گے تو میں سب کھل کر کہہ دوں گا لیکن تم دونوں کی خاموشی میری محبت کو مجھ سے دور لے جا رہی ہے۔ وقت کم ہے اس کے لیے رشتے آ رہے

ہاں اور ہم نے جو کرنا ہے جلدی کرنا ہے صاف بات سنو کہ میری زندگی میں ایک لڑکی آ گئی ہے جس سے میری بہت ذہنی ہم آہنگی ہو چکی ہے اور ہم دونوں کو لگ رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوئے ہیں۔''

وہ کتنی سفاکی سے یہ سب کہہ رہے تھے یہ سوچے بغیر کہ اس کی زبان خنجر بن کر میرے وجود کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

شاید میں اس وقت زبان کی دھار سے ہزار حصوں میں تقسیم کر دی گئی تھی جب میں درد پر قابو پاتے ہوئے ان کے سامنے کھڑی ہوئی تو اس وقت بھی میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔

''ایک ہی بار سب بول دیں مجھ میں بہت حوصلہ ہے۔''

وہ نظریں جھکا کر شاید مناسب اور کم تکلیف دہ الفاظ چن رہے تھے۔

''ہم دونوں نے مل کر شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' ان کے الفاظ کے تھپڑ میری روح پر پڑ رہے تھے۔ میں نے اپنی روح پر لگے طمانچوں کے نیلے نشان دیکھے تو بے اختیار دل کو تھام لیا۔

''وہ تو محبت کے ہاتھوں مجبور ہے لیکن اس کی فیملی اس شادی کے حق میں نہیں انہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں بیوی بچوں کو چھوڑ دوں۔ یہ ہی ہماری شرط ہے لیکن تم جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا میرے بچوں میں میری جان ہے۔ میں ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے بمشکل اس شرط سے جان چھڑائی ہے۔''

وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور میں نے تخت پر بچھی چادر کو زور سے بھینچ کر اپنے اندر کی چیخوں کو روکنے کی کوشش کی جس میں کامیاب ہو جاتی اگر وہ یہ نہ کہتے کہ.....

''جانا! چند دن کے لیے تم اور بچے میکے چلے جاؤ میں دوسرے گھر کی ارینجمنٹ کر رہا ہوں لیکن کرایے داروں نے کچھ وقت مانگا ہے۔ یہی کچھ دس پندرہ دن پھر تم لوگ وہاں شفٹ ہو جانا، بہت اچھا گھر ہے۔''

وہ کتنی آسانی سے مجھے اور میرے بچوں کو اس گھر سے بے گھر کرنے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے حیرانی اور بے یقینی سے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور چبا چبا کر کہا

''مسٹر سرمد محی الدین پراچہ! میری ذات میری انا میری خودداری نے بھی ایک شرط رکھی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ جس لوہار کے ہاتھ جاناں واصف جیسا ہیرا لگ گیا ہے۔ وہ لوہار اس ہیرے کی قدر و قیمت سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اسی لیے اس کو چھوڑ کر واپس اس جوہری کے پاس پہنچ جائے جس نے اسے تراشا ہے اور جس کو اس ہیرے کی اصل قدر و قیمت کا احساس بھی ہوگا۔ سو میں یہ گھر خالی کر کے جا رہی ہوں جسے لانا ہے، یہاں لے آئیں۔''

میرے لہجے کی قطعیت نے ان کو سمجھا دیا تھا کہ میں جو کہہ رہی ہوں، بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔

وہ بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے

''جاناں واصف! ٹھیک ہے، اس ہیرے سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں، میں لوہار ہی بھلا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے بچے صرف اور صرف میرے ہوں گے۔ میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی میرے بچوں کو مجھ سے چھین لے مجھ سے دور کر دے۔''

ان کی بات سن کر میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا یہ شاید یقین ٹوٹا تھا کہ وہ جتنے بھی ظالم ہو جائیں۔ بچوں سے میری محبت اور انسیت سے واقف ہوتے ہوئے کبھی مجھے اس تکلیف سے نہیں گزرنے دیں گے لیکن ایسا نہ ہوا

میں خاموشی سے جا کر گڑیا کے ساتھ لیٹ گئی۔ کہنے سے زیادہ کر گزرنے والی میری عادت سے سب کی طرح وہ بھی باخبر تھے۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنی آنکھوں پر کلائی رکھ کر آنسوؤں کی جھڑی چھپانے

کی کوشش کی۔ میں خود کو ایسے شخص کے سامنے کمزور ظاہر نہیں ہونے دے سکتی تھی جس کی نظر میں میری اہمیت اک تنکے کے برابر بھی نہیں تھی۔

محبت کی کہانیوں کی لکھاری جاناں واصف کی ازدواجی زندگی میں محبت کا ایسا قحط پڑ چکا تھا کہ ناجائز بھی جائز لگنے لگا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ زہر کھا کر سو جاؤں لیکن دو بچے مجھے اس ارادے سے باز رکھ رہے تھے میں نے سوچا ایک ہی بیڈ پر لیٹ کر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں اور وہ عورت جو یہاں نہیں ہے۔ وہ ان کے اتنے قریب ہے کہ اس کی قربت اور موجودگی نے دو پیارے بچوں اور ایک وفادار بیوی کو بھی ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان بیڈ پر بچے سو رہے تھے اور بچوں کے لیے میں کچھ بھی برداشت کر سکتی تھی شاید سوکن بھی۔

☆☆☆

زندگی ایسی بے رونق اور اداس ہو جائے گی، یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ رات مجھ پر قیامت کی طرح گزری وہ دکھ کا صور پھونک گئے تھے اور میری ذات روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں منتشر تھی۔ زمین آسمان جیسے ایک ہو چکے تھے۔ شاہان کے رونے سے آنکھ کھلی تو دیکھا وہ بیڈ پر نہیں تھے۔

باہر نکلی تو دیکھا دروازہ کھلا تھا اور سر بدبغیر ناشتے کے جا چکے تھے میں نے اک ٹھنڈی سانس لے کر دروازہ بند کیا اور کچن میں آ گئی لیکن چولہے کے پاس شیما آپا کھڑی تھیں میری آہٹ پا کر وہ مڑیں اور میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مطلب پتھر بھی روتے ہیں؟ پتھروں سے چشمے پھوٹتے تو دیکھ رکھے تھے روتے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''جاناں! تم کیوں اٹھ گئیں۔ میں شاہان کی آواز سن کر دودھ بنا رہی تھی، وہ دودھ پی کر سو جاتا ہے تم یہ دودھ لے جاؤ اور اس کے پاس جا کر سو جاؤ میں جانتی ہوں تم رات بھر نہیں سوئیں۔''

آپا کی بات سن کر میں حیرانی سے انہیں یوں تکنے لگی کہ وہ بھی شرمندہ سی نظر آنے لگیں۔

پہلی حیرانی تو اس بات کی تھی کہ اتنے سالوں میں پہلی بار انہوں نے میرے نام کا نون غنہ کھایا نہیں تھا اور دوسری حیرانی ان کے اس قدر احساس کرنے کی تھی کیونکہ یہ ٹھیکہ تو شروع سے میں نے ہی اٹھا رکھا تھا۔

''آپا! اب یہ ایک دن کی بات تو ہے نہیں اب تو یہ روز ہوگا اور کیا آپ روز یوں مجھے شاہان کے لیے دودھ بنا کر دیا کریں گی؟'' آنکھوں کی نمی چھپاتے میں نے چائے کا پانی رکھنے کے لیے ساس پین اٹھایا تو آپا نے تھرموس اٹھا کر ٹرے میں رکھا اور دو کپ بھی ساتھ ہی رکھ دیے۔

''کئی سالوں سے روز تم میرے لیے چائے بناتی ہو آج سوچا کہ میں یہ کام کر دیتی ہوں۔ یہ تو مجھے پتا ہے کہ میں تمہاری چائے جیسی مزے دار چائے نہیں بنا سکتی لیکن پھر بھی آج پی لو میرا دل رکھنے کے لیے۔''

وہ مسلسل مجھے یوں حیران کیے جا رہی تھیں جیسے ان کا چھوٹا مجھے پریشان کرنے پر تلا ہوا تھا۔

شاہان کو فیڈر بنا کر دوبارہ سلا دیا تو میں آپا کے پاس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

''تم نے سچ کہا تھا جاناں! میرا چھوٹا واقعی بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔''

وہ میرے سامنے نظریں جھکا کر بیٹھی تھیں۔

''میں بند گلی میں کھڑی ہوں آپا! احساس توہین کی گھٹن اتنی زیادہ ہے کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی کیوں کہ میرے ساتھ دو معصوم زندگیاں بھی برباد ہو جائیں گی۔''

میں رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسوؤں پر اپنا اختیار کھو چکی تھی

''میرے سامنے رونا نہیں جاناں! تم بہت بہادر لڑکی ہو۔ میں نے تمہیں کبھی روتے نہیں دیکھا۔ ہاسپٹل کے لیبر روم میں جب درد سے تڑپتے ہوئے

بھی تم نے مسکرا کر کہا تھا۔ اپنا درد سہنا بہت مشکل تو ہے لیکن اتنا بڑا مقام عورت کو یوں ہی تو نہیں مل جاتا مشکل راستوں سے گزر کر ہی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جا سکتا ہے۔''

تب میں نے دل میں سوچا تھا کہ کتنی سخت جان ہو تم کہ ایسے حال میں بھی نہ روئیں نہ فریاد کی۔ یاد ہے جب گڑیا ہاسپٹل میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس وقت میری اور سرمد کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ہم دونوں بار بار رو کر اس کے لیے دعائیں کر رہے تھے لیکن اس وقت بھی تم نے نے ہمت نہ چھوڑی اور بجائے رونے کے ہمارے آنسو پونچھتی رہیں

دیکھو، اب بھی رونا نہیں ہے۔ تمہارا ایک ایک آنسو میرے دل پر گر رہا ہے۔''

ان کی بات سن میں تڑپ اٹھی۔ بڑی بہن کی کمی ساری زندگی محسوس ہوتی رہی تھی۔ اسکول کالجز میں سہیلیاں جب اپنی آپیوں باجیوں کا ذکر کرتی تھیں اور ان کے دیے گئے گفٹ دکھاتیں تو مجھے عجیب سی اداسی گھیر لیتی تھی۔ شادی کے بعد شیما آپا جیسی بڑی نندملیں تو بڑی حسرت سے یہ ہی سوچا تھا کہ کاش یہ ہی کمی سرمد کی زندگی میں بھی ہوتی۔ لیکن اب مجھے اپنی اس گری ہوئی سوچ پر افسوس ہو رہا تھا۔

''تم فکر نہ کرو کیونکہ فکروں کے لیے شیما آپا ہے نا''

انہوں نے تسلی کے لفظ ہی نہیں بولے بلکہ آنسوؤں کے لیے اپنا کندھا بھی پیش کر دیا۔

''میں اپنا اور بچوں کا سامان رکھتی ہوں بس تھوڑے سے کپڑے اور بہت سی یادیں ہیں۔ ہو سکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پر بھی یادوں کی گٹھڑی نفرت کی نہر میں پھینک کر کچھ ہلکی پھلکی ہو سکوں لیکن ابھی تو انہیں اٹھا کر بہت سا بوجھ دل پر سہنا پڑے گا۔ میری سانس تو ابھی سے پھول رہی ہے۔''

میں نے بال سمیٹ کر جوڑا بنایا اور اٹھنے لگی تو آپا نے کلائی پکڑ لی۔

''مجھے مایوس مت کرنا جاناں! میں تمہیں تمہارے لیے نہیں ان دو معصوم بچوں کے لیے کہہ رہی ہوں کہ مجھ پر بھروسہ رکھو اور چپ چاپ اس گھر میں بیٹھی رہو۔'' ان کا انداز ملتجیانہ تھا۔

''آپا! میری ایک شرط ہے، مجھ میں کوئی کمی ہے تو بتائیں پھر میں رک جاؤں گی۔'' میں واپس ان کے پاس بیٹھ چکی تھی انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''کمی بتائی تو مان جاؤ گی نا؟'' وہ تصدیق چاہ رہی تھیں۔

میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''کمی تو ہے جاناں! بہت بڑی کمی۔'' ان کا انداز افسردہ تھا

میں ششدر سی انہیں دیکھے گئی کہ جانے کون سی کمی گنوائیں گی۔ میں تو توقع کر رہی تھی کہ وہ میری خوبیاں گنوائیں گی لیکن انہوں نے تو کمی ڈھونڈ ہی لی۔

مجھے شک ہوا کہ کہیں انہوں نے مجھے صبح جلدی نہ اٹھنے اور سرمد پر یہ ظاہر کرنے کہ میں جگاتی رہی آپ جاگے نہیں والا جھوٹ نہ پکڑ لیا ہو۔

''بیوی ہونا سب سے بڑی کمی بنا دی ہے ان مردوں نے۔ تم میں ایک یہ ہی کمی ہے کہ تم بیوی ہو۔ گھر کا خیال، بچوں کی دیکھ بھال اور میاں کے کام کاج کے ساتھ اس کی بہن کو بھی خوش رکھنے اور برداشت کرنے کے ٹھیکے سمیت تم اپنے سارے فرض نبھائے جا رہی ہو لیکن مرد کو بیوی کے سارے فرائض نبھاتی عورت کے ساتھ ایک ایسی محبوبہ بھی چاہیے جو اس کے آنے سے پہلے سج سنور کر خوشبوؤں میں بسی ناز نخرے دکھاتی رہے مزے دار کھانا بنائے کھانے میں اسے ادرک لہسن کی خوشبو بہت پسند ہوتی ہے لیکن بیوی کے ہاتھوں یا بیوی کے وجود میں بس کر یہ بدبو بن جاتی ہے۔

اسے گھر لوٹتے ہی بچوں کے قصے نہیں سننے ہوتے بلکہ محبوبہ کے منہ سے یہ سننا ہوتا ہے کہ آپ

آرام کریں۔ میں سر دبا دیتی ہوں۔

اسے دن بھر کاموں میں مصروف رہنے والی۔ شام تک تھکی ہاری الجھی بکھری عورت نہیں پسند، وہ تو سنورے بالوں اور فریش چہرے پر مسکراہٹ سجائے بات بات پر ہنسنے قہقہے لگانے والی عورت پسند کرتا ہے۔

گھر آکر وہ باہر والی سے اس کا مقابلہ ضرور کرتا ہے اور یاد رکھو ہزار خوبیوں کے باوجود گھر والی اس مقابلے میں شکست کھا جاتی ہے کیونکہ اس میں محبوبانہ ادائیں نہیں ہوتیں۔''

وہ شاید بولتے بولتے تھک گئی تھیں قریب رکھے جگ سے پانی کا گلاس پی کر مجھے بغور دیکھتے ہوئے افسردہ انداز میں بولیں۔

''جانتی ہو باہر والی جیت کر بہت بڑی مات دے جاتی ہے گھر والی کو۔ شاید اس راز کو تم سے مزید چھپانا ٹھیک نہیں جو میں برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھی ہوں۔ تم نہیں جانتیں لیکن آج اعتراف کرتی ہوں کہ..... میں بھی مات کھائی ہوئی عورت ہوں۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا آنسو ان کے گالوں پر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

شیما آپا بہت خوب صورت تھیں اور اس وقت بھی ان کے دھوپ چھاؤں سے چہرے پر آنسوؤں کی سرخی بہت سج رہی تھی۔

''میں کچھ بھی نہیں آپا! بھائیان تو بقول آپ کے عظمت کا مینار ہیں؟'' وہ آنسو پونچھ کر چند لمحے خاموش رہیں شاید فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ بولیں یا چپ رہیں۔

''کچھ سال پہلے عبید رضا نے دوسری شادی کر لی تھی اور اب بھی وہ اسی کے پاس ہوتے ہیں۔'' وہ اتنی آہستگی سے بولیں کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگا جیسے میں نے غلط سنا ہے۔

''آپا! آپ نے جو کہا، وہ پھر سے کہیں پلیز۔''

وہ دوبارہ بولیں۔

''کئی سال سے میرے شوہر نے مجھ پر سوکن کا عذاب مسلط کیا ہوا ہے۔''

ان کے لیے یہ الفاظ دہرانا تکلیف دہ تھا یہ ان کے چہرے کی رنگت اور ہونٹوں کی لرزش سے سمجھا جا سکتا تھا۔

ان کے یہ جملے میرے سر پر بم کی طرح لگے۔ میں کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ انہوں نے مزید انکشافات کرنے شروع کر دیے مطلب مزید دھماکے کر رہی تھیں۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا؟''

''سچ بول کر بوجھ ہلکا کر رہی ہوں بہت تھک چکی ہوں کانچ کے ٹکڑوں پر ننگے پیر چلتے چلتے۔ ایسے میں فاصلہ کم بھی ہو تو منزل بہت دور ہو جاتی ہے''

میں نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میری قمیص کا کندھا بھیگ کر جسم سے چپک گیا تھا لیکن آنسوؤں کا وہ سیلاب جس پر نہ جانے کب سے بند باندھا ہوا تھا انہوں نے۔ آج وہ بند ایسا ٹوٹا کہ نہ پانی کا زور کم ہو رہا تھا نہ ہی شور۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔

اور جب طوفان گزر جانے کے بعد والی خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے ان سے پوچھا۔

''کیا سرمد جانتے ہیں سب؟''

وہ سوجی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہیں۔

''اکلوتے بھائی کو کچھ بتایا ہے تم نے؟ کتنا کچھ گزر رہا ہے تم پر لیکن۔'' وہ رک گئیں۔

''جانتی تھی کہ سرمد کو خبر ہوگی تو وہ اسے گریباں سے پکڑ کر ضرور پوچھے گا اور وہ جواباً لڑے گا، جھگڑے گا شاید اسے مارنے بھی لگے نقصان کس کا ہوتا میرے بھائی کا، وہ عبید کے مقابلے کا نہیں تھا اس لیے چپ رہی۔ وہ روز وہیں ہوتا ہے اور میں گھر پر اکیلی۔ بیٹے کو ان حالات سے دور رکھنے کے لیے ہاسٹل بھیجا ہوا ہے۔

نہ وہ خرچا دیتا ہے، نہ ہی کوئی پیسہ۔ کبھی کبھی تو پورا ہفتہ گھر نہیں آتا لیکن میں نے کبھی تم لوگوں پر ظاہر نہیں کیا کہ رات کے اندھیرے سے ڈر جانے والی آپا گھر میں کئی کئی دن اکیلی ہوتی اور رات رات بھر جاگ کر معمولی سی آہٹ پر بھی ڈر کر بیٹھ جاتی۔ ان راتوں میں جتنی شدت سے میں نے صبح ہونے کی دعائیں مانگی ہیں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔''

میں حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''لیکن آپا آپ کا گزارا کیسے ہوتا ہے؟'' وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں مجھے لگا اس سوال کے بعد ان کا سر مزید جھک گیا ہے بلکہ ٹھوڑی سینے سے جا لگی تھی۔

''آپا! پلیز بتائیے نا؟'' میرے اصرار نے انہیں بولنے پر مجبور کیا۔

''صبح تک بھوکی ہوتی ہوں یہاں آکر جو کھالیا سو کھالیا۔'' ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''آپا! یہ..... یہ..... کیا کہہ رہی ہیں؟'' میرا دل درد سے اور سر شرمندگی سے پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ آنسو بے اختیار آنکھوں سے رواں ہو چکے تھے۔

میں کبھی ان کے آنے سے پہلے انڈے چھپا دیتی تھی تو کبھی دودھ اور ان کے نوالوں پر بھی نظر رکھتی تھی کہ شاید اس طرح ان کو نظر ہی لگ جائے۔

اور وہ جو کہتی تھیں کہ صبح سویرے میاں کے ساتھ ناشتے میں یہ کھایا ہوا ہے کبھی وہ۔ میں حیرت سے سوچتی تھی کہ ان کا پیٹ ہے یا عمرو کی زنبیل بس اس میں جو بھی ڈالو اور غائب۔ تو آپا بھوکی ہوتی تھیں؟''

''گھر جاتے ہوئے اگر یہاں سے کچھ لے گئی تو خیر ورنہ تو اگلی صبح تک میں بھوکی ہی رہتی ہوں چھوٹا اگر کوئی چیز لا دیتا ہے تو وہ چھپا کر رکھ لیتی ہوں اور کبھی وہ میرے گھر حال احوال دریافت کرنے آتا ہے تو میں اسے کپ چائے کا بھی نہیں پلا سکتی۔

جب عبید خود کسی وقت گھر آتے ہیں، تب اپنے لیے سودا سلف بھی لاتے ہیں اور دودھ چائے وغیرہ بھی۔

تب میں کھانا بنا کر ان کے سامنے رکھ دیتی ہوں اب تو سچ کہتی ہوں، ان کے لائے ہوئے کھانے کا نوالہ اچھا ہی نہیں لگتا بھوکے رہنے کی عادت بھی پڑ گئی ہے دن بھر ادھر رہتی ہوں جو جی چاہے کھا لیتی ہوں، پی لیتی ہوں، میرے بھائی کے علاوہ شہر میں کوئی ہے بھی نہیں جو گھر آئے اور میری حالت کا اندازہ لگائے اس لیے اک عرصے سے یہ سب چھپا ہوا ہے۔''

میں دم بخود ظلم زیادتی اور صبر و استقامت کی یہ تلخ حقائق پر مبنی کہانی سن رہی تھی۔

''آپا! پلیز بس کر دیں۔ مجھ میں مزید طاقت نہیں یہ سب سننے کی۔'' میں ان سے لپٹ کر سسکنے لگی تو وہ میری کمر تھپک کر تسلی دینے لگیں۔

''یہ مرد بات بات پر چار شادیوں والے حق کا حوالہ دیتے ہیں لیکن کبھی انصاف اور برابری والے حق کی بات نہیں کرتے۔ عدل ان کے بس کی بات نہیں پھر کیوں تکلیف دیتے ہیں بیوی کو؟''

وہ بالکل سچ کہہ رہی تھیں۔ عدل مرد کے بس کی بات ہرگز نہیں۔ مرد تو ماں اور بیوی کے درمیان انصاف نہیں کر پاتا جن کے حقوق بالکل الگ الگ ہیں وہ دو تین چار بیویوں کے درمیان عدل کا معاملہ کیسے رکھ سکتا ہے؟''

میں نے ان سے سوال کیا۔

''آپا! جب اتنا کچھ سہہ رہی ہیں تو انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

وہ پل بھر تو بھیگی پلکیں جھپک کر مجھے دیکھتی رہیں۔

''میرا بیٹا، میرا عمر اس کی وجہ ہے وہ بہت قابل ہے ذہن ہے اسے کچھ خبر نہیں وہ ٹوٹ جائے گا۔ بکھر جائے گا میری ساری عمر کی کمائی ہی بس وہ ہے سوچو کہ ماں کیسے اپنی پونجی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

میرا ایک ہی ایک بھائی ہے۔ باپ کے بعد وہ ماموں کے در پر آجائے گا تو جتنا بھی اچھا ماموں ہو باپ تو نہیں بن سکتا عبید کو بچوں کی خواہش تھی لیکن

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

مزید بچوں کی پیدائش اس کی جوان اور کم عمر بیوی کے بس میں بھی نہیں۔ وہ ایک رسولی کا آپریشن کروا چکی ہے کوئی بڑا مسئلہ ہوگیا تھا اس کے بعد اس کی کوکھ بھی زرخیز نہ رہی بنجر ہوگئی۔

بیٹے کی بڑی حسرت ہے اس عورت کو۔ مجھے عبید نے خود بتایا تھا اور اس ناامیدی کے بعد تو عبید بھی بیٹے کی قدر کرتا ہے۔ میں سوچتی ہوں عمر کچھ بن جائے تو میری مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔ وہ گھر آتا ہے چند دنوں کے لیے تو باپ اسے مکمل وقت دیتا ہے گھماتا پھراتا ہے دوسری بیوی فون پر فون کرتی رہتی ہے لیکن عبید مکمل بیٹے میں مگن رہتا ہے یہ سب سہہ کر اسے ایک مکمل زندگی دینے کی کوشش جاری ہے۔ دیکھو کب تک ہمت جواب نہیں دیتی۔''

آپا کے جواب نے مجھے مزید اداس کردیا۔

''مطلب اپنی کوئی زندگی نہیں آپا؟''

وہ مسکرادیں۔

''ارے پگلی! عورت کی اپنی کون سی زندگی ہوتی ہے؟ پہلی والدین کی پھر شوہر کی پھر بچوں کی۔ بس وہ اس گمان میں ہی خوش رہتی ہے کہ زندگی میری ہے۔ بسر بھی میں ہی کررہی ہوں لیکن بیٹا بسر کرنے اور جینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ زندگی جینے کا تو کبھی موقع ہی نہیں ملتا عورت کو۔''

''لیکن آپا! مجھے اپنی بے عزتی نہیں بھولے گی کبھی بھی میں اس شخص کے ساتھ عمر کیسے گزاروں گی جس پر بھروسا ہی نہیں کرسکتی میں صرف اپنے کندھوں پر اس ازدواجی زندگی کا مزید بوجھ نہیں اٹھاسکتی۔''

میرا جواب سن کر وہ بولیں۔

''کیوں نہیں اٹھاسکتیں یہ بوجھ؟ باپ بھائیوں کے ساتھ ساتھ پورے خاندان کی عزت کا بوجھ سر پر اٹھا کر سیدھے رستے پر چلتے رہنے کی عادت عورت کو بوجھ اٹھانے کی ہمت دے دیتی ہے۔

یہ ہی تو تربیت ہوتی ہے۔ رب کی طرف سے ودیعت شدہ خوبیوں کا مرقع ہوتی ہے عورت۔ صنف نازک کو فولادی عزم بخشا ہے اللہ نے۔''

میں چپ رہی۔ کیا کہہ سکتی تھی۔

ہمیشہ اونچی ناک والی نندجاناں جب گھر جاکر بھابھی کے سامنے ٹوٹے کی، بکھرے گی تو کتنی حقیر ہوجائے گی پل بھر میں۔ میری بھابھی تو ہماری محبت اور انڈرسٹینڈنگ کی مثالیں دیتی ہیں۔ مہمانوں والا پروٹوکول دیتی ہیں اور یوں سب ختم ہوجائے گا تو کتنی گر جاؤں گی میں اپنی نظروں میں بھی اور ان سب کی نظروں میں بھی۔ بنا قصور سزا پانا ہمارے مقدر میں ہی کیوں لکھا جاتا ہے؟

''جاناں! تم فکر نہ کرو میں کیسے سیدھا کرتی ہوں اسے تم دیکھ لینا۔''

میں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کر کچن کی طرف جارہی تھی کہ آپا کے لیے جلدی سے کچھ کھانے کے لیے لاؤں لاؤنج کے شیشے میں پل بھر کے لیے میں نے خود کو بغور دیکھا تو مجھے اپنا آپ ذرا بھی اچھا نہ لگا۔

''الجھے ہوئے بے رونق سے بال اور ویسا ہی بے رونق چہرہ جس پر اک مدت سے فیشل ویکسنگ یا تھریڈنگ نہ ہوئی تھی بڑھی ہوئی بھنوؤں نے مجھے چڑیلوں والی لک دے رکھی تھی۔ گردن جو کبھی صراحی دار تھی اب سوج چکی تھی آنکھوں تلے گہرے حلقے پڑے تھے پپوٹے سوجے ہوئے تھے یہ تو رونے کی وجہ سے ہیں میں نے خود کو تسلی دی۔

آنکھوں میں جو چمک کاجل لگانے سے آتی ہے وہ یوں غائب تھی جیسے پاکستان میں مستقل بجلی غائب ہی رہتی ہے۔ ہونٹ گہرے جامنی لگ رہے تھے کب سے شہد اور چینی کا سکرب ہونٹوں کے لیے بنا کر رکھا ہوا تھا لیکن فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ استعمال بھی کرلیتی۔

''صرف شکل نہیں کپڑے بھی دیکھو اپنے۔''

آپا نے مجھے بت بنے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر دیکھا تو بے اختیار کہہ دیا۔

میں نے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ تین رنگ کے ملگجے اور شکنوں بھرے کپڑے میرے جسم پر پھنسے ہوئے تھے۔ میں جو اچھے برینڈز کے جدید فیشن کے

ملبوسات پہننے کی عادی تھی اب خود سے بالکل لاپروا ہو چکی تھی میں نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

''مطلب یہ کہ میں موٹی بھی ہوگئی ہوں؟''

میں نے اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر پھنسی قمیص کی طرف دیکھا اور خود اپنے آپ سے نظریں چرالیں۔ واقعی بہت بڑی کمی تھی مجھ میں۔ مرد صورت کا پجاری ہے اور صورت کو بدصورت کرنے والے عوامل سے نظریں چرا کر سرمد تفریح میں مگن تھے تو وجہ انہیں میں نے ہی فراہم کی تھی۔

''تم تو خود کو بڑی سمجھ دار اور اوور سمارٹ سمجھتی تھیں جاناں بی بی! اب پتا چلا کہ تم صرف خوش فہم ہو اور کچھ نہیں؟'' میں نے خود کو اپنی اوقات یاد دلائی۔

☆☆☆

اس بھیانک خواب نما حقیقت کی تلخی کو پیتے کئی سال گزر گئے

بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا لیکن کہیں کچھ ایسا بھی تھا جو ٹھیک نہ ہوا تھا

محبت کی کہانیاں لکھنے والی جاناں کی کہانیوں میں اب محبت کے ساتھ بے وفائی کا درد ضرور ہوتا تھا شاید اس طرح میں اندر کا درد کم کرتی رہتی تھی لیکن کچھ درد صرف ہمارے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی ہمیں چھوڑ کر نہیں جاتے ایسا ہی درد میرے اندر بھی بسا ہوا تھا۔

آج ہماری شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔

شیما آپا بچوں کے پاس تھیں اور ہم دونوں آؤٹنگ پر نکلے ہوئے تھے۔

''یار! آج بھی پہلے دن کی طرح فریش اور اسٹائلش لگ رہی ہو وہی ساڑھی پہننے کا منفرد انداز اور وہی اونچی ہیل کی ٹک ٹک کی آواز دھڑکنوں کی تال جیسی دھک دھک سے ملتی جلتی۔''

ان کی آنکھیں زبان سے بھی کچھ ہاتھ آگے تھیں۔ وہ جو کہہ رہی تھیں وہ سننا ہر عورت کا ارمان ہوتا ہے کبھی میرا بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب تو محض مخملی تبسم ہی لبوں پر رہتا تھا۔ میں انہیں کیسے بتاتی کہ دل کے زخم بھرنے جیسے تو ہو چکے تھے لیکن مخصوص موسموں میں پرانے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں درد میں وہ شدت نہیں رہتی لیکن درد تو ہوتا ہی ہے۔

''ہاتھ ادھر دو۔'' سرمد نے خوب صورت سرخ ڈبیہ جس پر سنہری رنگ کی نازک سی تتلی بنی ہوئی کوٹ کی جیب سے نکالی اور ڈائمنڈ کی نازک سی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا کر میری ہتھیلی کی پشت پر اپنے لب رکھ دیے۔

''ہیپی اینورسری جانم!'' ان کی جذبات سے بوجھل آواز نے میری سماعتوں میں رس گھولا۔

''کچھ تو کہو ناڈیر؟''

میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں مختصر نظم پڑھی۔

''سنو جاناں!
برسوں پہلے تم نے
میرا ہاتھ
اپنے گلاب لبوں سے
چھو لیا تھا
آج تک میری اس ہتھیلی پر
تتلیاں منڈلاتی ہیں۔''

وہ اس خوبصورت اظہار پر جیسے جھوم اٹھے تھے میں نے شرمیلی سی مسکان لبوں پر سجا کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کیک کاٹا اور پھر مزے دار کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور سنتے یہ حسین وقت گزار کر گھر واپس آگئے۔

''آپا بچے سو گئے ہیں کیا؟'' سرمد بیڈ روم میں جا چکے تو میں نے ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہل ہل کر وظیفہ پڑھتی آپا سے پوچھا انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر خاموشی سے جواب دے دیا۔

میں ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ وظیفہ ختم کرتے ہی میرے منہ پر پھونک مارتے ہوئے بولیں

''اب پریشانی کے دن بیت چکے ہیں جاناں! اب بھی تو کیوں چین سے نہیں جیتی تیری آنکھیں

آج بھی کہہ رہی ہیں کہ اندر سے اکیلی ہے بالکل اکیلی۔''

وہ جو کہہ رہی تھیں، سچ ہی تو تھا کسی ماہر مصنف کی طرح انہوں نے عین وقت پر میری کہانی کا عنوان بھی بدلا اور انجام بھی۔

بے شک تقدیروں کا لکھاری تو اللہ ہی ہے، اسی نے ہماری کہانیوں میں کچھ ہیرو اور کچھ ولن لکھ رکھے ہوتے ہیں میری کہانی میں بھی ہیرو وہی تھیں۔

''آپا! مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے احسانات تلے دب سی گئی ہوں۔ کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بوجھ کو کچھ ہلکا کرسکوں۔''

وہ میرا سہارا لے کر بمشکل جائے نماز سے اٹھیں تو میں نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے انہیں بغور دیکھا آج تک وہ مجھے یہ بھی نہ بتا پائی تھیں کہ اس دن ایسا کیا ہوا تھا۔ جب میری زندگی کی کہانی کا عنوان بدلا تھا اختتام بدلا تھا ہمیشہ میرے پوچھنے پر ٹال جاتیں

''تم آم کھاؤ، پیڑ مت گنو اور میری اس نصیحت پر عمل کرتی رہو کہ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اسے بار بار دہرانا اور شوہر کو رات دن کٹہرے میں کھڑے رکھنا مناسب نہیں کیونکہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ یہ سوچے گا کہ کچھ کہے بغیر ہی رات دن طعنے سنتا رہتا ہوں تو کیوں نہ کچھ کرلوں۔''

میں نے انہیں دکھ بھری نظروں سے دیکھا اور لبوں سے اک سسکی نکلی سوال کی صورت۔

''آپا! کچھ کہے بغیر؟''

وہ نظریں جھکا کر بولیں۔

''سمجھو کچھ نہ ہوا۔ سب کچھ برباد ہونے سے بچ گیا ہے جاناں۔''

میں نے انہیں شکایتی نظروں سے دیکھا، آنسو بے اختیار میرے گالوں پر موتیوں کی صورت پھسل رہے تھے۔

''آپا! سب کچھ تو برباد ہونے سے نہیں بچ سکا نا؟ میں اپنے دل کو بربادی سے نہ بچا سکی۔ یہ بات آپ سے زیادہ اور کون جان پائے گا اور دل برباد کے ساتھ جینا کتنا مشکل ہے۔ یہ بھی آپ سے زیادہ کون جان پائے گا۔''

وہ میرے قریب بیٹھ کر اپنے آنچل کے پلو سے میرے آنسو پونچھ کر تسلی دینے لگیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا وقت کے ساتھ ساتھ۔''

''نہیں آپا! وقت زخم بھر دیتا ہے لیکن مرے ہوؤں کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا چاہے جتنا بھی اچھا ہو۔''

''زندہ رہنے کی باتیں کرو۔''

یہ کہہ کر وہ لیٹ گئیں۔

''مطلب مجھے جواب ہے کہ جاؤں اس دشمن جاں کے پاس؟'' میں نے مصنوعی ناراضی ظاہر کی تو وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

''میرے دشمن جاں کے میسیجز بھی آرہے ہیں موصوف فرماتے ہیں، میں رات بھر گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا تمہیں لینے آرہا ہوں دو قدم پر تمہارے بھائی کا گھر ہے اور اس عمر میں میکے کے چکر مناسب نہیں ہیں۔ جاناں! وہ اب بھی عمر کا طعنہ ضرور دیتے ہیں کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ۔''

وہ مسکرا کر کہہ رہی تھیں اور میں ان کی ہمت کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے سلام کر رہی تھی۔

☆☆☆

میں ہوں یاسمین محی الدین پراچہ اپنے اکلوتے بھائی اور بھابھی کی شیما آپا بھی۔

بچپن سے ہی مجھے سب کند ذہن اور نالائق کہتے رہے ہیں۔ کوئی سیدھا سیدھا منہ پر کہہ دیتا تھا اور کوئی بڑے طریقے سے مٹھاس میں بھگو کر مارتا تھا۔

''بیٹا! سات بادام صبح بھگو کر کھایا کرو دماغ تیز ہوتا ہے۔ فلاں وظیفہ پڑھنے سے حافظہ اچھا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میٹرک کے امتحان میں ایک ایسا حادثہ ہوا

(حادثے کی تفصیل مجھ سے نہ بتائی جائے گی اس لیے نہ ہی پوچھیے تو بہتر ہوگا) کہ پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر گھر گرہستی سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اماں کی بیماری اور چھوٹے بہن بھائی کی ذمہ داری سر پر پڑی تو میں نے جانا کہ پڑھائی تو مشکل کام ہے ہی لیکن گھر گرہستی سنبھالنا اس سے بھی مشکل اور بہت بڑا کام ہے۔ طویل بیماری کے بعد اماں کے انتقال نے مجھے بالکل اکیلا کر دیا تھا اب اس گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر تھی۔

میں چھوٹے بہن بھائی سے بڑی ہوں۔

ان کی پرورش، تعلیم اور بھائی کی نوکری کے بعد چھوٹی کی شادی کچی عمر میں کروا کر میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔

شہر کے بہت اچھے علاقے میں اپنا گھر ہونا ہمارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ کیوں کہ ایک پورشن ہم نے کرایہ پر چڑھا کر تعلیمی اخراجات وغیرہ پورے کیے کیونکہ ابا کا انتقال اماں سے تین سال پہلے ہو چکا تھا ان تمام پریشانیوں کے باوجود الحمدللہ ہمارے مالی حالات کبھی بھی برے نہیں رہے۔

چھوٹے یعنی کہ سرمد کی بہت اچھی جاب کے بعد حالات بہت ہی اچھے ہو چکے تھے گھر میں کام کاج کے لیے نوکرانی موجود تھی۔

اس دوران میرے لیے بہت اچھے رشتے آئے لیکن میں نے بہن بھائی کی خاطر ہر رشتے سے انکار کر دیا کیوں کہ میں نے سر پر بڑی بہن ہونے کے علاوہ ماں اور باپ کی ذمہ داری بھی اٹھا رکھی تھی۔

لیکن قسمت نے میرے لیے بہت کچھ لکھا ہوا تھا اور یہ اندازہ مجھے ہرگز نہیں تھا۔

اس دن میں نے نہا کر نیا سوٹ پہنا اور کھلے بالوں کے ساتھ گھر کے سامنے والے لان میں واک کرنے لگی۔ دروازے پر ہارن ہوا تو میں سمجھی کہ چھوٹا ہوگا لیکن اس کے ساتھ اونچے لمبے سے آدمی نما لڑکے کو دیکھ کر میں سلام دعا کرنا بھی بھول گئی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ بندہ میرے لمبے سنہری بالوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے جلدی سے دوپٹہ سر پر رکھ کر میں اندر آ گئی۔

"آپا! مزے دار سی چائے اور ساتھ میں کچھ اچھا سا رکھ دیں تو مزہ آ جائے گا۔"

میں نے چائے سرو کی تو سرمد نے اس کا تعارف کرایا۔

"آپا! یہ میرے دوست عبید رضا ہیں۔ گھر پہلی بار آئے ہیں لیکن ہماری دوستی عمروں کے فرق کے باوجود کئی سالوں پر محیط ہے۔ کیوں عبید بھائی؟"

دونوں ہنسنے لگے، میں نے سر اثبات میں ہلایا اور اس کی بولتی نظروں سے گھبراتے ہوئے باہر نکل آئی

چند دنوں بعد عبید کی والدہ اور بہن ہمارے گھر رشتہ لے کر آ گئیں۔ اس دن سرمد بہت زیادہ خوش تھا اس نے رات ہی مجھے بتا دیا تھا کہ عبید نے اس سے بات کی ہے اور یہ کہا ہے کہ اسے اپنی زندگی کی ساتھی کے طور پر ایسی ہی کسی سمجھ دار اور مخلص لڑکی کی تلاش تھی اور یاسمین کو دیکھ کر میری یہ تلاش ختم ہو گئی ہے۔

میں حیران پریشان سی سرمد کو دیکھنے لگی۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ شادی یا محبت میری قسمت میں نہیں ہیں۔

میں نالائق اور کند ذہن کسی کا گھر کیا آباد کروں گی؟ لیکن عبید کی بولتی نظروں کے سحر نے میرے اندر کی سوئی ہوئی عورت کو جگا دیا تھا۔ میں اب جاگتے میں خواب دیکھنے لگی تھی۔

عبید کی ماں اور بہن کو مجھ سے مل کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات ان کی شکن آلود پیشانیوں سے ظاہر ہو رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں پھیلی ناگواری چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ تم اک معمولی سی لڑکی ہو یاسمین بی بی۔

"عبید نے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں، شاید سرمد اس کے سامنے ہر گھڑی تمہاری عظمت کے گیت گاتا رہتا ہے یقیناً اسے بھی پریشانی تو ہوگی کہ کہیں بہن گھر بیٹھی نہ رہ جائے۔"

اف اتنی بے عزتی میں نے کیسے سہہ لی۔ آج

بھی سوچوں تو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ ابھی تو بہت کچھ سہنا پڑے گا۔

''آپا! کیسے لگے آپ کو میرے دوست کے گھر والے؟''

سرمد کے پوچھنے پر میں نے چپ کی چادر اوڑھ لی زندگی میں جب بھی مشکل پیش آتی۔ میں چپ کی چادر میں چھپ جاتی تھی۔ یہ چادر عورت خود بنتی ہے اور عمر بھر اس میں پناہ ڈھونڈنے کے بعد مرتے وقت ورثے میں بیٹی کے لیے چھوڑ جاتی ہے اگر ماں یہ چادر بیٹی کو نہ دے تو بیٹیوں کو کہیں ایسی چادروں میں پناہ نہ ڈھونڈنی پڑے بلکہ وہ خود پناہ گاہیں بن جائیں۔

''وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں سرمد! اور یہ فرق ہمارے معاشرے میں بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔''

میں نے اس کے کانوں میں یہ بات ڈالنا ضروری سمجھی کیونکہ وہ خوش فہم بہت ساری امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔

''میری بہن میں کس چیز کی کمی ہے گڑیا سی تو ہیں آپ۔ کون کہتا ہے کہ آپ بڑی لگتی ہیں؟''

وہ محبت بھرے انداز میں بولا تو میں نے اک آہ بھری۔

''ہونا اور لگنا دو الگ باتیں ہیں چھوٹے۔''

مختصر یہ کہ بڑی مخالفتوں کے باوجود بھی ہماری شادی ہوگئی۔

عبید نے نازک پھولوں کی طرح میرا خیال رکھا۔ سرمد نے چھوٹا بھائی ہو کر بھی بہت دھوم دھام سے میری شادی کی اور رخصتی والے دن مجھے گلے لگا کر روتے ہوئے کہا۔

''آپا! زندگی کی پہلی رات مجھے اکیلے گزارنی ہے لیکن پھر بھی یہ میری زندگی کا سب سے خوش گوار دن ہے بس یہ یاد رکھیے گا کہ کبھی مجھے یہ خبر نہیں ملنی چاہیے کہ عبید نے آپ کو کوئی دکھ دیا ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ میری آپا کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔''

میں اس کی محبت کی خوشبو کی معیت میں سسرال پہنچی تو وہاں ہر ستم سہنا پڑا۔

پہلے دن سے ہی جو طعنے سننے کو ملے وہ بیان سے باہر ہیں۔

میری ساس نے طنزیہ کہا۔

''ارے عبید! عجیب سا نہیں لگے گا کہ میں تمہاری دلہن کو آپا کہوں؟''

کمرے میں رسموں کے لیے سب بیٹھے ہوئے تھے ایک دم سے ان کی بے تکی اور انسلٹنگ بات سن کر سب کو چپ لگ گئی۔

''امی جان! پھر تو آپ عفت کو بھی آپا کہا کریں نا۔''

عبید بھی انہی کا بیٹا تھا بات سہہ نہ سکا۔

''ارے عفت تو دو بچوں کی ماں ہے اگر تمہاری دلہن اس کی عمر کی ہے تو اس کی شادی کافی لیٹ ہوئی ہے۔''

وہ بات بدل گئیں۔

ایسے سسرال میں وقت گزارتے ہوئے آنکھیں صحرا اور دل جل تھل رہتا تھا دل کے آنسو بھلا کس کو دکھائی دیتے ہیں سو میں بھی یونہی چپکے چپکے روتے دھوتے ہنستے مسکراتے وقت گزار رہی تھی کیوں کہ سرمد سے یہ باتیں چھپانی تھیں۔

عبید واقعی بہت اچھے انسان ثابت ہوئے تھے میرا ہر ممکن خیال رکھتے اور میرے لیے گھر والوں سے لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے۔

میری کوشش ہوتی کہ میں انہیں خوش رکھوں ہمیشہ سے دوسروں کی خوشی کے لیے ہی تو جیتی آئی تھی اب یہاں بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔

''آپا جان! دادی بننے کی خوشی ہماری قسمت میں ہے بھی کہ نہیں؟

اس عمر میں ویسے بچوں کے بچے کھلانے ہوتے ہیں لیکن خیر۔'' یہ میری ساس تھیں جو مجھے ہر وقت آپا جان کر بلاتی تھیں۔

اور ان کا اس طرح مخاطب کرنا مجھے اندر سے

کاٹ ڈالتا تھا لیکن اپنے جذبات چھپانا پڑتے تھے کہ بات بڑھے نہ۔

''تم دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہو نہ ٹھیک سے کھاتی ہو نہ پیتی ہو ایسا کب تک چلے گا؟ میرا دوست مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے اس کی بہن کا خیال نہیں رکھا۔''

عبید نے مجھے بے حال پڑا دیکھ کر سوال کیا میں انہیں کیا بتاتی کہ ان کی ماں نے نوکرانی کو چھٹی دے کر کہا تھا کہ ''حلیمہ! تم اب مسز حشمت کی طرف جایا کرو، ہماری آپا جان گھر اور کچن سنبھالے گی۔''

دن بھر کچن میں کھڑے ہو کر میری حالت خراب ہو جاتی تھی اور عبید کو کچھ خبر نہ تھی۔

''تم آرام کرو۔ میں حلیمہ سے کہتا ہوں کہ تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لائے۔''

وہ بنا میری بات سنے باہر نکل گئے۔ سنتے بھی کیسے؟ میری ہمت ہی نہیں تھی کہ بول دیتی مجھے ان کی امی نے سختی سے کہا تھا کہ شوہر کے سامنے رونے دھونے نہ شروع کر دینا کہ حلیمہ کو نکال دیا ہے اور اس کا کام میں کرتی ہوں۔ وہ شام کو آتا ہے اور تب تک حلیمہ کام نپٹا کر نکل چکی ہوتی ہے۔ ہاں چھٹی کے دن پھر دیکھیں گے۔

وہ چند منٹ بعد واپس لوٹے تو کافی غصے میں تھے۔

''کب سے حلیمہ کام کے لیے نہیں آ رہی؟''

اس طرح پوچھنے پر میں ڈر گئی۔

''پتا نہیں۔ میں نے دن گنے نہیں۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گئے اور ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولے۔

''چوکیدار نے بتایا ہے کہ آج سترہ دن ہو گئے ہیں حلیمہ کو نوکری چھوڑے اور کچن کا کام سارا تم کرتی ہو۔'' انہوں نے شاید استفسار نہیں کیا تھا بلکہ مجھے یہ باور کرایا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں یا جان گئے ہیں۔

''اتنے دنوں سے یہ مشقت اکیلے ہی کر رہی ہو اور مجھے خبر بھی نہ کی کہ میں کسی دوسری ملازمہ کا بندوبست کر لیتا۔''

انہیں میرا خیال ہے یہ احساس بہت ہی فرحت انگیز تھا۔

میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کمزوری اس قدر محسوس ہو رہی تھی کہ مجھ سے بات بھی مکمل نہ ہو سکی آج نند کے سسرال والے آئے ہوئے تھے اور چائنیز کھانوں کے ساتھ دیسی کھانوں کا ایک طویل مینیو میرے حوالے کر کے آرڈر دیا گیا کہ اتنی دیر میں سب تیار ہو جانا چاہیے۔

اور جب ٹیبل سج گئی تو میری نند نے فخریہ سب کو بتایا کہ یہ سب اس نے بنایا ہے۔ اس وقت تھکاوٹ اس قدر تھی کہ رگوں میں بھی دوڑ رہی تھی، خون کے ساتھ ساتھ۔

''چلو یاسمین! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ مجھے بھی وحشت ہو رہی ہے تمہاری اتری ہوئی صورت دیکھ کر۔ میں تمہیں اس لیے بیاہ کر لایا تھا کہ تم سے تمہاری تازگی اور رعنائی چھین لی جائے؟''

عبید کی بات سن کر میں بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بمشکل اٹھی کیوں کہ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس وقت مجھے ڈاکٹر کی سخت ضرورت ہے مجھے لگ رہا تھا کہ میں بس مرنے والی ہوں۔ مجھے ہر وقت اس گھر میں بڑی عمر کے طعنے سننے پڑتے تھے میں سرمد سے آٹھ سال بڑی تھی اور سرمد عبید سے پانچ سال بڑے تھے۔ یوں ہمارے درمیان صرف تین سال کا فرق تھا اور مجھے یہ دیکھ کر شدید دکھ ہوتا کہ ہمارا معاشرہ عورت تین سال بڑی برداشت نہیں کر سکتا جبکہ مرد تیس سال بڑا ہو تب بھی کوئی حیران نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''مسٹر عبید! آپ کی وائف ماں بننے والی ہیں اور ان کی جسمانی حالت بہت خراب ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کئی دن سے یہ بھوکی ہیں۔ انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا ابتدا میں تو آٹھ ہفتوں کا ریسٹ ہوگا بعد میں ہم دیکھیں گے کہ کیا پوزیشن ہے اگر بہتری

ہوئی تو یہ روٹین کے ہلکے پھلکے کام کرسکیں گی۔''

گائنا کالوجسٹ نے تفصیل سے سمجھایا تو عبید خوشی کے ساتھ پریشانی کا شکار بھی ہوگئے۔ گھر آکر انہوں سب کو خوب سنائیں کہ ایسی حالت میں یاسمین کو آرام کی ضرورت تھی لیکن آپ لوگوں نے نوکرانی بنا کر رکھ دیا اس بے چاری کو۔''

گھر میں خوب ہنگامہ ہوا اور جب عبید کی والدہ نے یہ کہا کہ ''ادھیڑ عمری کی اولاد ہے، ظاہر ہے کمپلیکیٹڈ پریگنسی تو ہوگی ہی۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟''

تب یہ سب سن کر میرا حال بہت برا ہوگیا تھا۔ اتنی انسلٹ ہو رہی تھی کہ مرجانے کی خواہش جینے کی خواہش پر حاوی ہو چکی تھی۔

کبھی نیند کی گولیاں ہاتھ میں پکڑ کر سوچتی ساری کھالوں تاکہ سب کو سکون مل جائے سمیت میرے۔ لیکن پھر کوکھ میں پلتی زندگی اور روز محشر اللہ کی ناراضی نے اس فیصلے سے باز رکھا۔ ایک طرف طبیعت کی خرابی دوسری طرف ایسے حالات۔ کہیں سکون نہیں تھا۔

تین دن تک گھر میں کام کے جھگڑے لگے رہے اور چوتھے دن مجبور ہو کر ہمیں گھر چھوڑنا پڑا۔ عبید کا یہ فیصلہ مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔

ورنہ میں کچھ دن اور ان حالات میں گزارتی تو ضرور مرجاتی۔

یوں زندگی پرسکون ہوگئی۔

عمر کی پیدائش کے بعد تو زندگی سے سارے گلے شکوے ہی ختم ہوگئے بلکہ میری زندگی سے دوستی ہی نہیں پکی والی دوستی ہوگئی اب سوچ لیا تھا کہ ہمیں موت کے علاوہ کوئی بھی جدا نہیں کرسکتا۔

عمر کو سرمد اور عبید نے بہت پیار دیا سرمد کی شادی کی فکر میں ہم دونوں پریشان رہتے لیکن وہ کبھی امتحان کا بہانا اور کبھی جاب کی مشکلات کا کہہ کر ٹال مٹول کرتا رہتا تھا بالآخر ہم نے اسے جس لڑکی کی تصویر دکھائی، وہ اسے اتنی پسند آئی کہ وہ شادی کے لیے بخوشی تیار ہو ہی گیا۔ جاناں کو پا کر ہم سب خوش تھے۔

سرمد کی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اور وہ ایک بہت اچھی جاب اور بہت اچھی بیوی کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا تھا کرایے کے گھر میں کئی سال گزارنے کے بعد سرمد کے تعاون سے ان کے گھر کے قریب ہی ہمیں بھی فرنشڈ گھر مل گیا۔ عبید نے گھر خرید کر میرے نام کردیا تھا۔ اتنا مہنگا گھر میرے نام کرنا مجھے سرشار کر گیا۔ میں اس کی محبت کے خمار میں مدہوش ایک مکمل زندگی گزار رہی تھی۔

کہ مجھے عبید کے رویے میں تبدیلی کا احساس ہونا شروع ہوا۔ شادی کے بعد ان کی ترقی ہوتی رہی تھی اور وہ بہت اچھے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ مالی حالات کافی زیادہ اچھے ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا رویہ بدلتا گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہنے لگے ہیں۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اب اکثر مجھے عمر کے فرق کا احساس بھی دلانے لگے ہیں۔ شاپنگ کے لیے گئے تو کہا

''سرخ رنگ پہننے کی اک عمر ہوتی ہے یار۔ تم پر یہ رنگ بالکل سوٹ نہیں کرتا وہی مثال یاد آجاتی ہے کہ بڈھی گھوڑی لال لگام۔''

میرے دل پر یہ جملہ آری چلا گیا۔ میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ مسیحا اگر قاتل بن جائے تو حیرانی تو ہوتی ہے نا۔

کبھی کہتے۔

''ہائے کتنے ارمان تھے اس دل میں کہ بچوں کی کم سے کم آدھی ٹیم تو ضرور ہوگی گھر میں۔ لیکن یہاں تو دو بھی نہیں کہ چلو مل کر ٹیبل ٹینس ہی کھیل لیں۔''

جی میں آتی کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھوں۔ ''میاں جی آپ کی اماں نے جو ٹیم پوری کی ہوئی ہے ان کا کوئی ایک فائدہ تو بتا دیں۔ کبھی ایک دوسرے سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے سب بہن

بھائی ایسے نام کے رشتے تکلیفیں ہی دیتے ہیں میں رب کی رضا میں راضی ہوں"

لیکن کہہ نہ پائی کہ اس شخص سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اسے دکھ نہیں دے سکتی تھی۔ دو تلخ جملوں کا دکھ بھی نہیں۔

"عبید! پلیز رات کو جلدی آجایا کریں، مجھ سے رات بھر جاگا نہیں جاتا۔ صبح عمر کے اسکول کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں مجھے رات کو بہت ڈر بھی لگتا ہے۔"

میرا نرمی سے یہ کہنا مصیبت بن گیا۔

"تمہاری عمر کا تقاضا ہے یاسمین بیگم! وقت پر سو جایا کرو۔ کل سے میں باہر سے تالا لگایا کروں گا۔"

میں نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر سوچا۔ اب یہ تسبیح و وظائف بھی میری عمر سے جوڑے جائیں گے خدایا کہاں جاؤں میں؟

اس کا یہ بدلا ہوا روپ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے تو محبت کے گیت گنگنانے والے عبید کی عادت تھی جس نے سارے زمانے کی زبانوں کو چپ کرا دیا تھا مجھ سے شادی کر کے لیکن اب یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ یہ سوال رہ رہ کر مجھے ستا رہا تھا۔

☆☆☆

"ارے آپا! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ عبید بھائی اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔

لیکن ان کی گاڑی تو شاپنگ سینٹر کے سامنے کھڑی ہے۔"

سرمد کو میں کیا بتاتی کہ تم نے تو صرف گاڑی دیکھی ہے میرے بھائی! میں نے تو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی لڑکی کو بھی دیکھ لیا ہے۔

"ارے ہاں سرمد! یاد آیا کچھ دیر پہلے عبید نے میسج کیا تھا کہ پروگرام بدل گیا ہے ایک دوست کے لیے کچھ شاپنگ کر کے نکلتا ہوں دوست نے بھی اچانک ہی شاپنگ کی لسٹ اور اکاؤنٹ میں پیسے بھیج دیے ہیں اب یہاں کی سوغات نہ لے کر جاؤں تب بھی بری بات ہے۔"

میں نے بروقت بات سنبھال لی۔

"آج کل وہ کچھ زیادہ ہی باہر رہنے لگے ہیں۔"

میں خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

دل کی دنیا اجڑ چکی تھی، میرے وہم بھی حقیقت کا روپ نہ دھارتے اگر عبید کا رویہ نہ بدلا ہوتا۔

اب تو شک کی گنجائش نہیں رہی تھی لیکن حقیقت کی تہہ تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ میں سرمد کو عبید کے گریبان میں ہاتھ ڈالتا نہیں دیکھ سکتی تھی، اس لیے اسے کچھ بھی نہ بتا سکی۔

"آپا! آج شاپنگ میں کرا رہا ہوں پھر بھی سستی؟"

میرا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا کچھ بھی خریدنے کے لیے بوتیک میں رکھے سرخ رنگ کے سارے جوڑے مجھے خود پر ہنستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

سرخ ایمبرائیڈری والا دوپٹہ مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"بڈھی گھوڑی لال لگام۔ لال لگام۔"

میں نے لمبی سانس لے کر خود کو یہ یقین دلایا کہ میں ابھی زندہ سلامت ہوں، اتنی غیرت مند نہیں کہ مرجاؤں بے عزتی کا زہر پی کر۔

"مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی آپا۔"

سرمد نے میری عرق آلود پیشانی اور دھندلی آنکھوں میں شاید وہ کیفیت پڑھ لی تھی جو اک ماں جایا ہی پڑھ سکتا ہے۔

"کوئی مسئلہ ہے آپا؟ عبید بھائی نے کچھ کہا ہے؟"

ایسے موقعوں پر وہ فوری طور پر بڑا بن جاتا تھا۔

"ارے عبید کی اتنی مجال؟ وہ تو کبھی تیز آواز میں بولتے بھی نہیں میرے سامنے۔"

میں نے خود کو سنبھالا۔

وہ مسکرا کر میرے لیے کپڑے پسند کر رہا تھا اسے پتا تھا کہ بہن کو سرخ اور گلابی رنگ پسند ہیں۔

اسی لیے وہ دونوں لباس ان رنگوں کے ہی خرید چکا تھا۔

میں بمشکل آنکھوں کی نمی کو چھپا کر ہینگرز میں لگے ملبوسات کو فقط حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر ہی رہ گئی۔

گھر آ کر میں نے عبید کو فون کیا تو وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''فون بند کرو ضروری میٹنگ ہے۔''

میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کہاں ہے میٹنگ؟''

وہ ترشی سے بولا۔

''جہنم میں ہے میٹنگ۔ بتا کر تو آیا تھا کہ اسلام آباد جا رہا ہوں کس قدر بھلکڑ اور کند ذہن عورت ہو تم۔''

اس نے ترشی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

اب تو اس کے لہجے کی مٹھاس یاد بھی نہ تھی۔ اتنے کڑوے لہجے میں وہ مجھے مخاطب کرتا تھا کہ سماعتیں سن ہو جاتیں۔

فون بند ہوتے ہی میں دیر تک فون کی اسکرین پر چمکتے لفظ جان کو گھورتی رہی جو عبید کے نمبر کے ساتھ لکھا تھا واقعی جان کا جانا ناقابلِ برداشت اذیت کا نام ہے۔

☆☆☆

اس دن عبید کے دوست کی بیوی کا فون میرے نمبر پر آیا۔ فرزانہ سے میری بہت اچھی ہیلو ہائے تھی۔ ہم دوستوں کی محافل میں اکثر ملتے تھے اور وہ بہت اچھی اور بہادر عورت تھی۔ پر اعتماد اور کر گزرنے والی۔ لیکن اس طرح پہلی بار اس کا فون کرنا مجھے چونکا گیا۔

''بھابھی! میں چند منٹ کے لیے آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔'' وہ پریشان سی لگ رہی تھی۔

اس نے کہا تو میں نے بھی دعوت کا کہہ دیا کہ آپ اور بھائی ہماری طرف کھانے پر آ جایئے۔ گپ شپ رہے گی۔''

''بھابھی! میں آپ سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہوں، بہت ضروری بات کرنی ہے، پلیز عبید بھائی کو اس کی خبر نہ ہو۔'' یہ اندازہ تو مجھے ضرور تھا کہ وہ بہت مخلص لڑکی تھی۔

میرے اندر کے خدشات سچ ہوتے نظر آ رہے تھے۔ ضرور کچھ ایسا ہوا ہے جو فرزانہ مجھے بتانا چاہ رہی ہے۔

''ٹھیک ہے فرزانہ! آپ ابھی آ جائیں، گھر میں کوئی نہیں ہے۔''

وہ میرے مقابل بیٹھی تھی۔

''عبید بھائی نے شادی کر لی ہے اپنے آفس میں کام کرنے والی عطرت سے۔''

اور میں یہ سب سن کر زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔

''بھابھی! میں اپنے میاں سے بہت لڑی ہوں کہ آپ کیوں اس نکاح میں شامل ہوئے؟ لیکن وہ کہتے ہیں یہ کوئی گناہ تو نہیں۔ عبید بھائی نے کسی اور کو بطور گواہ وہاں لے کر جانا تھا اگر یہ نہ جاتے تو کوئی اور چلا جاتا۔''

میں ساکت سی موبائل فون کی اسکرین کو گھورے جا رہی تھی۔ میں نے پل بھر میں سر پر پہاڑ اٹھا لیا تھا اور بہت ہمت کے باوجود بھی دھیرے دھیرے اس پہاڑ کے نیچے دفن ہونے لگی تھی۔ زندہ دفن ہونے کی اذیت لامحدود تھی۔

دلہن کے لباس میں ملبوس وہ کم عمر سی لڑکی، اس کی واحد خوبی شاید کم عمری ہی تھی۔ موٹے موٹے نقش اور درمیانہ سا قد اور اس کے ساتھ عبید گولڈن شیروانی پہنے مسکرا رہے تھے۔

''حوصلہ کریں بھابھی! میں جانتی ہوں، یہ سب بہت تکلیف دہ ہے لیکن آپ کو اور بے خبر نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے یہ سب کہہ رہی ہوں۔''

تسلی کے الفاظ مجھے سنائی تو دے رہے تھے لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں انہیں سمجھ سکتی یا میں ان کا جواب بھی دے سکتی۔

''یہ کب ہوا؟'' بمشکل حلق سے اتنی بات ہی

نکلی اور واضح طور پر میرا جسم لرزنے لگا تھا۔

میں نے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے فون انہیں واپس کر دیا۔

''بھابھی! یہ پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔ یہ لڑکی ان کے آفس میں کام کرتی ہے اور انتہائی لالچی فطرت ہے۔

عبید بھائی کے ساتھ شادی بھی اسی لالچ کا نتیجہ ہے کیوں کہ عبید بھائی آفس میں بہت خرچ کرتے تھے۔ ان کی گاڑی اور اچھی تنخواہ وغیرہ سے متاثر ہوئی ہے یہ لڑکی۔ میرے میاں بتا رہے تھے کہ دوسری مال دار آسامیوں پر بھی اس کی نظر تھی لیکن کوئی قابو میں نہیں آیا کیوں کہ وقت تو سب ہی گزارتے ہیں لیکن شادی کوئی نہیں کرنا چاہتا ایسی لڑکیوں سے۔ میں تو بہت ڈر گئی ہوں اسی لیے میاں پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی ہے۔''

''آپ تو جوان ہیں خوب صورت ہیں آپ کے میاں ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں نے اسے بغور دیکھ کر ٹوٹے لہجے میں کہا تو وہ افسوس سے مجھے دیکھنے لگی۔

''عبید بھائی نے آفس میں سب کو یہ کہا ہے کہ مجھے بچوں کی خاطر شادی کرنی پڑی ہے کیونکہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے اور بچے ہوں۔''

میں چپ چاپ ہاتھوں کی لکیروں کو گھورتی رہی۔

''دیکھ لیجیے گا بھابھی! ایک دن یہ لڑکی انہیں بھی دھوکا دے کر کسی اور کے پاس ضرور جائے گی وہ ہر وقت مال دار آسامیوں کی تلاش میں رہتی ہے اور یہ بات سارا آفس جانتا ہے۔''

وہ بے چاری مجھے تسلی دے رہی تھی۔

جس کا سب کچھ لوٹ لیا جائے اور لٹیرا بھی وہ ہو جس سے انسان محبت کرتا ہو تو اسے سوائے تسلی کے انسان اور کیا دے سکتا ہے؟''

میں خاموشی سے سب سنتی رہی۔ یہی تو بس میں تھا۔

☆☆☆

''تو تمہیں پتا چل ہی گیا؟ چلو اچھا ہوا۔ تم سب جان گئی ہو۔'' عبید کا انداز ایسا تھا جیسے یہ بہت ہی معمولی سی بات ہو۔

''میرا قصور تو بتایے مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی جو آپ اس حد تک چلے گئے؟''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''مجھے کچھ کہنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ تم سب جانتی ہو، میری طرف سے پوری اجازت ہے سارے زمانے کو خبر کر دو۔ اپنے بھائی کو بھی کہنا ہے تو اسے بھی بتا دو میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔''

''آپ نے تم مجھ سے محبت کے دعوے کیے تھے کیا محبت اتنی ناپائیدار ہوتی ہے کہ کم عمری کا جادو سر چڑھ کر بولے۔''

یہ سوال اگر میں نہ کرتی تو میرا دم گھٹ جاتا اسی سوال کے جواب پر میرے آئندہ کے عمل کا دارومدار بھی تھا۔

''مجھے شدید غلط فہمی ہوئی تھی، وہ جسے ہمدردی تھی اسے میں محبت سمجھ بیٹھا تھا۔'' میں ساکت سی سن رہی تھی۔

''ہمدردی کیوں؟ میں نے تو کبھی آپ سے ہمدردی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ میں نے تو بیوی ہو کر بھی کبھی خواہشات کا کشکول آپ کے سامنے نہیں رکھا پھر اک اجنبی سے ہمدردی کیسی؟'' آج ہی تو چپ ٹوٹی تھی سب پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''سچ سننا ہے تو سنو۔ تمہارے احسان مند بھائی سرمد نے تمہاری عظمت اور قربانیوں کی اتنی کہانیاں سنائی ہوئی تھیں کہ مجھے لگتا تھا تم دنیا کی سب سے عظیم عورت ہو اور تمہیں تمہاری بے لوث قربانیوں کا صلہ ضرور ملنا چاہیے۔''

''واہ عبید صاحب! کیا خوب صلہ دیا ہے آپ نے میری قربانیوں کا''

میرے طنزیہ لہجے سے اس کی سماعتوں کا پہلا

تعارف تھا۔ اس لیے وہ حیرانی سے مجھے تکنے لگا۔ شاید یہ سوچ رہا ہو کہ مجھے اس لہجے میں بھی بولنا آتا ہے۔

''جو ہوا سو ہو گیا اب میرا یہ احسان ہے کہ میں نے یہ گھر تمہارے نام کیا ہوا ہے، اسی احسان کا بدلہ سمجھ لو میری دوسری شادی کو۔''

''یہ مکان نہیں میرے لیے تو ایک قبر ہے جس میں میری ہڈیاں چٹخنے لگی ہیں اور ہر طرف گھپ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس مکان کے در و دیوار کو دیکھ کر سوچا اور پھر یہ سوچیں ہی میری ساتھی بن گئیں۔

کیونکہ زندگی میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ عدل کے دعوے کرنے والے مرد نے مجھ سے جانوروں والا سلوک شروع کر دیا تھا۔ کبھی جی چاہتا تو آتے ہوئے کچھ اپنے کھانے کے لیے لے آتا ورنہ دوسری بیوی کے اخراجات اور عیاشیوں کو پورا کرتے ہوئے میرے لیے کچھ نہ بچتا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ میں اس زندگی سے تنگ ہو کر یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں اور میں یہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ گھر میرے عمر کا تھا یہ میں کسی کو دان نہیں کر سکتی تھی۔

اس دن فرزانہ کا فون آیا۔

''بھابی! آپ کا صبر عبید بھائی اور ان کی بیوی پر پڑ گیا ہے۔ دونوں کے درمیان ہر وقت لڑائی جھگڑے لگے رہتے ہیں۔ وہ آصف سے اپنے گھریلو معاملات ضرور ڈسکس کرتے ہیں، ان کی بیوی ان دنوں ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ کے نام جو گھر ہے، وہ بیچ کر کوئی کاروبار کرتے ہیں جس سے کچھ اضافی آمدنی آنی شروع ہو۔''

فرزانہ بہت پرجوش تھی۔ میں ہمیشہ اس کی دی ہوئی اطلاعات کو ہوں ہاں کر کے ہی بے دلی سے سنا کرتی تھی لیکن اس بار میں نے پوچھا۔

''فرزانہ! جب آپ کو اتنی ساری معلومات حاصل ہیں تو یقیناً یہ بھی جانتی ہوں گی کہ عبید نے کیا جواب دیا بیوی کو؟''

وہ میرا سوال سن کر جوش بھرے انداز میں بولیں

''جی بھابھی! عبید بھائی نے بتایا ہے کہ وہ یہ گھر بیچ کر اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے شرمندہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ان کی بیوی اس ضد پر پر ڈٹی رہے تو ان کے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ یاسمین سے یہ گھر واپس لینے کی کوشش کریں۔''

میں جانتی تھی کہ وہ اس عورت کی چالاکیوں کے سامنے زیادہ دیر ڈٹ نہیں سکے گا، اس لیے میں بہت پریشان رہنے لگی تھی کیونکہ جب تک تو وہ اس گھر کے بارے میں خاموش تھا۔ میں سب سہہ رہی تھی لیکن اب میرا اور میرے بیٹے کا ٹھکانا بھی چھیننے کی کوششیں کی جاری تھیں، سب کچھ ہار کر میں اب اپنے سر کی چھت نہیں ہار سکتی تھی اس کے لیے مجھے لڑنا تھا اور لڑ کر جیتنا بھی تھا۔

☆☆☆

''تو تم باز نہیں آؤ گے سرمد؟''

جب سے اس معصوم لڑکی جاناں کو روتے تڑپتے دیکھا جسے اللہ نے میری بھابھی بنایا ہوا تھا تب سے میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''آپا! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی بات نہ کریں تو بہتر ہوگا۔''

پہلی بار اس نے مجھ سے نظریں چرائی تھیں۔

''سرمد! میرا دل اتنا بے حس نہیں ہے کہ میں جاناں گڑیا اور شاہان کا دکھ دیکھ کر بھی اس معاملے سے بری الذمہ ہو جاؤں۔ ہمارے ماں باپ اور کوئی بڑا دنیا میں نہیں ہے لیکن مجھے اگر تم ذرا سی بھی عزت دیتے ہو تو میری یہ بات مان لو۔ اس عورت کا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے تمہارے دونوں بچے اپنے عمر کی طرح عزیز ہیں اور میں انہیں دکھی نہیں دیکھ سکتی۔''

میں رونے لگی تو سرمد میرے قریب آ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''سرمد! میں نے تمہیں اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اور تمہارے مزاج کو بھی بہت اچھی طرح سے سمجھتی ہوں تمہاری بیوی بہت اچھی لڑکی ہے لیکن ایک خرابی اس میں ہے کہ اپنا خیال نہیں رکھتی اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے سجی سجائی، صاف ستھری اور اسمارٹ عورت ہی اہم ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہاری بیوی اپنا خیال رکھے گی اس میں کوئی کمی نہیں۔ وہ باکردار، باحیا، قابل اور خوب صورت ترین عورت ہے۔ تمہارے دو بچوں کی ماں بھی ہے سرمد۔''

وہ میرے پاؤں میں بیٹھا میرے گھٹنوں پر سر رکھے رونے لگا۔

''سرمد! کیا تمہیں اس عورت سے بہت محبت ہوگئی ہے؟'' مجھے اپنے اس لاڈلے بھائی پر بہت ترس آرہا تھا۔

''آپا ستم تو یہ ہے کہ اس عورت سے مجھے نہیں آپ کے شوہر کو محبت ہوئی ہے۔''

یہ جملہ بم کی طرح میرے سر پر پھٹا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''یہ ہی سچ ہے آپا! میں سب جانتا ہوں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جو بہن بچپن سے ہی میری آنکھوں میں میری ہر خواہش پڑھ لیتی تھیں اور پھر بنا کچھ کہے وہ خواہش پوری بھی کر دیتی تھیں یہ جتائے بغیر کہ انہیں میری اس ایک خواہش کے لیے اپنی کئی خواہشات کی قربانی دینی پڑتی ہے میں ان کی آنکھوں میں وہ دکھ وہ محرومی پڑھ ہی نہ سکا جو ان کی روح کا داغ بن چکی ہے۔''

میرا چھوٹا بہت بڑا بن کر بول رہا تھا میں سسکنے لگی۔ ضبط کی بھی حد ہوتی ہے اور بات ان حدوں سے آگے نکل چکی تھی۔

ہم دونوں روتے رہے اور ایک دوسرے کے آنسو بھی پونچھتے رہے۔

''کیسے جان لیا تم نے یہ سب؟''

میں نے سوجی ہوئی آنکھوں کے بوجھل پپوٹے بمشکل اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپا! ایک دن گاڑی میں دونوں کو دیکھا تھا ایک بوتیک سے نکل رہے تھے۔

پھر گاڑی کا تعاقب کیا، ایک گھر میں ان کی گاڑی غائب ہوگئی۔ میں دو گھنٹے وہیں کھڑا رہا۔ رات کا ایک بج چکا تھا، میرا دل یہ سوچ کر رو رہا تھا کہ میری وہ بہن جو رات کو اکیلے رہنے سے بہت ڈرتی تھی اور شادی سے پہلے مجھے شام کے بعد گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تھی، اس لیے کہ آپا کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ اور آج وہ گھر میں بالکل اکیلی ہوں گی۔''

یہ کہتے ہوئے سرمد کی آواز پھر سے بھرا گئی۔

''بھائیوں کو خبر ہی نہیں ہوتی اور بہنیں بزدل سے بہادر بن جاتی ہیں۔''

میری بات سن کر وہ افسوس سے بولا۔

''کاش بہنیں اپنا دکھ درد بھائیوں کو بتا کر خود کو ہلکا پھلکا کر لیا کریں تو اتنا بوجھ نہ سہنا پڑے۔''

میں نے اسے پیار سے دیکھا۔

''ساری بہنوں کو ایسے بھائی کہاں نصیب ہوتے ہیں چھوٹے؟''

وہ منہ پھلا کر بولا۔

''جنہیں مل جاتے ہیں انہیں کیا فائدہ ہوا؟''

میں چپ رہی کہنے کو کیا تھا سوائے اس کے کہ میں اسے مسائل میں گھیرنا نہیں چاہتی تھی۔

''جب ایک بجے کے بعد بھی عبید بھائی اس گھر سے نہ نکلے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے گلی میں کھڑے چوکیدار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے جیب سے نکال کر کچھ پیسے دیے اور بڑے طریقے سے یہ کہا کہ اس گھر میں رہنے والے شخص کے بارے میں مجھے معلومات چاہئیں تب اس نے کہا۔

''جناب یہ عبید رضا صاحب ہیں۔ میاں بیوی

دونوں قریبی آفس میں کام کرتے ہیں اور اچھی خاصی حیثیت ہے ان صاحب کی۔ ان دونوں کی شادی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ لیکن دونوں بہت بدقسمت ہیں کہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہے۔ سچ بتاؤں تو صاحب تو بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ اکثر میری مدد کرتے رہتے ہیں لیکن بیگم صاحبہ کچھ عجیب سی خاتون ہیں۔ جانے کیوں انہیں غریبوں سے شدید نفرت ہے۔ کبھی آتے جاتے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں، موقع ملتے ہی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتی ہیں۔

میری سالی ان کے گھر کام کرتی ہے اور وہ بتاتی ہے کہ یہ عبید صاحب کی دوسری بیوی ہیں۔ یہ غریب گھر سے تعلق رکھتی ہیں اور عبید صاحب سے شادی صرف ان کی دولت کی وجہ سے کی ہے۔ میری بہن ان کے گھر میں بہت مشکل وقت گزارہ رہی ہے۔ عبید صاحب چوری چھپے اسے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس نک چڑھی عورت کے گھر کام کر رہی ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور میں ڈگمگاتے قدموں سے واپس جا رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور جو کچھ وہ چوکیدار کہہ رہا ہے نہ سن سکوں۔ ایسا ہی ایک بار میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکا تھا جب گھر آتے ہی دیکھا تھا کہ ہمارا سارا آنگن لوگوں سے بھرا ہوا ہے اور مجھے دیکھ کر عورتیں زور زور سے رونے لگی تھیں۔

تب آپ نے روتے ہوئے کہا تھا کہ ''چھوٹے! امی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔''

کوئی اور یہ بات کرتا تو میں اس کی بات پر کبھی یقین نہ کرتا لیکن یہ بات آپ نے کی تھی۔ اس لیے میں یقین کرنے کے باوجود یہی چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے دور بھاگ جاؤں وہاں تک جہاں آپ کی آواز مجھ تک نہ پہنچے۔''

میں اٹھ کر اس کے لیے پانی کا گلاس لائی اور تسلی دے کر کہا۔ ''یہ پانی پی لو سرمد! مجھ سے تمہاری تکلیف دیکھی نہیں جا رہی۔''

''آپا! وہ رات مجھ پر قیامت کی طرح گزری تھی۔ میری زندگی میں بھی طویل ترین دورانیے آئی ہیں۔ ایک وہ رات جب باپ کے بعد ماں بھی ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی اور ایک وہ رات جب مجھے معلوم تھا کہ میری بہن گھر میں اکیلی سو رہی ہے اور اس کا شوہر اپنی دوسری بیوی کے پاس ہے اور میری وہ صابر بہن۔ اپنے بھائی کو اس لیے اس دکھ سے بے خبر رکھ رہی ہے کہ کہیں وہ اس کے شوہر سے لڑ جھگڑ کر خود کو نقصان نہ پہنچا لے۔

دوسرے دن ہی میں نے اس لڑکی کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

میں شدید ترین نفرت اور انتقام کی آگ میں جل کر کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جس سے۔ عبید رضا اتنا ہی تڑپتا جتنا اس نے مجھے اور آپ کو تڑپایا ہے۔ میں اس شخص کو اپنے ساتھ کی گئی زیادتی پر تو معاف کر سکتا تھا لیکن اپنی اس بہن پر کیے گئے مظالم کا حساب مجھے اس سے ہر صورت میں لینا تھا۔ جس بہن کے جسم پر بھی میں پھول کی چوٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس ظالم انسان نے اس کے نازک دل کو چیر کر رکھ دیا تھا میں اپنی بہن کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ تو نہیں سکتا تھا لیکن اسے جوڑنے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔''

وہ پانی کا ایک گھونٹ پی کر پل بھر کے لیے سانس لینے کے لیے رکا۔

''تم نے انتقام کا بہت ہی گھٹیا طریقہ نکالا ہے۔ تمہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے تھا کہ تمہاری بیوی اور بچوں پر کیا گزرے گی۔

جاناں بھی اپنے بھائی کی اکلوتی بہن ہے اور اس کا بھائی اسی طرح پیار کرتا ہے جیسے کہ تم اپنی بہنوں سے۔''

''میرے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ نہیں تھا کیونکہ عبید بھائی اس عورت کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ آپ کا دل، آپ کی زندگی اور خوشیوں کے ساتھ آپ کے شوہر کو چھین لینے کے بعد اب وہ آپ کے سر کی چھت بھی چھین لینا چاہتی ہے۔ میں

یہ سب کیسے ہونے دیتا؟

میں نے کہیں نہ کہیں سے اس کا فون نمبر ڈھونڈا اور کچھ ایسے میسجز کیے کہ جیسے کسی اور کو کر رہا ہوں لیکن غلطی سے اسے جا رہے ہیں اور ان میں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر دولت کا دانہ ڈالا۔ کیونکہ وہ صرف اور صرف اسی دولت کے دانے سے شکار ہو سکتی تھی۔

آج تک جو دوسروں کو شکار کر رہی تھی۔ آخر میرے جال میں پھنس ہی گئی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب مناسب نہیں۔ ایک شادی شدہ عورت کو جال میں پھنسا کر کسی کا گھر توڑنا میرے لیے تکلیف دہ ہے لیکن میرے پاس کوئی دوسرا رستہ نہیں ہے آپا۔

وہ اپنے شوہر سے چھپ کر مجھ سے ملتی ہے۔ میں اس پر خوب پیسے خرچ کرتا ہوں اور جتنا میرے پاس ہے میں اس سے بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے کہ میں اس کی سوکن کا بھائی ہوں۔''

''تو کیا وہ عبید سے طلاق لینے کے لیے راضی ہو چکی ہے؟''

مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ عبید اس عورت کے لیے جو کچھ کر چکا تھا۔ میں اس کی گواہ تھی۔

''اگر وہ طلاق لے لیتی ہے تو پھر تمہیں اس سے شادی کی کیا ضرورت ہے؟''

میرے پوچھنے پر سرمد نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے گمان سے بھی زیادہ چالاک عورت ہے وہ۔ اس نے طلاق کی ایک شرط رکھی ہے اور وہ شرط ہے میرا گھر اس کے نام پر ہونا اور کاغذ پر چار لوگوں کے سامنے یہ لکھنا کہ عدت کے بعد ہمارا نکاح ہوگا۔ وہ ہمیشہ فائدے کا سودا کرتی ہے۔ جانتی ہیں اس نے بچپن کے منگیتر سے رشتہ صرف اس لیے توڑا کہ عبید بھائی کے پاس بہت پیسہ تھا اور اب وہ ان سے رشتہ توڑ کر مجھ سے جوڑنے کے لیے اس تیار ہے کہ ان کا پیسہ کھا پی کر ختم کر گئی اور میرا ختم کر کے پھر کسی اور موٹی اسامی کی تلاش کرے گی۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے۔''

وہ چپ ہوا تو میں گم صم سی کتنی دیر تک اسے دیکھے گئی۔

''میں نے شروع میں یہ سوچا تھا کہ عبید بھائی کو اس عورت کے چنگل سے نکلوانے کے لیے اسے ٹریپ کر کے اس کے اصل روپ کو سامنے لاؤں گا میرے پاس آڈیو میسجز ہیں جس میں وہ ان کے خلاف بول رہی ہے۔ لیکن عطرت کی عیاری سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ ان میسجز سے بھی عبید بھائی کی آنکھوں پر بندھی پٹی نہیں کھلنے دے گی اور وہ جان کر کہ ان کی پہلی بیوی کے بھائی نے یہ میسجز ان تک پہنچائے ہیں یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ مجھے گن پوائنٹ پر یہ سب کہنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔

اور وہ عاشق صاحب اب تک اس عیار عورت کے دیگر کارنامے دیکھ کر بھی بے وقوف بن جاتے ہیں۔''

میرا بھائی ہر طرف سے مایوس ہو کر ہی اتنا بڑا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوا تھا۔

''تم اپنا گھر بیوی بچے اور اپنی عزت داؤ پر لگا کر عبید کو جو سبق سکھانا چاہتے ہو وہ اللہ اسے سکھا ہی دے گا بھی نہ بھی۔''

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''آپا ان لوگوں نے آپ کے ساتھ بہت برا کیا ہے میں انہیں اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دوں؟''

''میری قسمت میں جو لکھا تھا وہی مجھے ملا ہے اور آئندہ بھی تقدیر کے اشاروں پر ہی چلنا ہے۔ میں نے عبید کے کیے پر صبر کر لیا ہے اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ اسے طلاق دیتا ہے یا نہیں۔ جو کچھ تم کر چکے ہو ٹھیک ہے لیکن اب یہاں اس سب کو ترک کر دو۔ ابھی واپسی ہو سکتی ہے لوٹ آؤ اپنے بیوی بچوں کے پاس۔ وہ گھر ہمارے والدین کی نشانی ہے۔'' میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''ہمارے والدین کی سب سے قیمتی نشانی

میرے لیے آپ ہیں آپا۔"

میرا ماں جایا تو سراپا محبت تھا۔

میرے دل نے بے ساختہ رب کا شکر ادا کیا کہ ایسا احساس کرنے والا بھائی دیا ہے مولا۔

"طلاق کے بعد میں نے اس عورت سے نکاح صرف اس لیے کرنا ہے کہ عبید رضا کے دل تک بھی اس آنچ کے شعلے پہنچیں جس آگ نے ہمارے دلوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا ہے۔ اسے بھی تو احساس ہو کہ جس کی محبت میں سب کچھ لٹا دیتے ہیں، وہ بے وفائی کرے اور پھر آپ کی لاش پر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کر کے جیتا رہے بنا ضمیر کی ملامت کے، بنا احساس ندامت کے تو باوفاؤں کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔"

اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ کتنا چھوٹا سا دل تھا اس چھ فٹ کے جوان مرد کے سینے میں۔

"جو اپنی بہن کے لیے محسوس کرتے ہو، وہ اس بے بس اور کمزور عورت کے لیے نہیں محسوس کر سکتے تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ دنیا مکافات عمل کی جگہ ہے سرمد۔ تم اک بیٹی کے باپ بھی تو ہو۔"

میرا یہ کہنا اسے تڑپا گیا۔

"آپا! ایسا تو نہ کہیں نا۔ مجھ میں مزید ایسے دکھوں کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔" وہ کمزور آواز میں کہہ کر چپ ہو گیا۔

"سوچو کہ اس میں اتنی سکت کہاں سے آئے گی۔ وہ جو محبتوں کی کہانیاں لکھتی ہے اور کہتی ہے میں محبت کی کہانیوں کا انجام جدائی یا بے وفائی والا نہیں لکھتی کیونکہ محبت جدائی اور بے وفائی کے انجام سے سہمی رہتی ہے۔" میرے لہجے سے محبت شہد بن کر ٹپک رہی تھی اور اس کی سماعتوں میں مٹھاس گھل رہی تھی۔

"آپا یہ گھر آپ سے چھن جائے گا۔ کیونکہ عطرت نے مجھے بتایا ہے کہ وہ عبید کے سامنے یہ شرط رکھ چکی ہے کہ گھر کے کاغذ لاؤ ورنہ طلاق کے کاغذ آ کر لے جاؤ۔ اور یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ اسے کبھی چھوڑنا نہیں چاہتے اگر آپ نے گھر انہیں نہ دیا تو وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

میرے دل میں اٹھتے خدشات کے بھنور میں امید کی کشتی ڈوب رہی تھی میں نے امید کو ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر تنکے کا سہارا لینا چاہا۔

"میری فکر نہ کرو۔ اپنی فکر کرو۔ وہ ایسی عورت ہے کہ تمہیں بھی اپنے جال میں پھانس لے گی میں تو پہلے ہی سب کچھ لٹا چکی ہوں اور یہ گھر میرا نہیں عمر کا ہے۔ اب عمر کے حق پر تو میں کسی کو ڈاکہ نہیں ڈالنے دوں گی۔"

میں نے دیکھا۔ وہ سر نفی میں ہلا رہا تھا۔ میں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا اب زبانی اور کچھ نہ کہا اور اس کے سامنے دوپٹہ پھیلا دیا۔

"میری اس پھیلی ہوئی جھولی میں جاناں اور بچوں کی خوشیاں ڈال دو سرمد! میں آج تم سے ان کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہی ہوں۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔ میری ہتھیلیاں نمکین پانی سے تر ہو رہی تھیں۔

"ہمیشہ دوسروں کی خوشیوں کی فکر کرتی رہی ہیں۔ آج تو اپنی خوشی کے لیے جھولی پھیلا لیتیں آپا۔"

اس کے یوں کہنے پر میں نے سرمد کی پیشانی چوم کر کہا۔

"میری خوشیاں تم سے تمہاری خوشیوں سے الگ تو نہیں ہیں چھوٹے؟"

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرا دیا۔

"آپ ہمیشہ بڑی بن جاتی ہیں اور میں چھوٹا ہی رہتا ہوں۔ کبھی تو اپنے چھوٹے کو بڑا بننے دیں۔ اور سنیں یہ آپ کی جاناں فقط محبت کی کہانیاں ہی لکھتی ہے محبت کرتی نہیں ہے۔ کیونکہ محبت کرنے والے جھک جاتے ہیں، ضد نہیں کرتے۔ اور وہ بظاہر نرم نظر آنے والی جاناں اندر سے بڑی ضدی عورت ہے آپا وہ مجھے معاف کر دے گی نا؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں معاف نہیں کرے گی لیکن قبول ضرور کر لے گی۔ اسے سچی محبت ہے تم سے۔ لیکن اس سے پہلے وہ خود سے بھی پیار کرتی ہے اور تم نے اس کی تذلیل کی ہے، بھولنے میں وقت تو لگے گا۔

اور میں نے اس کے دکھ کو ایک بالکل الگ سمت میں موڑ دیا ہے۔ اس سے کہا ہے تمہاری غلطی ہے کہ اپنی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ اور یہ سچ بھی ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔''

''ٹھیک ہے آپا! جو آپ کا حکم ہے میں سر تسلیم خم کروں گا۔ میں سب سے پہلے عطرت سے یہ کہہ کر جان چھڑاتا ہوں کہ گھر میری بیوی کے نام پر ہے اور ہمارا اکاؤنٹ بھی مشترکہ ہے۔ اس لیے اکیلا پیسے نہیں نکال سکتا۔ اور اس طرح وہ مجھے آسانی سے چھوڑ دے گی۔''

''آج کل جاناں اپنی طرف توجہ دے رہی ہے ڈائٹنگ، ورزش وغیرہ بھی خوب زور شور سے جاری ہے اس بہانے تمہیں چاق و چوبند اور اسمارٹ بیگم واپس مل گئی ہے۔''

میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

''آپا! مجھے تو جاناں ہر رنگ ہر روپ میں بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ عطرت تو میری آپا کے مقابلے کی نہیں نہ ہی وہ جاناں کے مقابلے کی ہے۔''

میں مسکرانے لگی۔

یوں جاناں سرمد کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا۔ شاہان اور گڑیا کا گھر آباد رہ گیا۔ ریت کے گھروندے جیسا ثابت نہ ہوا جو ایک لہر کی ضد سے ٹوٹ کر واپس ریت ہو جاتا ہے۔ سرمد نے جاناں کو منالیا۔ وہ آج بھی سمجھتی ہے کہ سرمد اسے سلم اسمارٹ اور بنا سنورا دیکھنا چاہتا ہے اور اس کا گھر شیما آپا کی وجہ سے آباد ہے جس نے اس کی خامی کی طرف توجہ دلائی تھی اور بھائی کو دوسری شادی سے روکا تھا۔ دل سے وہ بھی معاف نہ کر پائی تھی سرمد کو لیکن بظاہر سب ٹھیک ہو چکا تھا، شاید کبھی وہ دل سے بھی اسے معاف کر ہی دے۔

لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ میں سابقہ یاسمین احمد محی الدین پراچہ اور حالیہ یاسمین عبید رضا کند ذہن تو ہوں لیکن اتنی بھی نہیں کہ جتنی لوگ مجھے سمجھتے ہیں۔

میں نے عطرت بیگم کے وہ سارے وائس میسجز جو سرمد کے فون میں محفوظ تھے۔ اپنی انفارمر فرزانہ کو سینڈ کر دیے۔ اس میں وہ سرمد سے اظہار محبت کر رہی تھی اور وہ بھی جانو اور جان من کہہ کر کچھ باتیں عبید کے خلاف کر رہی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ بات بات پر طلاق لینے اور دوسری شادی کرنے کی پلاننگ بھی کرتی جا رہی تھی۔ یہ بھی کہہ رہی تھی عبید میں باپ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لیے وہ ماں نہیں بن سکتی یقیناً فرزانہ اتنی پکی تھی کہ اس نے ان میسجز بھیجنے والے کا یعنی کہ میرا نام چھپا کر اپنی کسی جاننے والی کا نام لیا جس کے شوہر کی دکان پر ایک موبائل فون یکنے آیا تو اس میں سے یہ آڈیو میسجز کی ریکارڈنگ ملی تھی اور بقول اس کے اتفاق سے وہ میں نے سن لی اور میاں کی کولیگ اور قریبی دوست کی بیوی عطرت بیگم کی آواز پہچان بھی لی، یوں یہ ریکارڈنگ عبید کے دوست کی بیوی کے ذریعے دوست تک پہنچی اور پھر اسی دن ہی یہ قیامت اس شخص پر بھی ٹھہر گئی کیونکہ اس قیامت کا آکر گزر جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ بے وفائی کی قیامت تھی جو نہ مارتی ہے نہ ہی زندہ رہنے دیتی ہے بلکہ قطرہ قطرہ موم بن کر شمع کی طرح جلاتی اور پگھلاتی رہتی ہے۔

میری قربانی کی جزا اللہ نے دینی تھی۔

سو وہ تین دن بعد ہی مجھے مل گئی۔

عطرت کو طلاق دے کر وہ لوٹا تو وہ نہ تھا جو برسوں سے دکھائی دیتا تھا اور میں بھی تو وہ نہ رہی تھی جو بھی ہوا کرتی تھی۔

''یاسمین! اب ہم اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر واپس لے آئیں گے۔ بس بہت رہ لیا اس معصوم نے ہاسٹل میں۔''

وہ بجھا بجھا سا تھا۔ بے وفائی پہلے جلاتی ہے اور

پھر بجھا دیتی ہے یہ احساس تو ہوگیا ہوگا یقیناً۔ میں بالکل چپ تھی، برسوں سے چپ ہی اوڑھنا بچھونا تھی۔ اتنی جلدی تو پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی اور میں بھی تو فطرتاً باوفا تھی، محبت اوڑھ لی تو اوڑھے رکھی پھر صبر اور چپ کی چادر میں خود کو چھپا لیا اور صبر تو عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ اس وقت تک جب تک سانسوں کا تسلسل رہتا ہے۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ شوہر کے ہوتے ہوئے تم نے بیواؤں والا حلیہ بنایا ہوا ہے؟'' میں نے اتنی حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ شرمندہ ہوگیا۔

اک لمبی مسافت کے بعد منزل جب سامنے ہوتی ہے، تب تک ہمیں سفر سے، راستوں سے پیار ہوجاتا ہے۔ اس وقت منزل پر پہنچنے کی خوشی پر سفر کے ختم ہوجانے کا دکھ بھاری پڑ جاتا ہے اس کا لمس میری خالی کلائی پر اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''سونے کی چوڑیاں ہوا کرتی تھیں تمہاری کلائی میں؟'' اس کی نظروں میں ملال تھا یا شاید خود کو ملامت کر رہا تھا۔

''عمر کی تین ماہ کی فیس دینی تھی۔ ہاسٹل کے اخراجات بھی زیادہ ہوچکے تھے۔ سو چوڑیاں بیچ دیں۔''

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہاں معافی مانگنا بنتا تھا لیکن خاموش تھا۔

''شاید بے وفائی کا دکھ کچھ کم ہو تو تبھی پچھتاوے کا احساس گھیرے گا اس کو۔''

میں نے سوچا اور کھانا بنانے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

''چلیں آپا! آگئے آپ کے مجنوں صاحب۔''

جاناں کی شوخ آواز نے مجھے خیالات کی وادی سے واپس کھینچ لیا۔

''نیچے کھڑے ہیں کہہ رہے ہیں یاسمین نے فون آف کیا ہوا ہے اور مجھے نیند نہیں آرہی اس کے بغیر۔ قسم سے آپا! ابھی فون آن کریں گی تو آئی مس یو کے ایک ہزار میسج موصول ہوجائیں گے بھائیاں کی طرف سے۔''

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچنے لگی۔

''تم سے ایک رات کا اکیلا پن سہا نہیں جارہا عبید رضا! اور میں نے ایسی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔''

وہ نیچے کھڑا میری راہ دیکھ رہا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ جاناں اور سرمد ڈنر پر جائیں گے اور تم بچوں کا خیال رکھو گی اور ان کے آتے ہی واپس آجاؤ گی۔''

میں نے اس کی معیت میں قدم اٹھاتے ہوئے کہا

''جی بالکل کہا تھا اور آتو گئی ہوں۔''

''تمہیں اندازہ بھی ہے، یہ چند گھنٹے مجھ پر کتنے بھاری گزرے ہیں؟ کتنی دیر سے فون کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ کہیں تم فون یا میسج کرو کہ مجھے لینے آجائیں عبید، اور میں نہ دیکھ پاؤں یا دیر ہوجائے اور تم بھائی کے گھر ہی سو جاؤ۔ پھر سرمد کی گاڑی کا ہارن سنا تو لگا تم گھر آنے والی ہو لیکن کئی گھنٹوں بعد بھی جب نہ تم نے فون آن کیا اور نہ ہی مجھے بلوایا تو میں خود ہی تمہیں لینے آگیا۔''

اس کا انداز وارفتگی لیے ہوئے تھا میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کوئی کام تھا مجھ سے؟ میں کھانا دے کر، پانی کا جگ آپ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ کھلا کر اور صبح کے لیے کپڑے بھی استری کر کے آئی ہوں۔ پھر بھی آپ کیوں اس قدر بے قراری سے میرے منتظر تھے۔''

وہ چپ تھا بالکل چپ شاید جو محسوس کر رہا تھا، ان جذبات کو زبان پر لانے کی ہمت نہیں تھی۔

لیکن میں جانتی تھی کہ صبح کا بھولا جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو اسے گھر ہمیشہ سے زیادہ پیارا لگنے لگتا ہے۔

☆☆

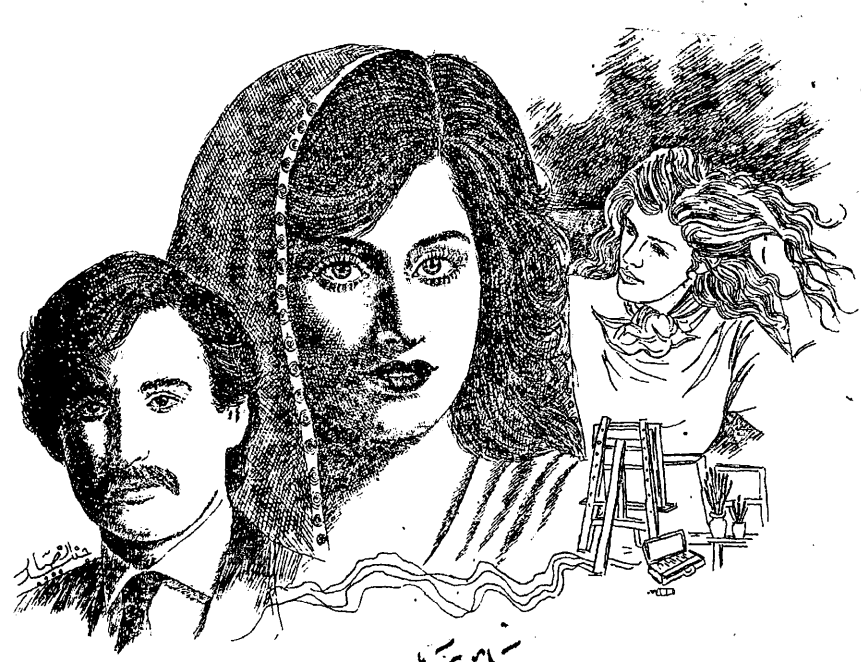

فائزہ بھٹی

بیٹی کے نام

''لاہور
14 فروری
پیاری بیٹی!

آج تمہیں گئے ایک برس بیت گیا۔ اس گزرے ایک برس نے مجھے سمجھا دیا کہ کچھ چیزیں اپنی ہوتے ہوئے بھی اپنی نہیں ہوتیں۔ جیسے تم...... جیسے میرا دل...... گزرے برس میں میرے دل نے تمہارے ایک ایک لمحے کی خبر مجھے دی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ کوئی خبر تمہارے سکون کی نہ تھی۔

تمہارے جانے کے بعد یہ دل واحد چیز ہے جس نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔

اور تمہاری ماں واحد ہستی ہے جس نے وفا کی ہے۔ مجھے یاد ہے جب تم گئی تھیں تو میں نے صرف ایک بار کہا تھا۔ ''نمو ہمارے لیے مرگئی۔ اب اس کا نام کوئی نہیں لے گا۔'' تمہاری ماں بہت روئی مگر خدا گواہ ہے اس نے تمہیں مردہ سمجھ کر تم پر فاتحہ پڑھ لی...... (اب خط پڑھ کر رونا مت)

تم نے وہ عذاب نہیں بھگتا نا...... جو ہم نے بھگتا ہے۔ تمہارے گھر سے بھاگ جانے والے عمل نے مجھے اور تمہاری ماں کو شیطان بنا دیا۔ جس کو کنکریاں مارنے اور ثواب حاصل کرنے صبح و شام لوگ آتے ہیں۔

تم کہا کرتی تھیں ''بابا! دنیا کا خوف دل سے نکال دیں۔ دنیا ایک دن کسی کو یاد رکھتی ہے۔ دوسرے دن بھول جاتی ہے۔''

مگر تم غلط کہا کرتی تھیں۔ ایک برس گزر گیا مگر ہم لوگ شیطان سے فرشتے نہیں بن سکے اور شاید قیامت تک بن بھی نہ سکیں۔

میں اب بھی دن کی روشنی میں گھر سے نہیں نکلتا۔ لوگ میرا چہرہ پہچان جاتے ہیں اور انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہتے ہیں ''وہ دیکھو اس لڑکی کا باپ جا رہا ہے، جو رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔''

پھر میں سوچتا ہوں، لوگ کتنا اچھا کرتے تھے بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ کاش اللہ مجھے اس زمانے میں رکھتا تو میں بھی تمہیں زندہ دفن کر دیتا۔ مجھے یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ اگر اس دور میں بیٹی کا باپ بنانا تھا تو تمہارے جیسی کرموں جلی کا باپ نہ بناتا۔

تم کہا کرتی تھیں نا۔ بابا! اللہ میری ہر دعا سنتا ہے، سمجھو تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، بس میرے لیے دعا کرو۔

''اللہ مجھے موت دے دے۔ نہیں تو کسی دن میں خود موت کو گلے لگا لوں گا۔''

دیکھو مجھے بابا نہ کہنا..... مجھے بابا کہنے کا حق تم کھو چکی ہو۔

فقط صدیق احمد''

☆☆☆

''لاہور

25 جولائی

پیاری بیٹی!

آج میں نے اس شخص کو دیکھا جس کی خاطر تم ہمیں زندہ قبر میں اتار گئی تھیں۔

اسے دیکھتا گیا اور سوچتا گیا۔ اس میں ایسا کیا ہے، جس کی خاطر تم نے میرے اٹھے سر کا خیال نہ کیا۔

ایسا کیا تھا اس شخص میں کہ تم اپنے چھوٹے بھائی کی محبت بھول گئیں۔ جسے تمہاری جدائی میں ایسا بخار چڑھا کہ جان لے گیا۔ کیا وہ شخص اتنا اہم تھا تمہارے لیے کہ اس کی خاطر تم اپنی ماں کو چور اہے میں ذلیل کر گئیں۔

مگر پھر میں نے جانا۔ ایسا کچھ بھی نہ تھا اس شخص میں..... بس تم ہی اپنے اصلی ہونے کا ثبوت نہ دے سکیں۔

ہوتی کوئی تمہاری ماں جیسی یا پھر سامنے والے ماسٹر نور الٰہی کی بیٹی جیسی تو وہ باپ کے اٹھے سر، بھائی کی محبت اور ماں کی چادر کی خاطر اس جیسے دس چھوڑ لاکھ بھی پاؤں کی جوتی پر رکھتی..... مگر دھوکا نہ دیتی۔

بس تم اپنے اصلی ہونے کا ثبوت نہ دے سکیں۔

فقط صدیق احمد''

☆☆☆

''لاہور

30 اکتوبر

پیاری بیٹی!

آج میں اپنی بیوی رشیدہ بیگم کو منوں مٹی تلے دفنا آیا ہوں۔ کل رات کہنے لگی۔ ''میں چلی گئی تو کسی مرے ہوئے کو اطلاع نہ دینا۔''

ہمارے دو ہی تو بچے تھے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ بیٹی پچھلے سال بیس سال کی عمر میں مر گئی۔ بیٹا ہم سے زیادہ اس کا وفادار نکلا۔ اس کے پیچھے ہی چل دیا۔ دونوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہمارا کیا ہوگا۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ ایسی اولاد کسی کو نہ دے جو آزمائش ہو۔

آج جب رشیدہ رشتہ داروں، ہمسائیوں کے درمیان اپنی آخری آرام گاہ جانے کو تیار تھی تو مجھے بڑی اکیلی لگی۔ بڑا ترس آیا مجھے اس پر۔

ہماری ماں کہا کرتی تھی۔ ماں باپ کی میت تو بیٹی کی آہوں سسکیوں سے سجتی ہے۔ بیٹی تو آسمان پر اڑتے پرندوں، زمین پر چلتے انسانوں کو اپنی آہوں سے روک لیتی ہے اور بتاتی ہے کہ ماں باپ کا مرنا کیا ہوتا ہے۔

کاش ہماری بیٹی بھی زندہ ہوتی تو لوگوں کو بتاتی ''ماں'' مری ہے۔

ب سوچ رہا ہوں۔ جب میں مرا تو میرا حال بھی رشیدہ جیسا ہوگا۔ رشیدہ کو تو میں رولوں گا پر مجھے کون روئے گا؟

اب اجازت چاہوں گا۔ سارا دن لوگ موجود تھے تو ٹھیک طرح سے رشیدہ کو رو بھی نہ سکا۔ اب میرا رونے کو بڑا دل کر رہا ہے۔ ویسے بھی اکیلا آدمی

''روندو'' ہوجاتا ہے۔

فقط صدیق احمد''

☆☆☆

''لاہور

2 جنوری

پیاری بیٹی!

آج صبح سے میرے بائیں پہلو میں رہ رہ کر درد اٹھ رہا ہے۔ جب سے سب چلے گئے ہیں، درد ہے کہ بڑھتا جارہا ہے۔ شاید کوئی خیال رکھنے والا نہیں رہا اس لیے۔

دو تین دن سے تو رشیدہ کے پاس بھی نہیں جاسکا۔ سارا دن یوں ہی بستر پر پڑا دروازہ تکتا رہتا ہوں۔ شاید کوئی آجائے۔ کبھی کبھار برابر والے سید صاحب آجاتے ہیں یا پھر اپنے گیارہ سالہ پوتے موحد کو بھیج دیتے ہیں تو دل بہل جاتا ہے۔

اللہ موحد بچے کی عمر دراز کرے، چھوٹے چھوٹے بہت سے کام کر جاتا ہے۔ ساتھ باتوں سے دل بہلائے رکھتا ہے۔

سید صاحب تو کل سے دوسرے شہر گئے ہیں مگر آج صبح سے موحد بھی نہیں آیا۔ اللہ خیر کرے، آجاتا تو درد کا احساس بھی کم ہو جاتا۔

آج تو یہ درد اپنے ساتھ بہت سی یادیں بھی باندھ لایا ہے۔

صبح سے ایک ایک یاد کو ماضی کے ٹوکرے سے اٹھا اٹھا کر اپنے پاس رکھتا جاتا ہوں۔ ایک ڈھیر سا لگ گیا ہے۔

تمہیں یاد ہے، میری ایک بیٹی تھی۔ بہت پیاری..... بہت معصوم.....

جب وہ چھوٹی تھی تو میں اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جھولے دیتا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلتا تھا، اسے اپنے ہاتھ سے لقمہ بنا کر کھلاتا تھا۔

پھر وہ ذرا بڑی ہوئی۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا بنا کر کھلانے لگی۔ میرے آفس سے واپسی پر پانی کا گلاس لے کر پہلے سے کھڑی ہوتی۔ میرے پیروں سے جوتے اتار کر اپنے نرم ہاتھوں سے ساری تھکن چن لیتی۔

میرے ساتھ لپٹ کر اپنے دن کی روداد مجھے سناتی۔ کچھ میری سنتی۔

پھر وہ ذرا بڑی ہوئی۔ اب تو میرے برابر آنے لگی تھی۔ میں اس سے بات کرتے ہوئے جھجک جاتا۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔

اب وہ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ اس کے کام کروانے لگی پھر اپنی ماں کو بھی چھوڑ کر وہ خود میں مگن ہوگئی۔

ہم دونوں کے کام چھوڑ گئی۔ مگر میں اور اس کی ماں اس کے کام کرنا، اس کی پروا کرنا کبھی نہ بھولے۔

پھر وہ بدل گئی۔ ہمیں لگتا تھا وہ ہم سے دور جارہی ہے۔ ہمارا شک صحیح نکلا۔ وہ چلی گئی۔ مجھے اور اپنی ماں کو انسان سے شیطان بنا گئی۔ وہ مرگئی..... بھائی کو بھی لے گئی..... ہم کنکریاں کھانے کو رہ گئے۔

پھر اس کی ماں سے بھی کنکریوں کی تکلیف برداشت نہ ہوئی اور اپنا لہولہان وجود لے کر منوں مٹی تلے چلی گئی۔ اچھا ہوا چلی گئی..... کل رات خواب میں آئی تھی، مجھے بھی بلا رہی تھی۔

مجھے لگتا ہے کہ یہ درد بھی اسی کا بھیجا ہوا ہے۔ کوئی وقت جاتا ہے کہ میں بھی اس کے پاس ہوں گا۔

مجھے لگتا ہے میری سانس ر..... رک..... ر..... رہی ہے.....''

☆☆☆

4 جنوری

صبح کے اخباروں میں ایک خبر لگی۔ لاہور کینال روڈ پر واقع ایک مکان میں سیکریٹ کے اعلا عہدے دار مردہ پائے گئے۔

ان کے مرنے کی وجہ ہارٹ اٹیک بتائی جاتی ہے۔ یاد رہے وہ کافی عرصہ سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کررہے تھے۔

☆☆

فاخرہ جبیں

قصہ ایک ساون کا

اور شمو دھی کے دل میں جانے کیا آئی کہ ساون کی بارھویں کو اماں، باوا کے نام خط لکھنے کو بیٹھ گئی۔ موبائل فون تو کئی مہینوں سے خراب پڑا تھا۔ ساس کے بیٹے سے جتنی بار ٹھیک کروانے کی فرمائش کی، اتنی ہی بار اپنا موبائل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''لے، اس سے بات کرلے۔'' مٹے ہوئے نمبروں والا موبائل، جس پر مر مر کے وہ نمبر ملا بھی لیتی..... پر داروغہ سر پہ کھڑا ہو تو قیدی کھل کر سانس کیسے لے؟

اماں، باوا سے دکھ سکھ ایسے تھوڑی ہو جاتا ہے۔ لمحوں میں، منٹوں میں، چٹکی بجاتے ہی..... ناں..... ہاں..... اتنی دیر میں تو کون..... کون..... کی تکرار ہی ہوتی رہتی۔

دو چار منٹ کے بعد ہی اشارے بازی شروع ہونے لگتی۔

''بس کردے..... ختم..... خلاص..... بیلنس گیا..... اڑ گیا سارا کا سارا.....''

وہ آدھی ادھوری بات کرتی اور موبائل بند۔ ہائے..... دل میں کیسی ہڑک اٹھتی تھی۔ اماں اور ابا سے بات کرنے کے لیے۔

''جانوں تو سہی..... میرے بعد کیا کرتے ہیں؟ اکیلی، اکلوتی دھی کو دیس نکالا دے کر اب کون ساعیش ہو رہا ہے؟''

اور اس ہڑک نے ایسا بے چین کیا کہ شمو دھی ساون کی بارھویں کو اپنی اماں اور ابا کے نام خط لکھنے بیٹھ گئی۔ سلام کے بعد اپنی خیریت بتائی۔

ان کی خیریت پوچھنے سے پہلے ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اونہوں.....'' لکڑیوں کا کڑوا کسیلا دھواں اندر تک چلا آیا تھا۔ اس نے آنکھیں رگڑیں اور اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا اور بھیڑنے سے ایک لمحہ قبل زرد رو، پژمردہ آسمان پر بھی ڈالی۔

''ہوا کو تو جیسے باندھ دیا کسی نے..... جس کتنا ہے؟ ہائے میری اماں کے تو ہاتھ تھک گئے ہوں گے، پنکھا جھلتے جھلتے.....''

دل شدت جذبات سے لبریز ہو گیا۔ چوکڑی مار کر نہایت اہتمام سے پھر سے لکھنے بیٹھ گئی۔

''آج ساون کی بارھویں ہے۔ اب تک کئی بار دھنا دھن مینہ برس چکا..... کل تو پانی آنگن سے رسوئی تک آن پہنچا۔ بالٹی بھر بھر پانی باہر نکالتے ہوئے سوچ کے ناگ نے بڑی زور سے ڈسا کہ بابل کے کچے آنگن میں جو ساون برسا ہوگا تو بالٹیاں بھر بھر پانی کون نکالتا ہوگا اور چھت کی خستہ کڑیوں سے جب پانی رِستا ہوگا تو ڈونگے، پیالے، جگ، پراتیں کون سجاتا ہوگا..... اور پھر اندھیارے میں بجتی جلترنگ پہ ادھر اُدھر کی جھوٹی، سچی باتیں کر کے کون دل بہلاتا ہوگا۔ کیا چھت پہ مٹی ڈالی تھی۔

ساون تو اندھا ہے۔ برسنے پہ آئے تو برستا چلا جاتا ہے.....

اچھا..... یہ تو بتاؤ اماں! میری پیاری اماں! جب بارش کا زور ٹوٹ جاتا ہے تو گڑ والی چائے بنانے کی فرمائش کیا اب بھی ہوتی ہے؟

گیلی، سیلی لکڑیوں کو سلگانے سے لے کر حقّے کی چلم بھرنے تک کڑوا کسیلا دھواں جب آنکھوں میں جاتا ہے تو کیا اس کی آڑ میں تم دونوں بھی اپنے جی کو ہلکا کرتے ہو؟ اور ہاں..... پانی کا مٹکا اب کون بھرتا ہے؟

اور جب تم دونوں میں سے کوئی ایک کھانستا اور پھر کھانستا ہی چلا جاتا ہے تو پیٹھ سہلانے، شہد چٹانے اور پانی کا کٹورا لبوں سے لگانے کون آتا ہے؟

بتاؤ ناں اماں! میری پیاری اماں! تمہارے

روئی سے سفید بالوں پہ مہندی کون لگاتا اور چھڑاتا ہوگا؟

میرے بابا کے پیروں کی دھول کون دھلاتا ہوگا؟

تم سے اور بابا سے دور..... یہ ساون.....؟ کیسا ساون ہے؟ اندھا، بھینگا، ٹھگنا..... کوجھا سا ساون..... ایک آنکھ نہیں بھایا اب کے برس.....

پتا ہے آج ساون کی بارھویں ہے۔ پر کسی نے ایک بار بھی نہیں پکارا کہ ''شموں دھی! میٹھے ٹکڑے ہی بنالو۔''

''شموں دھی! گڑ کی چائے..... سونف اور باداموں والی۔''

اب کے ساون میں نہ دھنگ رنگ چوڑیاں آئیں، نہ ہریالی چنری..... نہ جھولا باندھا کسی نے..... نہ بادل چھوئے میں نے۔

ہائے کیا غضب کیا.....؟ کوسوں دور کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ آنا، جانا، ملنا..... کارِدشوار!

بدن تو سارے جوکھم پورے کررہا ہے۔ پر میری روح..... میری جان..... میرا دل.....؟

اے اماں! میری پیاری اماں! ذرا اپنی اوڑھنی کو جھاڑو۔ میرے پیارے راج دلارے بابا! اپنے چہرے کی جھریاں ٹٹولو..... سب کچھ یہیں ملے گا۔ میں کچھ بھی ساتھ لے کر نہ آئی۔

کیسا ظلم کیا؟ مجھ اکیلی جان پر ترس کھایا..... نہ اپنی دو جانوں پر..... ہم تینوں کا اک دوجے کے سوا تھا بھی کون؟

لو جی..... میری ساس کا بیٹا آ گیا۔ یہ ساون کی گھنگھور گھٹا جیسا..... آنا فانا آ گھستا ہے گھر میں..... اب آتے ہی پوچھے گا۔

''رو رہی ہو کیا؟''

اور میں کہہ دوں گی.....

''رونا کاہے کا؟ بس یہ دھواں..... گیلی سیلی لکڑیوں کا..... آنکھوں میں بس گھسا ہی چلا آتا ہے۔''

شموں دھی نے آنکھیں رگڑیں۔

بڑے پریم سے خط کی ہر تہہ کو دو پوروں کے بیچ بارہا جمایا اور بڑے لاڈ سے ساس کے بیٹے کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

''جلدی پوسٹ کر دینا۔''

''کر تو دوں گا..... پر انہیں پڑھ کے کون سنائے گا؟''

باہر بادل بڑی زور سے گرجا تھا۔

شموں کے ہاتھ کانپے اور خط لہراتا ہوا دور کونے میں جا گرا۔ باہر ساون برسا اور اندر شموں دھی کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

''اب کیا ہوا؟'' ساس کا بیٹا گھبرایا۔ بے اختیاری میں پکارا۔

موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ گھڑی بھر میں پانی آنگن میں بھر گیا..... پھر آنگن سے رسوئی۔

ساس آوازیں دینے لگی تھی۔

''یہ بھی کوئی ساون ہے؟ اندھا، بھینگا، ٹھگنا..... کوجھا ساون.....''

وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی اور بالٹیاں بھر بھر رسوئی میں جمع پانی نکالنے لگی۔

☆☆

حنا بشریٰ

انوکھا لاڈلا

خلافی آنکھوں کی کانچ سی پتلیوں میں ارض و سما کی رعنائیاں، چہرے پہ حیا کا بوجھل پن، پیشانی پہ دائیں ابرو کے اوپر چمکتا سیاہ تل جو اسے ہر بری نظر سے بچائے ہوئے تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ، ملیح و معصوم چہرہ کہ ایک بار نگاہ اٹھتی تو جھکنا بھول جاتی۔ اس حسین چہرے کے تغیرات دل کو یوں اپنی طرف کھینچتے ہوئے محسوس ہوئے کہ من پگلے نے مچلتے ہوئے عمر بھر کی اسیری کی تمنا کر دی تھی۔ اب یہ تمنا حاصل کے زمرے میں آتی تھی یا پھر لا حاصل کے...... اس سے تو ابھی ولید خود بھی ناواقف تھا۔

اس حسین سراپے کو سوچتے ہوئے آدھی رات بیت چکی تھی۔ آج نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

وہ ابھی نہ جانے کتنی دیر تک اسی تصور میں کھویا رہتا کہ بازو میں زوردار سوئی چبھی تھی پھر دونوں ہاتھوں اور پیشانی پہ۔

”خانہ خراب ہو تمہارا......!“

متاثرہ حصے کو بے دردی سے کھجاتے ہوئے ولید تڑپ کر اٹھ بیٹھا کہ گال پہ بھی کاٹ لیا۔ غصے میں بھوت بنے ولید نے مچھر کو مارنے کی کوشش میں اپنے گال کو زوردار چپت سے مزید سرخ کر لیا۔

”اوہ خدایا...... اتنے مچھر......!“ وہ بری طرح سے جھنجھلایا۔

☆☆☆

صبح سورج کی کرنیں ہر سو اپنا پر پھیلا چکی تھیں۔ زوال کا وقت تھا، گرمی اپنے زوروں پہ تھی۔ رات کی بے آرامی کے بعد ولید کا پروگرام بہت لمبا سونے کا تھا۔ مگر اچانک سے لائٹ چکما دے گئی تو وہ

مکمل ناول

ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لباس یوں پسینے میں تر تھا جیسے نہا کر آیا ہو۔

''اف..... ایسے بھی ابھی جانا تھا۔'' گرمی کی وجہ سے نیند ٹوٹ گئی تھی۔

رات بھر مچھروں کا رقص دیکھا تھا، اس وجہ سے آنکھیں سرخ تھیں۔ اب لائیٹ جانے کی وجہ سے

سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کا مزاج تو اے سی والا تھا۔ بس حالات کی ستم ظریفی کہ پنکھا ہی میسر تھا۔ بجلی کی وجہ سے جب پنکھا بھی بند ہو جاتا تو غصے کے مارے اس کا دماغ گرم پانی کی کھولتی دیگچی بن جاتا تھا۔ اس کے اندر برداشت کا مادہ بالکل بھی نہیں تھا سو بستر پر یوں پڑے رہنا عذاب ہو جاتا تو اٹھ کر نہا لیا کرتا تھا۔ یا پھر کسی دوست کی شاپ پہ چلا جاتا تھا، جہاں اے سی کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ کو یخ بستہ کر دیا کرتی تھی۔ بجلی کی ایک منٹ کی بندش بھی اس کے شاہانہ مزاج پر گراں گزرتی تھی۔

''امی! ناشتہ بنا دیں.....!''

گردن کے گرد تولیہ ڈالے۔ صاف ستھری پینٹ شرٹ ہاتھ میں پکڑے وہ آواز لگاتا واش روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ عالیہ آپی کی آواز پر قدم رک گئے۔

''چندا..... پانی تو آ ہی نہیں رہا.....!'' عالیہ کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ ولید کے لیے ازلی شفقت بھی تھی۔ پریشانی تو پانی کی عدم دستیابی کے باعث تھی اور شفقت تو ہمیشہ سے اپنے ''لاڈلے'' بھائی کے لیے رہتی تھی۔ لہجے میں بھی اور لفظوں میں بھی وہ سب بھائی بہنوں میں بڑی تھی مگر جو محبت و شفقت ولید کے حصے میں آئی تھی، کسی اور کے حصے میں نہیں آئی تھی۔

''آپی! کوئی ایک آدھ بالٹی تو پڑی ہوگی نا.....!'' ولید کا نہانے کا ارادہ کمزور نہیں پڑا تھا۔ اسے روز کی طرح یقین تھا کہ پانی بھلے نہ بھی آ رہا ہو مگر عالیہ نے ضرور اس کے لیے پانی رکھا ہوتا تھا۔

''چندا..... آج تو بالٹی بھی نہیں ہے.....!'' وہ جولا پروائی سے واش روم کی جانب بڑھ رہا تھا، اب رک گیا۔

''تو کہاں گیا پانی؟'' ولید کو لگا کہ عالیہ یقیناً مذاق کر رہی ہے۔

''وہ تو ابو نے استعمال کر لیا.....!'' عالیہ دھیمے لہجے میں بولی۔ وہ ولید کو جانتی تھی۔ کتنا نازک مزاج تھا۔

''کیوں.....؟'' میٹر گھوما تو گردن سے تولیہ اس غصے اور شدت سے کھینچا کہ رگڑ سے اپنی ہی گردن سرخ کر ڈالی، جبکہ آنکھیں تو پہلے ہی لال انگارہ ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ چیخا تو عالیہ جو آٹا گوندھ رہی تھی، گھبرا اٹھی، تیزی سے سنے ہوئے ہاتھوں کو پونچھتی وہ ولید کے قریب آ گئیں۔ اسے اندازہ تھا لاڈلے کا موڈ بری طرح سے خراب ہو گیا ہے۔ نہ اب خستہ پراٹھوں سے ٹھیک ہونا ہے اور نہ ہی ''خالص ملائی والی چائے'' سے۔

''ابو نے قرآن خوانی پہ جانا تھا..... نہانا ضرور تھا نا۔'' عالیہ نے محبت سے اس کے گال تھپتھپاتے پانی ختم ہونے کی وجہ بیان کی۔ اور ویسے بھی یہ مجبوری صرف ولید کے حصے میں نہیں آئی تھی، پانی نہ ہونے کی وجہ سے باقی سب گھر والے بھی اسی انتظار میں تھے کہ پانی آئے تو پسینے و گرمی سے بوجھل وجود ٹھنڈے کریں۔

''تو اب میں کیسے نہاؤں!'' وہ غصے میں بھوت بنا چلایا تو پاس کھڑی عالیہ تو لرزی ہی تھی، کمرے میں بچوں کے پیپرز چیک کرتی شافیعہ بھی سب چھوڑ چھاڑ کر باہر نکل آئی۔ یقیناً وہ بھی اس چیخ چنگھاڑ پہ سہم گئی تھی، باہر کا منظر اور ولید کے ہاتھ میں تولیہ دیکھ کر اسے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی تھی، اپنے اسکول کی ذہین و فطین استانی سب سمجھ گئی تھی کہ لاڈلا کس بات پہ بگڑ رہا ہے۔

''سنو ابھی تھوڑی دیر تک لائٹ آ جائے گی نا..... پھر پانی بھی..... غصہ کیوں ہوتے ہو۔''

ہر حال میں صابر و شاکر رہنے والی استانی، عالیہ سے سال بھر چھوٹی تھی، مگر ولید سے یہ بھی بڑی تھی وہ اس کا بھی لاڈلا تھا..... بلکہ بے حد لاڈلا، شافیعہ کو تو اپنے سارے بہن بھائیوں میں سب سے پیارا ولید ہی تھا، بلکہ وہ تو اس کے دل کے اتنا قریب تھا کہ اکثر اس کی حمایت میں وہ دوسروں کے ساتھ کھلم کھلا ڈنڈی مار جایا کرتی تھی، اگر یہ ناانصافی تھی تو شافیعہ اس ناانصافی پہ بھی مطمئن تھی۔

''وہ اس کا لاڈلا تھا..... بس تھا۔''

''جب تک پانی آتا ہے..... ناشتہ کرلو ولید!''

اس کا عرق آلود چہرہ بے حد مشفقانہ انداز میں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی شافیعہ نے اسے ایک مفید مشورہ دیا۔

''آپی! پتا ہے نا کہ میں نہائے بغیر ناشتہ نہیں کرتا۔'' لاڈلے کی ایک اور نوابی عادت۔ وہ نوابوں کے خاندان میں تو نہیں پیدا ہوا تھا مگر نہ جانے کس نواب کی گھٹی اسے پیدائش کے وقت مل گئی تھی کہ ہر عادت ہی نزاکت کی اعلا حدوں کو چھوتی تھی۔

''ہاں نا لیکن.....'' مزید دلار کے لیے شافیعہ اور عالیہ بیک وقت آگے بڑھی ہی تھیں کہ ولید نے تولیہ پوری شدت کے ساتھ تخت پہ پھینکتے یہ ظاہر کردیا کہ اب پارہ فل چڑھ چکا ہے۔ اس حالت میں کوئی لاڈ دلاراس کا پارہ اعتدال پہ نہیں لاسکتا۔

''ارے یہ کیا طوفان مچا ہے ولید بیٹا.....!''

بلقیس جو چھت پہ چھوٹی ندا کے ہمراہ کپڑے دھوپ میں پھیلانے گئی تھیں۔ تو ہانپتی کانپتی نیچے اتریں تو یہ ہنگامہ ان کو پریشان کرگیا۔ ایک تو گرمی، دوسرا جوڑوں کا درد..... اور اس کے باوجود یہ گھر کے کام کاج جو ہر صورت ہی عورت کو کرنے ہوتے ہیں، ایسی تھکن زدہ حالت میں انہیں ولید کا یہ ہنگامہ سخت ناگوار گزرا تھا۔

''ندا! پانی لاؤ امی کے لیے۔'' قریب ہی پڑا ہاتھ سے جھلنے والا پنکھا اٹھا کر عالیہ نے ماں کو ہوا دینا شروع کی اور ساتھ ہی چھوٹی بہن ندا کو پانی لانے کا بھی کہا۔

''امی! کہا بھی تھا میں نے کہ میں چھت پہ کپڑے پھیلا آؤں گی..... مگر آپ.....'' درد سے گھٹنوں کو سہلاتی ماں کو دیکھ کر عالیہ کو دلی تکلیف ہونے لگی تھی۔

''اچھا ہے چلتی پھرتی رہتی ہوں..... بیٹھ گئی تو یہ بالکل ہی بیکار ہوجائیں گے۔'' ندا اسی دوران پانی کا گلاس لے آئی تھی۔

''اتنا کام تو تم لوگ کردیتی ہو..... کوئی کپڑے دھو دیتا ہے کوئی میرے ساتھ چھت پہ پھیلانے چلا جاتا ہے۔ اور کوئی استری کردیتا ہے.....!'' بلقیس کی تینوں بیٹیاں ہی حساس تھیں اور کچھ انہوں نے تربیت ہی اس طرح کی تھی کہ وہ سب کی سب خدمت گزار تھیں اور بلقیس کو اپنی تربیت پہ فخر تھا' احساس، پیار و محبت تو بلقیس نے اپنی تینوں بیٹیوں کو گھٹی میں ملا کر دیا تھا۔

''پانی نہیں آرہا تھا تو یہ کپڑے کیسے دھلے تھے؟'' ولید کی سوئی اسی پانی کی بالٹی پہ اٹکی تھی۔

''اف ولید بھائی.....!'' اب کے ندا بھی خاموش نہ رہ سکی، وہ ولید سے چھوٹی تھی، دونوں کی بنتی بھی خوب تھی اور لگتی بھی خوب..... کہ اکثر تو اتنی شدت ہوتی جھگڑنے میں کہ لگتا ''پانی پت'' کی جنگ چھڑ گئی ہے اور اکثر غلطی بھی ولید کی ہوا کرتی تھی مگر ندا کچھ دیر بعد ہی صلح و صفائی کے لیے بے قرار ہوجایا کرتی تھی تو امین صاحب (ولید کے والد) ندا کے ترلے منتیں دیکھ کر غصے میں آجایا کرتے تھے۔

''ایک تو تم سب نے اس نواب زادے کا دماغ ساتویں آسمان پہ پہنچا دیا ہے۔'' مگر ندا اپنی منانے والی فطرت سے مجبور تھی اور ولید نوابی پن سے مجبور تھا۔ خوب ناز نخرے دکھانے کے بعد..... وہ صلح پہ آمادہ ہوتا اور جرمانے کے طور پر کوئی نہ کوئی اپنی پسند کی ڈش ندا سے پکوایا کرتا تھا۔

''ولید بھائی.....! ہماری صبح ہوتی ہے فجر کے بعد اور آپ کی دن کے بارہ بجے۔'' ندا نے وضاحتوں کا سلسلہ شروع کیا تو ولید نے اس کی طرف غصیلے انداز میں دیکھتے یوں آنکھیں سکیڑ لیں کہ ایک تو نہانے کے لیے پانی نہیں اور اوپر سے چھوٹی کا یہ بھاشن۔

''جو جاگے وہ پا گئے..... جو سوتا رہا وہ کھوتا رہا۔''

ولید بھائی آپ بھی جلدی اٹھ جاتے تو پانی مل جاتا۔'' ندا نے شوخی و شرارت سے زبان نکال کر چڑایا تو تپا ہوا ولید مزید آگ بگولہ ہوگیا۔

''چھوٹی! اب تو میرے ہاتھوں پٹے گی۔''

اس سے پہلے کہ ولید اس کی چوٹی کھینچتا۔ ندا بھاگ

کر تخت کے دوسری طرف چلی گئی اور درمیان میں ماں کو ڈھال بنالیا۔

''کیوں تیار ہی ہو بھائی کو.....؟''

شافیعہ کو تو بالکل ہی برداشت نہیں تھا کہ اس کے لاڈلے کو ذرا سا بھی کوئی ستائے۔

''اب میں کیا کروں..... نہاؤں گا نہیں تو باہر دوستوں کے پاس کیسے جاؤں گا۔'' چھٹی کا دن ولید اپنے دوستوں کے ساتھ گزارا کرتا تھا، نہا دھو کر وہ ان دوستوں کی طرف چلا جایا کرتا تھا، جن کے گھروں میں اے سی کی سہولت موجود ہوتی تھی۔

دن بھر موج مستی کرنے کے بعد وہ جب گھر لوٹتا تھا تو اس کا موڈ خوب فریش ہوتا تھا، وہ ''محفل دوستاں'' کی رونق و جان تھا۔ کبھی میچ کھیلنا ہوتا تو ولید شامل ہوتا..... پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا تو ولید پیش پیش ہوتا۔ ولید کے دوستوں کا یہ ٹولہ اس سوچ کا مالک تھا' کہ زندگی ایک بار ملتی ہے یار..... جی لے اپنی من مرضی سے۔''

پانی نہ ہونے کی وجہ سے انجوائے منٹ کے دو گھنٹے اس بک بک جھک جھک میں برباد ہوگئے تھے۔ بیچ میں ایک دو کام بلقیس نے بھی کہہ دیے۔

''کمرے کا بلب چینج کردو۔ چھت پہ کپڑے پھیلانے والی رسی کس دو..... اور تیسرا کام جس سے تو ولید کو سخت نفرت تھی کہ بازار سے کوئی سودا سلف لا دو.....''

امین صاحب کی مصروفیت کی وجہ سے اکثر گھر کی خواتین سودا سلف لانے کے لیے ولید کی منتیں کیا کرتی تھیں، مگر اس کی طرف سے صاف جواب ملتا تھا۔

''بائیک نہیں ہے میرے پاس، اب اتنی گرمی میں کہاں پیدل پھرتا رہوں۔'' کچھ عرصے سے لاڈلے نے بائیک کی فرمائش بھی شروع کردی تھی، وہ تو امین صاحب کی طرف سے ڈانٹ ایسی پڑی تھی کہ پھر کھلم کھلا بائیک کا ذکر تو نہ کیا تھا مگر دل میں خواہش ابھی بھی زندہ تھی۔

''میں اس عمر میں پیدل آتا جاتا ہوں..... اور ایک یہ ہیں نام کے نوجوان..... دو قدم چل کر ان کی ٹانگیں درد کرنے لگتی ہیں.....!''

بائیک کی بات پہ اکثر ہی امین صاحب کی طرف سے ایسے طعنے سننے کو ملتے تھے اور یہ طعنے ولید کا دل جلا کر کوئلہ کردیا کرتے تھے۔

''امی..... !شام کو کردوں گا آپ کے یہ کام.....''

دونوں ہاتھ بیزاری سے جوڑتے اس نے ''ہری جھنڈی'' دکھادی۔ ہر ایک کے مشورے کو رد کرتا وہ سٹپٹایا سا چیخ چلا رہا تھا کہ ایک دم سے دروازہ کھلنے کی آواز پہ سب اہل خانہ خاموش ہوگئے۔ کسی کی زبان بند ہوئی تو کسی کی آواز دھیمی۔ کسی نے سنبھل کر دوپٹہ سر پہ رکھا، ندا بھاگتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی..... سب خاموش تھے مکمل خاموش لیکن اگر ابھی تک کوئی بلند آواز میں بول رہا تھا تو وہ ولید تھا، کسی کی اچانک آمد سے بے خبر..... اپنی دھن میں۔

''السلام علیکم ابو.....!'' ندا کی آواز پہ ولید نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ خود کو بریک لگا کر سنبھالا۔

''السلام علیکم ابو.....'' اس نے بھی اپنے منہ کے زاویے تیزی سے درست کرتے کہا۔

''وعلیکم السلام۔''

کڑے تیوروں اور گہری خاموش آنکھوں سے ولید کو گھورتے وہ تخت پہ آ بیٹھے تو بلقیس نے ندا کو پانی لانے کے لیے دوڑایا۔ امین صاحب کی عقیلی نگاہوں کا زاویہ ولید کی طرف تھا، اس لیے سب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ شامت ہمیشہ کی طرح گھر بھر کے لاڈلے کی ہی آنے والی ہے۔

''مگر کس بات پہ.....؟'' یہ جاننا باقی تھا۔

''پتا ہے' تمہاری آواز کہاں تک آ رہی تھی؟'' قہر آلود تاثرات کے ساتھ اس سوال کا مخاطب ولید تھا۔ ان کے رعب و دبدبے کی وجہ سے وہ جواب تو نہ دے سکا مگر سر کو جھکا لیا۔ پیشانی پہ بل ڈالے وہ اب زمین کو گھور رہا تھا۔

''چوک تک.....'' امین صاحب نے خود ہی بتا دیا کہ آواز کہاں تک آ رہی تھی۔ وہ ابھی بھی مسلسل ولید کو گھور رہے تھے۔ جبکہ باقی گھر والے سہمے ہوئے کبھی امین صاحب کو دیکھتے تو کبھی ولید کو..... کوئی دل

ہی دل میں ''تعوذ'' پڑھ رہا تھا تو کوئی آیت الکرسی کہ امین صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو۔

''ابو! پانی.....!'' ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ندا پانی لے آئی..... دو تین سانس لے کر انہوں نے ٹھنڈے پانی سے حلق کو تر کیا مگر ہر گھونٹ لینے کے بعد ولید کو گھورنا نہ بھولے۔

''کب بڑے ہو گے تم ..... بتاؤ مجھے!'' گھر والے تو سمجھ رہے تھے کہ پانی پی کر وہ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ بات رفع دفع ہو جائے گی۔

''اب جواب دو مجھے، زبان پہ کیا ''ہیلفی'' لگا لی ہے؟'' امین صاحب نے ہمیشہ کی طرح قریب پڑی لاٹھی اٹھائی اور فرش پر مارتے ہوئے جواب طلبی کی تھی۔ ان کا یہ انداز بالکل اسکول ماسٹروں جیسا ہوا کرتا تھا۔ جو پہلے بات کا جواب مانگتے ہوئے چھڑی کو زمین پہ مارتے ہیں تو کبھی لکڑی کی ٹیبل پر درشتی سے مارتے ہیں۔ شاید یہ بتانے کے لیے کہ سیدھی طرح جواب دو ورنہ یہ آئی ظالم چھڑی..... اب تمہاری پیٹھ پہ۔

''ابو! نہانے کے لیے پانی تک نہیں ہے!'' ولید جواب تو نہیں دینا چاہ رہا تھا مگر امین صاحب کے سامنے اس کی کیا مجال تھی کہ وہ جواب دیے بغیر ٹل جائے۔

''تو اٹھ جانا تھا اس وقت جب پانی آ رہا تھا!''

شاید ولید کو امید تھی کہ امین صاحب اس مسئلے کو ''مسئلہ کشمیر'' سے بھی زیادہ اہمیت دیں گے کہ یہ تو بڑا ظلم ہوا کہ گھر کے ''اکلوتے لاڈلے بیٹے'' کے لیے نہانے کا پانی تک میسر نہیں تھا مگر وہ تو اسی پر الٹ پڑے تھے، ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز کے ساتھ جو وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ سخت گیر بھی اور کرخت بھی۔

''اور کون سی ایسی اہم میٹنگ پہ جانا تھا تم نے۔ جس کے لیے اتنی چیخ و پکار مچائی جا رہی تھی۔ ان ہی آوارہ لڑکوں کے ساتھ موج مستی کے لیے ہی جانا تھا نا!''

ایک اور کڑا سوال کرتے ہوئے انہوں نے اس زور سے لاٹھی فرش پہ ماری تھی کہ بلقیس سمیت تینوں بیٹیاں بھی سہم سی گئیں۔

''چھوڑیں نا..... کیوں غصہ کرتے ہیں۔ میں سمجھا لوں گی!'' بلقیس نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی تھی..... لیکن وہ ہمیشہ باپ بیٹے کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش میں ناکام ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کی تو نہ امین صاحب کے سامنے چلتی تھی اور نہ ہی ولید ان کے قابو میں تھا۔

''تم نے سمجھا لیا بلقیس اور اس شہزادے نے سمجھ لیا۔ اونہہ!''

بیوی کو آڑے ہاتھوں لینا وہ کسی بھی موقع پہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ان کے مطابق ولید کے بگڑنے میں سارا ہاتھ بلقیس بیگم کا تھا جنہوں نے اس کے ''اکلوتے'' ہونے کو اتنی اہمیت دی کہ آج صاحبزادے کا دماغ آسمان پہ جا پہنچا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق بلقیس اگر بیٹے کو بھی اسی طرح کھینچ کر رکھتیں جیسے بیٹیوں کو رکھا ہے تو شاید آج وہ اتنا لاپروا ہوتا نہ ہی اس قدر بگڑا ہوا۔

''ابو! میں سمجھا دوں گی..... آپ غصہ نہ کریں ایسے ہی بلڈ پریشر جائے گا۔'' اب کے عالیہ بھی ''لاڈلے'' کی حمایت میں آگے بڑھیں۔

''تم لوگوں کو یہ سمجھتا کیا ہے، جو تم سمجھاؤ گی اور یہ سمجھ جائے گا.....!'' امین صاحب نے ایک خوں خوار نگاہ ولید پر ڈالتے ہوئے کہا تھا جو سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ ماتھے کے بل بتا رہے تھے کہ وہ بس باپ کے سامنے خود پر قابو رکھے ہوئے ہے ورنہ یوں اسے کوئی باتیں سنائے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اور اس وقت تو اسے بے پناہ غصہ آ رہا تھا کہ باپ نے اس کے دوستوں کو ''آوارہ'' کا لقب دے کر ان کی مٹی پلید کر دی تھی۔

چند لمحوں کے لیے امین صاحب اس خاموش بت کو گھورتے رہے۔ پھر جو ان کی دھواں دھار تقریر شروع ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ بدتمیز..... آوارہ دوستوں کے ساتھ دن بھر آوارہ گردیاں کرتا ہے، مجال ہے کبھی

دکان پہ آ کر باپ کا ہاتھ بٹائے.....

امین صاحب کا مین بازار میں بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ جو گھر کی آمدن کا واحد ذریعہ تھا..... جس سے بچوں کو تعلیم بھی دلوائی تھی، دونوں بڑی بیٹیاں تو گریجویشن کر چکی تھیں اور خود ولید جو ابھی تھرڈ ایئر میں تھا..... چاہتے تو وہ یہ تھے کہ ان کی بیٹیاں بھی ماسٹرز کریں مگر حالات سازگار نہ تھے کہ وہ ان کے تعلیمی اخراجات اٹھا سکیں۔ سو وہ چاہتے تھے کہ بیٹا اس قابل ہو جائے تاکہ ماں بہنوں کا سہارا بن جائے کیونکہ وہ مرد ہے' کل کو وہی کمائے گا..... اس لیے تعلیم اچھی ہوگی تو ملازمت بھی اچھی ملے گی۔

''یہ نہ ہو سکا کہ باپ کی غیر موجودگی میں جا کر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دکان کھول لیتا۔ گھر میں ماں بہنوں پہ چیخم دھاڑ شروع کر رکھی ہے.....!''

''پانی ختم ہو گیا ہے۔ اب آگ لگا دو دنیا میں.....!'' امین صاحب کا غصہ کسی طرح کم نہ ہوا تو ولید شکوے بھری نگاہ باپ پر ڈالتا اسی حلیے میں گھر سے باہر نکل گیا۔ مگر امین صاحب کی بڑبڑاہٹوں اور طعنوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

ایسی صورت حال سے' وہ اکثر ہی دوچار رہتا تھا سو گھر سے باہر نکل کر عارضی فرار اختیار کر لیا کرتا تھا۔

☆☆☆

افق پہ شفق کی لالیوں نے، چرند پرند کی ٹولیوں نے اپنے آشیانوں کا رخ کیا۔ تھکاوٹوں کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے سورج نے آخری نگاہ رخصت چہار سو ڈالی اور اپنی حکومت عارضی طور پر شام کے سپرد کر کے الوداع ہونے کا اشارہ کہہ کر شام ہونے کا اشارہ دیا تھا۔

ولید کو دن بھر یونہی بے مقصد پھرتے شام ہو گئی تھی۔ اس کے وجود پہ' دل و دماغ پہ بے زاری قابض تھی..... آشیانوں کی طرف لوٹتے پرندوں کی طرح اب اسے بھی گھر کی طرف لوٹنا تھا مگر دل ابھی بھی گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امین صاحب جاگ رہے ہوں گے اور اسے دیکھتے ہی پھر سے ان کی دھواں دار طنز و تشنیع سے بھرپور تقریر شروع ہو جاتی تھی۔ آج اس کا موڈ صبح سے خراب تھا باقی کسر امین صاحب کے لیکچر نے پوری کر دی تھی۔

اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا' وہ یونہی سارا دن آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔ اب اسے اس وقت تک یونہی پھرنا تھا جب تک شام کا اندھیرا رات کی سیاہی میں نہ بدل جائے۔ وہ اسی وقت گھر جائے گا جب سب سو رہے ہوں گے۔ تاکہ کسی سے سامنا نہ ہو۔

دن بھر تو اس نے چند دوستوں کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ مگر اب وہ تنہا تھا۔ اس کے سارے دوست کسی نہ کسی کام سے لگے ہوئے تھے۔ کوئی ملازمت پیشہ تھا تو کسی کا اپنا کاروبار..... سو ہر ایک کو رات کو جلد سونا ہوتا تھا تاکہ صبح جلد اٹھ سکیں۔ ان میں صرف ولید ہی زیر تعلیم تھا۔

یوں ہی پھرتے ہوئے شہر کی مین روڈ پہ آ گیا تھا۔ جہاں پر فٹ پاتھ پہ ایک عمر رسیدہ شخص ہر اتوار کو پرانی کتب کی دکان لگایا کرتا تھا۔ کتب بینی کا شوق ولید کو بھی تھا۔ جب پیسے ہوتے تو کبھی کبھار کتب بھی خرید لیتا تھا اور جب نہ ہوتے تو صرف دیکھنے پہ اکتفا کر لیا کرتا تھا۔ آج بھی محض وقت گزاری کے لیے وہ وہاں پہنچ گیا۔

''یہ کتاب کتنے کی ہے انکل.....؟'' دلکش لب و لہجہ اپنی تمام رعنائیوں سمیت ولید کی سماعت میں رس گھول گیا تھا..... ولید اس آواز کو ہزاروں تو کیا لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا گو کہ اس نے یہ آواز دو تین بار ہی سنی تھی مگر آواز کے سحر نے دل کو جکڑ لیا تھا۔ اس آواز کی بازگشت وہ اکثر ہی رات کے سناٹوں میں سنا کرتا تھا۔

کتاب دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ بے اختیار ہی اس جانب اٹھی تھی..... نہ تو یہ آواز اجنبی تھی اور نہ ہی یہ صبیح چہرہ پہلی بار دیکھا تھا۔

سیاہ پھول دار پرنٹڈ قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے وہ سیاہ بدلیوں سے جھانکتا، اہل زمین کو اپنا دیدار کرواتا بدر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی گوری دمکتی رنگت کو دوپٹے کی سفیدی نے مزید اجال دیا تھا۔

''بیٹا چار سو کی.....!'' دکاندار یوں شفقت سے بولا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ ہوں۔

''انکل! کچھ رعایت نہیں دیں گے؟''

''کیوں نہیں بیٹا..... آپ کے لیے تو رعایت ہی رعایت ہے۔'' دکان دار نے نہ صرف خوش دلی سے جواب دیا تھا بلکہ ڈیڑھ سو روپے کی حیرت انگیز ڈسکاؤنٹ کی پرچی بنا کر اس سراپا حسن و جمال کو تھما دی۔

''شکریہ انکل.....!'' وہ مسکرائی تو یوں لگا کہ چاند مسکرا اٹھا ہو۔ اس کے دودھیا گلابی رخسار میں پڑتا بھنور دیکھ کر ولید مبہوت رہ گیا۔ کس قدر حسین چہرہ تھا اور اس کی مسکراہٹ بھی کتنی سحر انگیز تھی۔ ولید نے پہلی بار کسی صنف نازک کے حسن و جمال پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔ یوں پہلی بار کسی کو محویت سے دیکھا تھا۔ وہ پلک جھپکنا بھول گیا۔ اس کی اتنی محویت پر اس نے نازنین نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں چند ثانیوں کے لیے ملیں۔ ان بلوری آنکھوں میں ناگواری ابھری..... شاید ولید کی محویت پر، جو ٹوٹنے میں نہیں آ رہی تھی۔

''نوجوان..... یہ کتاب خریدنی ہے یا پھر یونہی ہاتھوں میں لے کر کھڑے ہو؟'' ولید کی محویت اور نہ جانے کتنی دیر تک قائم رہتی کہ دکان دار کی غصیلی آواز نے اسے جھنجھوڑا تھا۔

''بابا جی..... آں ہاں لینی ہے۔ کیوں نہیں لینی.....!'' اپنی بوکھلاہٹوں کو سمیٹتے ہوئے ایک آخری نگاہ اس ''پری زاد'' پر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

''لینی ہے تو بتاؤ..... یہ پتھر کا بت بن کے کیوں کھڑے ہو؟'' ولید کے ہاتھ سے کتاب تقریباً کھینچتے ہوئے اس دکاندار نے بل بنانے کے لیے صفحہ اول پہ قیمت دیکھی اور غضب ناک نظر اس پہ ڈالی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس عمر رسیدہ شخص نے بھی اس کی ''محویت'' دیکھ لی تھی۔ وہ بھی یقیناً ولید کو کوئی ''نظر باز'' انسان سمجھ رہا تھا۔ اسے ایک نوجوان کا یوں محویت سے ایک لڑکی کو گھورنا سخت ناگوار لگا ہو۔

''کتنے کی ہے بابا جی؟'' کھسیانا ہوتے ہوئے اس نے دکان دار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آٹھ سو کی.....!'' دکاندار نے عینک کے پیچھے سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''آٹھ سو.....!'' ولید کا کتاب لینے کا پروگرام تو تھا مگر یہ کوئی سستی نہیں تھی۔ آٹھ سو کی تو نہ اس کی گنجائش تھی اور نہ ہی موڈ..... اس کے والٹ میں بمشکل تین چار سو تھے۔ شافیہ نے امین صاحب سے چھپ کر اسے ہزار کا نوٹ دیا تھا..... کچھ استعمال کر لیے تھے باقی کچھ بچ گئے تھے۔

''کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں ہے؟'' چور آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ مصنوعی ہنسی ہنسا تھا۔

''کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں ہے۔ لینی ہے تو لو..... خواہ مخواہ میرا مغز نہ چاٹو.....!'' نہ جانے دکان دار کیوں اس پہ اتنا تپا ہوا تھا۔ ولید کے ہاتھ سے کتاب تقریباً چھینتے ہوئے اس نے جگہ پہ واپس رکھی اور دوسرے گاہک کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ ولید اس کے رویے پہ الجھ سا گیا تھا۔ لڑکی کو خوش دلی سے ڈسکاؤنٹ دیا تھا۔ گفتگو کا انداز بھی خاصا شیریں تھا مگر ولید کے ساتھ تلخ ہو رہا تھا جیسے جنموں کا کوئی بیر ہو۔

''مجھے کیا کرنا ہے تمہارا ''سڑا'' ہوا مغز چاٹ کے!'' ولید زیر لب اپنے تئیں بہت دھیمے انداز میں بڑبڑایا مگر اس لڑکی نے سن لیا تھا۔ ولید پر ایک ناگوار نظر ڈالی تھی کہ جیسے جتا رہی ہو ایک بزرگ آدمی کے بارے میں یوں بولنا کتنا برا عمل ہے۔

''اب جاتے کیوں نہیں ہو..... خوامخواہ رش نہ کرو.....!'' ولید کو وہیں جما دیکھ کر دکان دار پھر سے بھڑک کر بولا تھا۔

''جا رہا ہوں بزرگو..... غصہ کیوں ہوتے ہو؟'' ولید کو اس شخص پر سخت تاؤ آ رہا تھا، وہ مسلسل اس کی بے عزتی کیے جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب سنائے مگر اس لڑکی کے سامنے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ سو اپنا جلالی غصہ زہریلی مسکراہٹ تلے چھپا لیا تھا۔

''جی۔ میں فارغ ہو گئی ہوں.....!'' وہ لڑکی اب فون پہ بات کر رہی تھی۔ یوں جیسے کسی کو واپسی کا

ٹائم دے رکھا تھا۔ اب اپنے فارغ ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایک نوجوان بائیک پر آیا تھا۔ وہ ہیلمٹ پہنے ہوئے تھا۔ کچھ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے ولید پہچان نہ پایا مگر اسے یوں لگا کہ جیسے وہ اس نوجوان کو جانتا ہو۔ مگر کون؟ وہ ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ وہ لڑکی بائیک پہ اس کے پیچھے جا بیٹھی اور بائیک گرد اڑاتی زن سے آگے بڑھ گئی۔ ولید کی نظروں نے دور تک ان کا تعاقب کیا تھا۔

''نہ جانے یہ کون تھا۔ دونوں کا کیا تعلق تھا؟''

ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر ولید کو نا معلوم سی چبھن ہوئی تھی۔ وہ جو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا بس دو تین بار آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا گھر کہاں تھا مگر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ ایک اجنبی لڑکی کے لیے دل کے نہاں خانوں میں جلن کا یہ جذبہ؟

''آخر کیوں؟''

''کس لیے؟''

''اس کی وجہ؟''

وہ لڑکی اسے کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں اچھی لگی تھی۔ وہ تو اس کی اپنی بھی نہیں تھی پھر بھی دل اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر برداشت نہ کر پایا تھا۔ اس کے اندر بے زاری سی پھیلنے لگی تھی جس میں اداسی کا عنصر بھی شامل تھا۔

''گھر جانے کا ارادہ ہے یا ساری رات آج یہیں کھڑے رہنا ہے؟'' اس کی آنکھیں ابھی بھی اسی سمت تک رہی تھیں جہاں وہ لڑکی بائیک والے کے ساتھ گئی تھی کہ عقب سے اس دکاندار کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''جا رہا ہوں۔ بابا جی! لگتا ہے کہ آج کھانے میں مرچیں کچھ تیز کھالی ہیں آپ نے..... جو اتنے جلے بھنے ہیں!''

وہ حسینہ جا چکی تھی۔ اب کیسی تہذیب اور کہاں کی شائستگی؟ ولید نے کتاب پٹخی اور سر جھٹک کر زہریلا جملہ اچھالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

''امی! دو ہزار اور دے دیں نا!''

ولید پچھلے آدھے گھنٹے سے باورچی خانے میں گھسا کسی ''ضدی بچے'' کی طرح ماں کے گرد منڈلا رہا تھا۔ امین صاحب کے لیے الگ سے پرہیزی کھانے کی ہنڈیا بناتی بلقیس مختلف طریقوں سے اسے ٹال رہی تھیں۔

''ولید! نہیں ہیں میرے پاس پیسے..... سمجھتے کیوں نہیں ہو تم.....!'' کتنی بار شفقت سے کہنے کے بعد اب بلقیس چڑنے لگی تھیں۔

''آخر پیسے کس لیے چاہئیں۔'' آنچ دھیمی کرتے ہوئے انہوں نے ولید پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ ولید پہلے بھی ان سے پندرہ سو لے چکا تھا۔ آج پھر پیسوں کا مطالبہ لے کر پہنچ گیا تھا۔

اسی دوران ندا کسی کام سے کچن میں آئی تو ولید یوں بے نیاز سا بن کر سبزی کی ٹوکری میں سے گھیرا نکال کر کھانے لگا کہ جیسے میں تو بس یونہی کچن میں آیا ہوں۔ اصل میں وہ نہیں چاہتا تھا کہ پیسوں والی بات ندا تک پہنچے اور ندا سے امین صاحب تک۔ ویسے تو وہ ندا کا بھی ''پیارا'' بھائی تھا مگر جب دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑتا تو ندا بھی انتقامی کارروائی پر اتر آتی تھی کیونکہ اکثر زیادتی ولید کی طرف سے ہی ہوتی تھی۔ ایسے میں ندا بہت سے اس کے راز باپ کے حوالے کر دیا کرتی تھی۔ پھر جو اس کی درگت بنتی تو خوب مزہ لیتی۔

ندا نے مشکوک نگاہوں سے اسے گھورا اور پھر کچن سے باہر نکل گئی۔ مگر اس کے نکلتے ہی ولید کی پراسرار سی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ندا نے کان لگا کر سنا تو اس کھسر پھسر کی اصل وجہ بڑی اچھی طرح سے سمجھ میں آ گئی۔

''امی..... کالج والے ٹرپ پر لے جا رہے ہیں مری..... مجھے اس کے لیے پانچ ہزار چاہئیں!'' ولید نے کھل کر ماں کے سامنے اصل قصہ رکھا تو تحیر سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''پانچ ہزار .....!'' انہوں نے یوں یہ لفظ دہرائے کہ جیسے ولید نے پانچ ہزار نہیں بلکہ، پانچ لاکھ مانگ لیے ہوں۔

''اتنی بڑی رقم!'' وہ ابھی تک حیرتوں میں ڈوبی تھیں۔

''ہر بار تو ٹرپ پہ جاتے ہیں آپ ولید بھائی۔ اس بار نہیں جائیں گے تو کون سے عظیم کارنامے سے رہ جائیں گے!'' ندا باورچی خانے میں دوبارہ آئی تو لقمہ دینا نہ بھولی۔

''تم سے مشورہ مانگا ہے؟'' انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے ولید کا انداز خاصا جارحانہ سا تھا۔

''امی! بہت بگاڑ رہی ہیں آپ ولید بھائی کو!'' ندا نے قدرے تحصیلی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ ندا کو اپنے ٹرپ کا شکوہ یاد آ گیا تھا۔ پچھلے دنوں اس نے ''کلر کہار'' جانے کے لیے ماں سے پانچ سو مانگے تھے اور انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ ان کے پاس بے کار کے پیسے نہیں، پھر کسی اگلے موقع پہ چلی جانا..... جس پر اس نے خوب احتجاج کیا تھا..... بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ رونا دھونا بھی مچایا تھا مگر اس کی ایک نہ چلی تھی بلکہ دونوں بڑی بہنوں نے اسے سمجھا بجھا کر چپ کر دیا تھا کہ.....

''اچھی بچیاں بڑوں کی بات مانتی ہیں۔ سو خود کو اچھی فرماں بردار بیٹی اور بہن ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے ''ٹرپ کے ارمان'' کا گلا گھونٹ دیا اور کسی سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ مگر آج ولید کو ٹرپ کے لیے پیسے مانگتے دیکھا تو دل میں جلن سی اٹھی تھی۔

''میڈم.....! اس لیے کہ میں اکلوتا ہوں، چہیتا ہوں۔ لاڈلا ہوں اور آپ!'' ایک تمسخرانہ نظر ندا پر ڈالتے ہوئے ولید نے جملہ ادھورا چھوڑ کر احساس دلایا کہ محترمہ نہ تو آپ اکلوتی ہونے کے منصب پہ فائز ہیں۔ نہ ہی چہیتی ہونے کے عہدے پہ اور نہ ہی لاڈلی کے کیونکہ آپ سے پہلے تو دو عدد بہنیں موجود ہیں۔ اس لیے خوامخواہ لاڈلوں کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ہمیشہ یونہی منہ کی کھاؤ گی۔ دوسرے لفظوں میں ولید نے جتا دیا تھا کہ ''ہم سا ہو تو سامنے آئے''

''میں ابو کو بتاؤں گی' دیکھنا۔'' دھمکی دیتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

اس دھمکی کا ولید پہ تو کوئی اثر نہیں ہوا تھا البتہ بلقیس اندر ہی اندر ڈر گئیں۔ ندا اکثر ہی ولید کی شکایتیں لگا کر امین صاحب کے ہاتھوں اس کی درگت بنوایا کرتی تھی۔

''ولید.....! تمہارے ابو کو پتا چل گیا تو غضب ہو جائے گا!'' دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ان کے قدموں کا رخ اب کمرے کی طرف تھا۔ یعنی ''لاڈلے'' کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

''نہیں پتا چلے گا امی..... فکر ناٹ!'' دو تین موٹی پکی ہوئی خوبانیاں پھلوں کی ٹوکری سے اٹھاتے ہوئے وہ بھی ''دم'' بنا پیچھے پیچھے ماں کے کمرے میں آ گیا تھا۔

''آپ نہیں بتائیں گی تو نہیں پتا چلے گا.....!'' ایک خوبانی منہ میں ڈالنے کے بعد اب وہ دوسری ''ادھیڑنے'' لگا تھا۔ ولید کو اپنی ماں سمیت سب خواتین سے شکوہ رہتا تھا کہ ہر بات ''مجازی خدا'' کو بتائے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ پانی پینے کی خبر بھی شوہر نامدار کو ضرور دیتی ہے۔

''جب بال بچوں والے ہو گے نا پھر تمہیں پتا چلے گا کہ گھر کے سربراہ کو ہر بات بتانے سے نہیں پتا چلتی..... بہت سی باتیں تجربے کی روشنی میں خود ہی معلوم ہو جاتی ہیں.....!'' کپڑوں کی الماری میں سب سے آخری تہہ کو ہٹاتے ہوئے بلقیس نے پیسوں والی زنبیل نکالی..... جس میں وہ پیسے جمع کیا کرتی تھیں۔ بلقیس نہایت کفایت شعار اور سلیقہ مند عورت تھیں۔ جانتی تھیں کہ کل کو تین تین بیٹیوں کو رخصت کرنا ہے' آج جو جمع کریں گے کل کچھ کام آ جائے گا۔

''بال بچے.....!'' آخری خوبانی کھاتے ہوئے ولید نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ابھی تو یہ مرحلے بڑی دور ہیں امی.....ابھی تو میں خود بچہ ہوں'' خوبانیاں کھا کر ان کی گٹھلیاں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔

''کتنے چاہئیں؟'' بلقیس نے پوچھا۔

''جتنے ہیں سارے نکال دیں امی!'' اس نے شرارت سے کہا اور خود ہی اپنی بات کا مزہ لیا تھا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا.....!'' انہوں نے غصے سے گھورا۔

''ایک روپیہ بھی زیادہ نہیں ملے گا.....!'' ہزار اور پانچ سو کا نوٹ نکال کر بلقیس نے دوبارہ زنبیل کو بند کیا اور الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔

''چلیں یہی بہت ہیں!'' سرعت سے اچکتے ہوئے وہ پیسے اپنے والٹ میں ڈالنے میں مگن تھا کہ ایک دم امین صاحب کی آواز پر دونوں ماں بیٹا چونک گئے۔ بلقیس کا تو یوں رنگ فق ہوا کہ جیسے، ان کی چوری پکڑی گئی۔

''کالج ٹرپ پر جا رہے ہو؟''

''جی ابو.....!'' گھبراہٹ کے مارے والٹ فرش پہ گرا تو اس نے تیزی سے اٹھاتے ہوئے جواب دیا دل میں شکر کیا کہ والٹ کی زپ بند تھی ورنہ ساری رقم جو اس نے گھر والوں سے ''چندہ'' مانگ کر جمع کی تھی اس کا پول کھل جاتا۔

''کتنے پیسے دیے ہیں اپنے لاڈلے کو.....!''

ماں بیٹا دونوں کمرے میں کھڑے تھے اور کھڑے بھی بالکل ''زنبیل'' والی الماری کے پاس تھے اس لیے گھر کا سربراہ بتائے بغیر بھی جان گیا تھا کہ یہاں پیسے کا معاملہ چل رہا تھا۔

''ابو.....بس ہزار روپے.....!'' والٹ پینٹ کی جیب میں ٹھونستے ہوئے ولید تیزی سے بولا تھا.....اسے فکر لاحق تھی کہ کہیں اس کے والٹ کی تلاشی نہ شروع ہو جائے اور وہ بھی ''گن پوائنٹ'' پہ تو پھر مارے گئے۔ اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد ان کی نظروں کے سامنے سے ہٹ جائے۔

''تم سے نہیں:.....تمہاری ماں سے پوچھا ہے.....!''۔ عینک اتار کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں خوبانیوں کی گٹھلیاں آرام فرما رہی تھیں۔ ان کے چہرے پہ برہمی آ گئی جانتے تھے کہ اتنی نازیبا حرکت کس کی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ خوامخواہ نگاہ ولید پر ڈالتے۔ اس نے جلدی سے لپک کر وہ اٹھا لیں۔

''سوری ابو.....!'' اس وقت تو فرماں برداری اور شرافت آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ ارادہ تو یہی تھا کہ جلدی سے رفو چکر ہو جائے مگر۔

''کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟'' وہ کرخت لہجے میں دوبارہ بلقیس سے مخاطب ہوئے تو بلقیس لرز اٹھیں۔

''پندرہ سو.....!'' لفظوں میں گھبراہٹ کی آمیزش تھی۔

''کیوں کس خوشی میں.....!'' اب توپ کا رخ لاڈلے کی طرف تھا۔

''ابو.....آج کل ہزار میں کیا بنتا ہے..... سارے دوست دس دس ہزار لے کر آ رہے ہیں اور میں!'' اس کا موڈ پھر سے خراب ہونے لگا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ان کا یوں ناپ تول والا انداز سخت چڑاتا تھا اس کے مطابق یہ ''کنجوسی کے زمرے میں آتا تھا۔

''سیر سپاٹوں کے لیے تمہارے پاس وقت ہے مگر مجال ہے جو گھڑی دو گھڑی کے لیے باپ کا احساس کر کے دکان پر بیٹھ جاؤ!''

امین صاحب کو بھی اکلوتے سپوت سے یہی شکوہ تھا جسے وہ ہر معاملے میں ضرور گھسیٹ لاتے تھے۔ یہ شکوہ ان کے چہرے پر دکھ کی لکیریں بنا دیتا تھا کہ ایک ہی بیٹا منتوں مرادوں سے مانگا اور وہ بھی اس قدر بے فیض، ناکارہ، بے حس اس عمر میں بیماری میں، سردی گرمی غرض کہ انہیں ہی اپنی بوڑھی ہڈیاں گھسیٹتے ہوئے دکان پر جانا پڑتا تھا۔

''پھر ان کے ہاں حرام کی کمائی آتی ہوگی۔ میرے پاس حرام کے پیسے نہیں ہیں اجاڑنے کے لیے.....!'' تیور بتا رہے تھے کہ اگلا مرحلہ والٹ کی

تلاشی کا ہوگا۔اور اگر والٹ کی تلاشی ہوئی تو بہت سے راز کھل جانے تھے۔ٹرپ تو کینسل ہونا تھا عالیہ اور شافیعہ کی بھی شامت آجاتی جنہوں نے دل کھول کر اپنے "لاڈلے" کے لیے "شاہ خرچی" کی تھی۔

ولید کو ندا پر سخت غصہ آرہا تھا دل تو چاہ رہا تھا کہ سامنے آئے تو دو چھٹرکس کراس کے ناریل جیسے سر پر لگائے۔کہ جس نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

"لاؤ......اپنا والٹ دکھاؤ......!" یہ الفاظ امین صاحب کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ولید نے امداد طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔وہ پھانسی پر تو لٹک سکتا تھا مگر والٹ کی تلاشی نامنظور۔

"وہ......ابو......!" وہ ہکلایا۔

"والٹ نکالو......!" اس بار امین صاحب نے بولے بغیر ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا تھا۔وہ بھی باپ تھے' بیٹے کی رمزیں جانتے تھے۔واقف تھے کہ اولاد کیسے ماں باپ کے ساتھ داؤ پیچ کھیلتی ہے۔اور جب بات "لاڈلے" کی ہو تو پھر تو ہر ضد ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔

"رہنے دیں نا......یہی تو عمر ہوتی ہے سیر و تفریح کی۔آپ تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں!"

بلقیس نے حمایت کی تو ولید کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔یہاں اس کی سانس چلی اور وہاں امین صاحب کی تقریر کا آغاز ہوگیا۔آج کا موضوع تھا۔

"باپ اور بہنوں کی کمائی کو بے حسی سے اڑانا۔" پورے بیس منٹ کی تقریر تھی اور ہر جملے کے آخر میں یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ۔

"جب خود کماؤ گے نا پھر پتا چلے گا۔آٹے دال کا بھاؤ......!" ساتھ ہی ساتھ بلقیس کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا۔

"بے حس بنا رہی ہو اسے......اس کی ہر ناجائز خواہش پوری کر کے......!"

دونوں سر جھکائے یہ تقریر سننے پر مجبور تھے۔ جبکہ "لاڈلا" دل ہی دل میں خوش تھا کہ والٹ کی تلاشی سے بچ گیا تھا۔تقریر کا کیا ہے اس کان سے سنوں گا اور دوسرے کان سے نکال دوں گا۔

"اگر اس بار ٹرپ پر نہیں جاؤ گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

امین صاحب کی پوری توجہ اسی بات کی طرف تھی کہ بیٹے کو اس کے اکلوتے ہونے کا احساس دلائیں۔اسے یہ بتائیں کہ وہ ماں باپ اور بہنوں کا سہارا ہے۔اس کی پہلی ترجیح تعلیم اور دوسری اس کے گھر والے ہونے چاہئیں۔مگر "جوانی کے گھوڑے" پر سوار ولید ابھی کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔احساس کس چڑیا کا نام ہے' وہ ابھی اس سے ناواقف تھا۔ البتہ اس نے یہ چڑیا بہت بار دیکھی تھی۔ہر روز اس کے گھر کی منڈیر پر آکر بیٹھا کرتی تھی۔ خوش رنگ' سنہرے پروں والی چڑیا۔ جو آنکھوں کو بھلی لگتی تھی اور دل کو خوش گوار احساس دیتی تھی۔مگر صرف دیکھنے کی حد تک۔

"سمجھ جائے گا نا......ابھی لاڈ پیار میں ایسا کرتا ہے!"

بلقیس تو جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی تھیں ۔ دل ترازو بن کر رہ گیا تھا۔ایک پلڑے میں وفا شعار، خدمت گزار بیوی کا دل تھا۔ جس کے مطابق امین صاحب کا لفظ لفظ درست تھا۔ انہیں اس عمر میں اکلوتے بیٹے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ اگر ڈانٹتے تھے تو درست تھے۔ اگر نازک معاملات کی طرف توجہ دلاتے تھے تو اس کی تربیت کے لیے......اس حوالے سے بلقیس کو اپنے مجازی خدا سے کوئی اختلاف نہ تھا۔

دوسرے پلڑے میں ماں کا دل تھا۔جو اپنی ممتا سے مجبور ہو کر اپنے لاڈلے کی غلط حمایت بھی کر جایا کرتی تھیں۔ امین صاحب کی ڈانٹ بھی سنا کرتی تھیں۔وہ ہر بات سہہ جاتی تھیں کیونکہ وہ ماں تھیں۔ اور ہر ماں کی طرح اپنے لخت جگر کی محبت سے مجبور تھیں۔

"لاڈلا نہیں......انوکھا لاڈلا ہے......!" امین صاحب نے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے طنزیہ

انداز میں کہا تو ''لاڈلا'' سرتاپا سلگ کر رہ گیا۔ ابھی وہ اپنے دفاع میں کچھ بولتا کہ امین صاحب نے دوسرا طنز کا تیر برسایا۔

''اس عمر میں یہ جو نواب زادے کی عمر ہے نا.....!'' امین صاحب کا اشارہ ولید کی جوانی کی طرف تھا۔

''اس عمر میں لڑکے تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں۔ اپنی فیس اور دیگر خرچے خود پورے کرتے ہیں اور ایک یہ ہے!' امین صاحب کا لفظ لفظ زہر آلود تھا۔

ولید کا دل تو چاہ رہا تھا کہ والٹ میں سے سارے پیسے نکال کر باپ کے ہاتھ پہ رکھ دے کہ نہیں جاتا میں ٹرپ پر..... آپ خوش ہو جائیں مگر جانتا تھا اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سارا ٹرپ بھی برباد ہو جائے گا اور ابو کی خوشنودی پھر بھی حاصل نہیں ہوگی۔

☆☆☆

بھوربن (مری) کی حسین وادی برف سے ڈھکی اپنی دل فریبیوں اور رعنائیوں سے ہر آنکھ کو خیرہ کر رہی تھی..... یہیں ولید کے چشم تصور میں رہنے والا حسین چہرہ وادی کی سحر انگیزیوں میں اضافہ کر گیا تھا۔

وہی چاند سا چہرہ..... جو مسکراتا تھا تو لگتا کہ جیسے چاند مسکرا رہا ہو..... وہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ لمحہ بھر کے لیے تو نظریں بے یقین سی ہوئیں شاید یہ خواب ہے مگر دل نے کہا' یہ حقیقت ہے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے اس حسن بے مثال کو دیکھ رہا تھا۔

گورنمنٹ گرلز کالج کا ٹرپ بھی بھوربن آیا تھا۔ اور اسی ہوٹل میں مقیم تھا جہاں بوائز تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ فرسٹ فلور پہ تھے اور گرلز سیکنڈ فلور پہ۔

اس انکشاف نے جہاں دل کو خوشی بخشی تھی کہ وہ لڑکی بھی یہاں موجود ہے۔ وہیں دل کو یہ اطمینان بھی نصیب ہوا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح اسٹوڈنٹ ہے۔ ورنہ اس رات اسے بائیک پہ ایک لڑکے کے ساتھ دیکھ کر تو دل اندیشوں میں گھر گیا تھا کہ شاید وہ اس کا شوہر تھا۔ اس سے آگے مزید وہ کچھ نہ سوچ پایا.....

ولید نے اس پری چہرہ کو پہلی مرتبہ بس اسٹاپ پر دیکھا تھا۔ پھر اس سرمئی شام کتب فروش کے اسٹال پر..... اور آج بھوربن کی برف پوش حسین وادی میں، نہ جانے وہ کیوں اسے اپنی اپنی سی لگتی تھی۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر مبہوت ہو جایا کرتا تھا۔ گرد و پیش سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ٹی پنک کڑھائی والی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور شانوں پہ سیاہ شال ڈالے وہ پری لگ رہی تھی۔

''حورین..... ادھر آؤ.....!''

کسی کے پکارنے پر ولید کو معلوم ہوا کہ اس کا اسم ''حورین'' تھا جو ''یاسمین'' تھا۔ بالکل صحیح نام دیا تھا اس کے گھر والوں نے..... وہ تھی ہی اتنی خوب صورت..... بڑی بڑی روشن آنکھوں والی حور۔

وہ لڑکیاں شاید گروپ فوٹو اتارنے لگی تھیں۔ ولید کا دماغ ان موقعوں پہ ہمیشہ ایکٹو رہتا تھا..... موقع اچھا تھا اس حسینہ کی تصویر لینے کا..... اس نے جلدی سے اپنے دوست کا کیمرہ پکڑا جہاں لڑکیوں کے کیمرے کا فلش آن ہوا' ساتھ ہی کمال مہارت سے ولید نے بھی کارروائی کر ڈالی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے مسٹر.....!'' ولید سمجھ رہا تھا کہ شاید دونوں کیمروں کی فلش لائٹس مکس ہو کر یہ پتا نہیں چلے گا کہ ایک اور کیمرہ ان کی تصویر لے رہا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

''بدتمیزی.....!'' وہ جو اپنے کارنامے کی کامیابی پر اپنے دھیان میں مگن تھا' اس اچانک افتاد پر اول گھبرایا مگر پھر سنبھل گیا۔

''یہ تصویر کیوں اتاری ہے؟ سیدھے طریقے سے واپس کرو ہماری تصویر!''

پانچ چھ لڑکیوں کے گروپ نے اس پر دھاوا بول دیا جن میں وہ ''لڑکی'' شاید ''لیڈر'' تھی۔

''کون سی تصویر.....؟ کیسی تصویر؟ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہے آپ لوگوں کو.....!'' اپنی چوری چھپانے کے لیے دوسرے پر ہی الٹ پڑنا ولید کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایک منٹ میں یوں پینترا بدلتا تھا کہ

مقابل ہی شکست کھاتا تھا۔

''بائی گاڈ..... میں نے خود اس ''لوفر'' کو تصویر اتارتے دیکھا ہے!'' حورین اپنے گروپ میں سب سے آگے کھڑی ولید پر ''فرد جرم'' عائد کرنے پر۔

آخر ولید ہی فاتح ٹھہرا۔ جس نے نہ تو یہ اعتراف کیا تھا کہ اس نے چوری چھپے تصویر اتاری تھی..... اور نہ ہی تصویر واپس کرنے کی طرف آیا تھا۔ ویسے بھی وہ کیوں تصویر واپس کرتا اس نے اتاری ہی اس لیے تھی کہ اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔

یہ بھوربن میں ان دونوں کا پہلا ''معرکہ'' تھا اس کے بعد تو معرکوں کا جیسے سلسلہ ہی چل پڑا تھا۔ اتفاق سے جہاں لڑکیوں کی بس جاتی لڑکوں کی بس بھی وہیں قیام کرتی تھی۔ کالج الگ الگ مگر کالج مینجمنٹ کا پلان ایک جیسا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا پھر حسن اتفاق ..... ولید جہاں بھی جاتا وہ ''پری چہرہ'' اس کے سامنے ہوتی..... نظریں ملتیں تو ہمیشہ کی طرح اس کی نظروں میں ناگواری ہوتی اور ولید کی نظروں سے مسکراہٹ جھلکتی۔

مری مال روڈ کا شاپنگ سینٹر ہو یا ..... پنڈی پوائنٹ کی چیئر لفٹس ..... نتھیا گلی ہو یا پھر برف میں چھپے ایوبیہ کے بل کھاتے راستے۔ وہ دونوں ہر جگہ ٹکرا جاتے۔ اس ٹور میں حورین کی موجودگی نے ولید کی خوشی دوبالا کر دی تھی۔ شوخی طبع تو پہلے ہی وافر مقدار میں تھی حورین کو دیکھ کر تو ڈبل ہو جاتی۔

''بدتمیز..... جنگلی!'' حورین جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف باری کا مزہ لیتے ہوئے برف کے ننھے منے گولے اچھال رہی تھی' یہ شوخی و شرارت دیکھ کر ولید مسکرا اٹھا تھا۔ ایک دو اکٹھے بڑے بڑے برف کے گولے حورین کے سر اور منہ پر لگے تو حورین نے غصے سے حملہ آور کی طرف دیکھا جس کا پیدائشی نام تو ولید تھا مگر اس کی جنگلی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے حورین نے اس کے کئی ''نک نیم'' رکھ دیے تھے۔

سرفہرست..... ''لوفر، بدتمیز، جنگلی.....''

وہ جہاں بھی نظر آتا تو اس کے گلابی لبوں کی ہلکی سی جنبش یہ اشارہ دیتی کہ اس نے ولید کو انہی ناموں سے پکارا ہوگا..... جبکہ ولید کا یہ حال تھا کہ دایاں ہاتھ سینے پہ رکھے گردن کو تھوڑا خم دے کر یوں مسکرایا کہ.....

''اے حور..... جس نام سے بھی پکارو قبول ہے.....!''

پنڈی پوائنٹ پہ سب لڑکیاں دو دو کا جوڑا بنا کر سوار ہو چکی تھیں۔ سوائے حورین کے' وہ ذرا دیر سے پہنچی تھی' اس لیے پیچھے رہ گئی۔ اس کے گلاب چہرے پر اداسی چھانے لگی تھی۔ اس کا جوڑی دار کوئی نہیں تھا۔ گرے قمیص کے ساتھ سفید شلوار..... سیاہ شال میں خود کو لپیٹے، سر پر گرے رنگ کی اونی ٹوپی جس کے سامنے کی طرف موٹا سا کڑھا ہوا ''سرخ گلاب'' تھا۔ سڑک کے دوسری جانب لڑکوں کا گروپ حورین کی طرف ہی متوجہ تھا' اسے اکیلا دیکھ کر تو وہ باقاعدہ سیٹیاں اور تالیاں بجا کر اسے اپنی راغب کرنے لگا۔ حورین کے چہرے پر ناگواری کے بادل چھا گئے۔ اتفاق سے ولید بھی وہیں تھا۔

''ہم حاضر ہیں.....!'' ایک آوارہ چھچھورے نے آواز لگائی۔

''چیئر لفٹ میں جوڑی دار بننے کے لیے۔'' ان لوفروں کی بے باکانہ آفر تھی۔

''حسن والوں سے اللہ بچائے.....!''

بھونڈی اور بے سری آوازوں میں گانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حورین نے ایک خوں خوار نگاہ ان پہ ڈالی۔ وہ لڑکے اب چھلیاں (بھٹے) کھانے کے بعد خالی چھلیاں شرارت سے حورین کی جانب پھینکتے ہوئے مزید بدتمیزی پر اتر آئے تھے۔ حورین کو اب خوف محسوس ہونے لگا۔

''اپنی حد میں رہو.....!'' ولید اس سے زیادہ برداشت نہ کر پایا تو غصیلے انداز میں ان پر چلایا تھا جو ابھی بھی حورین کی طرف خالی چھلیاں پھینک کر اس کے خوف کا مزہ لے رہے تھے۔

''what's your problem ?''

ان میں سے ایک جو بدتمیزی اور بدتہذیبی میں شاید ان سب کا باپ تھا اسے ولید کی انٹری بالکل اچھی نہ لگی تو غصے سے ادھ کھائی چھلی ایک طرف پھینکتے ہوئے ولید کی جانب بڑھا۔

''کیا بولا تھا تو.....!'' دایاں ہاتھ ولید کے سینے پہ مارتے ہوئے اس نے زوردار جھٹکا دیا کہ ولید اگر سنبھلتا نہ تو دور جا گرتا۔

''کیوں ستا رہے ہو اسے؟'' بغیر ڈرے سہمے ولید نے اپنی پرابلم بتادی تھی۔

''تمہارے پیٹ میں کیوں درد اٹھ رہا ہے؟''

چھلی کے بچے کچے دانے شاید ابھی اس کے منہ میں تھے جنہیں بدتمیزی سے چباتے ہوئے وہ سچ مچ کا لنگور لگ رہا تھا۔ حورین اس ساری صورت حال پر مزید گھبرا اٹھی۔

''شرم حیا نہیں تم لوگوں میں..... ایک اکیلی لڑکی کو.....!'' اس سے پہلے ولید اپنا فقرہ مکمل کرتا..... ایک زور دار ''پنچ'' اس لنگور نے مارتے ہوئے لڑائی کا آغاز کردیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی لنگور بھی اپنے سردار کی مدد کو آگئے تھے۔ ولید تنہا اور وہ دس بارہ تھے۔ دھواں دھار لڑائی۔ ولید تنہا ہمت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے سو غالب آگئے۔

مگر اس جھگڑے کے بعد حورین پہ ثابت ہوگیا تھا کہ ولید نہ تو لوفر تھا۔ نہ جنگلی اور نہ ہی آوارہ تھا۔ وہ ان امیرزادوں کی طرح راہ چلتی لڑکیوں کو ستانے والا شریر نوجوان نہ تھا۔ ولید کو بہت چوٹیں آئیں۔ حورین نے ہمدردی، اپنائیت اور توجہ کا مرہم رکھ کر اجنبی نوجوان سے بھوربن کی دلفریب وادی میں دوستی کا آغاز کردیا تھا۔ جب دونوں کی واپسی ہوئی تو رابطہ کے لیے ایک دوسرے کے نمبروں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ایک خوش گوار سا احساس لیے وہ اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن ہوگئے۔

☆☆☆

گیراج میں کھڑی چمچماتی ''اپلائیڈ فار'' کا کارڈ لگی نیو ماڈل کی بائیک دیکھ کر امین صاحب کے قدم ٹھٹھک گئے۔ وہ جو آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے اس کا جائزہ لے رہے تھے کہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اس ''سواری'' کا ''سوار'' آتا ہوا نظر آیا۔ چہرے کی سرخی اندرونی جوش وخروش کی غماز بنی تھی۔

بائیک کی چابی انگلی پہ گھماتے ہوئے وہ اپنے دھیان میں آرہا تھا کہ امین صاحب کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا .....وہ یوں کسی انکوائری آفیسر کی طرح بائیک کی چیکنگ کر رہے تھے کہ یا تو یہ ''چوری'' کی ہے یا پھر کسی دوست کی لے کر آیا ہے۔

''کس کی ہے یہ؟'' ان کے گھر کے گیراج میں کھڑی تھی۔ سوال پوچھنا ان پر فرض تھا۔

''وہ ابو.....وہ!'' وہ شاید ذہنی طور پر تیار نہ تھا کہ اچانک اس سوال پر بری طرح سے گڑبڑا یا تھا..... ابھی امین صاحب اسے اور اس کی چمچماتی بائیک دیکھ رہے تھے اور وہ کھسیانا ہوتے ہوئے زبان سے خشک ہونٹوں کو تر کر رہا تھا کہ اندر سے شافیعہ تیار ہو کر باہر نکلی قدموں کی تیزی بتا رہی تھی کہ وہ شاید کہیں جا رہی ہے۔

''کچھ پوچھا ہے تم سے.....!'' وہ کسی سخت گیر انکوائری آفیسر کی طرح کھڑے تھے کہ کوئی انہیں ''چکر'' دے کر نکل جائے یہ ناممکن تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ولید کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''ابو یہ ولید کی نئی بائیک ہے!'' ہمیشہ کی طرح شافیعہ ڈھال بنی اپنے لاڈلے کے سامنے آگئی۔

''ولید کی.....!'' امین صاحب کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔

وہ شخص جو اس گھر کا کفیل تھا۔ گھر کی ذمے داریوں میں پھنسا کبھی اپنے لیے نئی تو درکنار سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بھی خرید نہ پایا تھا۔ ہاں ایک سائیکل کو انہوں نے کافی عرصے تک استعمال کیا مگر اب اس عمر میں سائیکل چلانا مشکل ہوئی تو انہوں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ گھر کی دیگر ضروریات جن میں بل، سودا سلف، ندا اور ولید کی

فیس اور دیگر علاج معالجے کو نظر انداز کر کے اپنے لیے بائیک خرید لیتے۔ بہت دفعہ سوچا ارادہ بھی باندھا۔ دوستوں نے بھی قسطوں پر لینے کے مشورے دیے مگر نہ لے پائے۔

ایسا نہیں تھا کہ ضرورت نہیں تھی۔ بس گنجائش نہ نکال پائے۔ ایک کمانے والا شخص بائیک خریدنے کی گنجائش نہ نکال پایا تو پھر ولید تو ابھی ایک روپیہ کمانے کے قابل نہ ہوا تھا۔ اس نے اتنی مہنگی بائیک کیسے خرید لی۔ امین صاحب کی استفہامیہ نگاہیں ولید اور شافیعہ پہ گڑی تھیں۔

''ابو! میں نے خرید کر دی ہے!'' شافیعہ کچھ جھجک کر بولی تھی۔

''تم نے.....؟''

''جی ابو..... کمیٹی کے پیسوں سے!'' شافیعہ اسکول میں جاب کرتی تھی اس کی تنخواہ معقول تھی۔ امین صاحب کے علاوہ اگر کوئی گھر کا دوسرا کفیل تھا تو وہ شافیعہ تھی۔ امین صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ''یہ میری بیٹی نہیں بیٹا ہے!''

وہ اپنی تنخواہ گھر کی ضروریات کے علاوہ جو بچت ہوتی ''کمیٹی'' میں ڈال دیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ولید کو اچھی یونیورسٹی میں داخل کروانا ہے۔ ندا کو اچھی تعلیم دلوانی ہے عالیہ آپی کی رخصتی میں باپ کا سہارا بننا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اچھی خاصی رقم ماں کے ہاتھ پہ رکھا کرتی تھی' چھوٹی سی عمر میں وہ بہت سمجھ دار ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب تک ولید اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں ہو جاتا' وہ اس گھر کا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔

اسے اسکول کے دو کولیگ اور پرنسپل نے پرپوز بھی کیا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی اس کے اوپر بہت ذمے داریاں ہیں، ابھی وہ اپنے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ اس بات کا ذکر شافیعہ نے ماں سے کیا تو انہوں نے بھی شادی پہ اصرار کیا تھا کہ کل کو عمر نکل گئی تو کیا کرو گی۔ مگر شافیعہ کو باپ کی ذمہ داریوں کا احساس تھا اس لیے اس نے اپنی ذات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسے ذات باری تعالیٰ پر پورا بھروسہ تھا کہ جو اپنی ذات کو نظر انداز کر کے دوسروں کا سوچتا ہے تو وہ ذات اس شخص کی خوشیوں کو سنبھال کر رکھتا ہے اور وقت آنے پر بہترین انداز میں دے دیتا ہے۔

''ابو..... ولید اب یونیورسٹی میں آ گیا ہے۔ بے چارہ بسوں میں دھکے کھائے اور کرائے پر الگ پیسے برباد ہوں گے.....!''

ولید نے گریجویشن اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھی۔ شہر کی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ شافیعہ نے ہی اس کی فیس بھی ادا کی تھی۔ ولید کی فرمائش پر شافیعہ نے اسے بائیک لے کر دی۔ کیونکہ اس کے سب دوستوں کے پاس بائیک تھی۔

''پھر ابو..... ہمیں بھی سہولت ہو جائے گی۔'' شافیعہ کے مطابق اس سہولت میں کافی چیزیں شامل تھیں۔ ولید ابو کو دکان پر چھوڑ آئے گا، یونیورسٹی جاتے ہوئے اسے اسکول چھوڑ آیا کرے گا۔ بلقیس کو اکثر ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جانا پڑتا تھا اب ولید کے ساتھ یا آسانی چلی جائیں گی۔ مارکیٹ کے لیے تینوں بہنیں جو بسوں کے دھکے کھاتی تھیں۔ اس میں بھی آسانی ہو جائے گی۔ گھر کے سو کام ولید کر دیا کرے گا۔ دور ہونے کی وجہ سے اکثر وہ انکار کر دیتا تھا اب آسانی سے ہو جایا کریں گے۔

جوش سے بولتے ہوئے ''استانی جی'' نے لاڈلے کی حمایت میں ایک پورا مضمون تیار کر کے ابا جی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ولید کو اپنے دفاع میں کچھ کہنا ہی نہ پڑا تھا۔ امین صاحب نے ایک غیر مطمئن نگاہ دونوں پر ڈالی تھی کہ دونوں کا ہی جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

''ان سب کاموں کا تو مجھے پتا نہیں کہ یہ کتنی ذمہ داری سے کرے گا۔ ہاں البتہ دو کام میں راستے میں ہی دیکھ آیا ہوں جو اس بائیک کی وجہ سے سرانجام دیے جا رہے تھے.....!'' امین صاحب مزید کوئی وضاحت کیے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

شافیعہ کی سوالیہ نگاہیں ولید پر جم گئیں۔ امین صاحب جن دو کاموں کا ذکر کر کے گئے تھے ان میں ایک تو ''ون ویلنگ'' تھا اور دوسرا حورین کے ساتھ سیر و تفریح ...... دونوں کا ایڈمیشن ایک ہی یونیورسٹی میں ہو گیا تھا۔ واپسی پر دونوں کچھ وقت ساتھ گزارتے تھے۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھاتے تھے اور یہ بھی شافیعہ کی تنخواہ سے انجوائے منٹ کیا جاتا تھا۔ اب لاڈلا کیا بولتا اور کیسے اپنا پول کھولتا۔ سو چپ رہنے میں ہی عافیت تھی۔

☆☆☆

''کیوں کروں میں عالیہ آپی کی نند کے ساتھ منگنی ؟'' ولید کی چیختی چلاتی آواز میں حیرانی کا عنصر غالب تھا۔

عالیہ کا نکاح امین صاحب نے اپنے دوست کے بیٹے سے کروایا تھا جس کو ایک سال ہو گیا تھا۔ جب بھی رخصتی کی بات ہوتی تو ایک ''شرط'' اس بات میں رکاوٹ بنتی تھی۔ وہ شرط یہ تھی کہ عالیہ کی نند کو ولید پسند آ گیا تھا۔ جو ابھی سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

اس نے اپنی پسند کا اظہار گھر والوں کے سامنے کیا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا۔ مگر امین صاحب کی فیملی حیران ضرور ہوئی تھی۔ کیونکہ نند (علیزا) اور ولید ابھی دونوں زیر تعلیم تھے۔ ولید تو اپنے پیروں پہ بھی کھڑا نہیں ہوا تھا۔ امین صاحب نے اس مجبوری کا ذکر کیا تو علیزا نے خودکشی کی دھمکی دیتے ہوئے معاملے کو سنگینی کی طرف دھکیلا۔ اس جذباتی پن پہ تو بلقیس اور امین صاحب بھی گھبرا اٹھے۔ مگر پھر بھی تیار نہ ہوئے اور نہ ہی ولید کو مجبور کیا تھا۔ جب خودکشی کی دھمکی کارگر نہ ثابت ہوئی تو عالیہ کے سسرال والوں نے پینترا بدلا کہ بھلے دونوں بچے ابھی زیر تعلیم ہونے کی وجہ سے شادی کے قابل نہیں۔ اس لیے نکاح یا منگنی کر دی جائے۔ شادی تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد کی جائے گی۔ اس بات سے علیزا بھی مطمئن ہو جائے گی۔ مگر ولید نے اس فیصلے کو مسترد کر دیا تو دوسری طرف سے سنگین دھمکی دی گئی۔

''اگر ولید علیزا سے منگنی پہ تیار نہ ہوا تو عالیہ کی بھی طلاق یقینی ہو گی!''

اس دھمکی نے تو عالیہ سمیت سب گھر والوں کے پیروں تلے سے زمین سرکا دی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات اس سمت میں نکل جائیں گے۔ مگر ولید پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات سے سروکار نہ تھا۔ بہن کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ جائے گا۔ نہ ہی یہ فکر تھی کہ ماں باپ کے دل پہ کیا گزرے گی۔

''کچھ بھی ہو...... میں اپنی زندگی اس فضول سی ضد کی نذر نہیں کروں گا۔ اچھی زبردستی ہے کہ بہن کے بدلے میں بھائی قربانی دے......!'' ولید کی طرف سے صاف انکار پریشانی کو نیا رنگ دے گیا۔

''بیٹا ...... آخر علیزا میں برائی کیا ہے؟'' آخر ماں تھیں بیٹی کی فکر تھی۔

''میں پوچھتا ہوں کہ اس میں اچھائی کون سی ہے؟'' اپنا کیس تن تنہا لڑتے ہوئے ولید کی نگاہوں میں حورین کا چہرہ سما گیا تھا۔

اس ساری صورت حال کو لے کر ندا اور شافیعہ بھی پریشان تھیں۔ رہ گئی عالیہ تو وہ کمرے میں چھپی بیٹھی اپنے نصیب پہ ماتم کناں تھی۔ کیا خبر تھی کہ خوشیاں قریب آنے سے پہلے ہی دور چلی جائیں گی اور وہ ہی دست وداماں رہ جائے گی۔

''ولید بھائی...... آخر آپ نے کسی سے تو شادی کرنی ہی ہے تو علیزا سے ہی کر لیں۔ کم از کم سارے گھر والے اس عذاب سے تو نکل جائیں گے۔''

ندا، ولید کی خود غرضی پہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ پائی۔ ویسے بھی وہ کیسے خاموش رہتی۔ اس نے عالیہ کے آنسو دیکھے تھے۔ اس کا بجھا بجھا چہرہ ندا کو غمگین کر گیا تھا۔ خاموشی میں بھی اس کے دل کا خوف محسوس کیا تھا۔ سب سے آنسو چھپائے وہ خود سے ہی لڑتی جھگڑتی تھی۔ مگر کسی سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ وہ بہن تھی

اور یہ کیسے ممکن تھا ایک دوسرے کا درد محسوس نہ کریں۔ اور بہن بھی ایسی جس نے ہمیشہ چھوٹے بہن بھائی کو شفقت دی۔ ماں جیسا پیار دیا اور ولید میں تو اس کی جان تھی۔

"اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے ولید بھائی آپ۔" بولتے ہوئے ندا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ہوں میں کیوں بنوں قربانی کا بکرا......!" ندا کی بات تو اسے تمام حالات میں گوارا نہ تھی کہ وہ اس کے معاملات زندگی میں یوں دخل دے اور اوپر سے یہ قربانی کا فلسفہ......ولید ندا کی بات پہ قدرے جارحانہ انداز میں بولا تو پاس کھڑی شافیعہ لرز اٹھی۔ عالیہ کی وجہ سے وہ بھی غم زدہ تھی مگر دل کا کیا کرتی جو اپنے لاڈلے کی حمایت میں تھا۔

اس کے مطابق یہ ولید کے ساتھ زیادتی تھی کہ اسے جبراً کسی ایسے بندھن میں باندھ دیا جائے جس کے لیے اس کا دل راضی نہ ہو۔

"ندا! خاموش رہو تم......!" شافیعہ اپنا موقف کھل کر بیان نہ کر سکی تو ندا کو ڈپٹ دیا۔

"مگر آپی! یہ خود غرضی......!" ندا نے مزید احتجاج کرتے ہوئے الفاظ ترتیب دیے تھے کہ شافیعہ نے منہ پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ پریشانی ختم ہونے کے بجائے ولید اور ندا کے بحث و مباحثے سے اور بگڑ جائے۔ عالیہ جو کافی دیر سے کمرے میں تنہا بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ زیادہ دیر خود کو روک نہ پائی تو کمرے سے باہر آ گئی۔

"امی! ولید ٹھیک کہہ رہا ہے!" متورم آنکھیں اندرونی کرب کا پتا دے رہی تھیں۔

"میں بھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے میرے بھائی کی زندگی برباد ہو!" غم کو آنسوؤں کے ذریعے اپنے اندر اتارتے ہوئے وہ "لاڈلے" کی خوشیوں کی خود ہی حامی بنی ہوئی تھی۔

"میری وجہ سے کوئی اسے مجبور نہ کرے۔ جو میرے نصیب میں ہوگا مجھے مل جائے گا!" آنکھوں کی نمی ضبط کرتے ہوئے وہ نا صرف مسکرائی تھی بلکہ ولید کے گال پر محبت سے ہاتھ بھی پھیرا تھا۔

"سن لیا جب آپی کو کوئی مسئلہ نہیں تو آپ سب نے بے کار میں میری کنپٹی پر پستول رکھی ہوئی ہے۔" ولید نے ایک جتاتی نگاہ ندا کے سرخ چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا اور فاتحانہ انداز میں مسکرایا تھا کہ اتنی سی بات تھی اور خوامخواہ سب میرے پیچھے پڑے تھے۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ بے نیازی سے باہر کی جانب بڑھا تھا کہ امین صاحب کو سامنے کھڑے دیکھ کر وہ چونکا تھا۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور مغمومیت بتا رہی تھی کہ انہوں نے سب کی باتیں بھی سن لی تھیں اور ولید کا فیصلہ بھی۔

"آگے ہی بے چارے کے کندھوں پہ اتنے بوجھ ہیں۔ کیوں تم سب اس پر مزید بوجھ ڈال رہے ہو......!" انداز طنزیہ اور الفاظ زہریلے تھے کہ چند لمحوں پہلے جو عالیہ کی حمایت نے سکون بخشا تھا وہ غارت ہو گیا۔

"ابھی یہی وقت اس کی کسی بہن پہ آیا ہوتا تو بھائی پہ صدقے واری جانے میں لمحہ بھر کی دیر نہ لگاتی!" امین صاحب کی غضب ناک نگاہوں میں تاسف لہرایا تھا۔ ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ ولید علیزا سے منگنی کر لے تاکہ بہن کے دامن پہ طلاق کا دھبہ نہ لگے۔ مگر ولید معاملے کی سنگینی سے لاپروا تھا اس کے نزدیک اپنی زندگی اور اپنی خوشیاں عزیز تھیں۔ اس کی زندگی کی خوشیاں حورین سے وابستہ تھیں۔ وہ کسی صورت اپنی خوشیوں اور آرزوؤں کی قربانی دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ابو! یہ آپ سب کی زیادتی ہے!" ولید زیادہ دیر باپ کی لعنت ملامت سہہ نہ پایا۔

"آخر اس سارے معاملے میں میرا کیا قصور ہے۔ میں کیا کوئی چیز ہوں جو علیزا میڈم کو پسند آ گیا ہوں جو وہ چاہے گی ویسا ہی ہوگا!" ولید کو اصل میں علیزا کی ضد اور ہٹ دھرمی بھی غصہ دلا رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ زیادتی نہیں ظلم تھا۔

''دیکھ رہی ہو بلقیس اپنے جیتے کے تیور!'' بلقیس سر پکڑے بس آنسو ہی بہا سکتی تھیں۔ امین صاحب کی بات نے تو کلیجہ چیر ڈالا تھا۔

''لکھوا لو تم سب..... یہ اتنا بے فیض ہے کہ مرتے ہوئے منہ میں پانی نہ ڈالے!'' امین صاحب اکلوتے سپوت سے سخت مایوس ہو چلے تھے ہر انسان کو جو امیدیں اکلوتے بیٹے سے ہوتی ہیں ان حالات میں بری طرح سے ٹوٹ چکی تھیں۔

''جاؤ بھائی جاؤ..... اپنی خوشیاں سنبھالو، ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دو!'' دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مایوس انداز میں اسے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ عالیہ یہ منظر برداشت نہ کر سکی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شافیعہ اور ندا وہیں کھڑی باپ کی پریشانی دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔

''میری بیٹیاں ہیں۔ میں خود ہی ان کے مسائل دیکھ لوں گا۔ تمہارے احسان کی کوئی ضرورت نہیں.....!''

ولید جو سٹپٹاتے ہوئے اپنے موقف کی حمایت میں کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ شافیعہ نے منہ پہ انگلی رکھ کر نہ صرف خاموش رہنے کا کہا بلکہ بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی۔ وہ جانتی تھی ولید کے بولنے سے بات مزید خراب ہو سکتی ہے۔ امین صاحب سخت دکھی تھے۔ وہ بیٹا ہونے کے ناتے ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تو کم از کم الٹا سیدھا بول کر مزید دکھ تو نہ دے۔

ولید بھوت بنا شافیعہ کے ساتھ الجھنے لگا۔ وہ جو اسے آہستہ بات کرنے کا کہہ رہی تھی مگر جب ولید نہ مانا تو سر پکڑ کر رہ گئی۔

''شافیعہ بیٹا..... نہ سر ٹکراؤ اس پتھر سے یہ ہمیں سوائے زخم اور درد کے کچھ نہیں دے سکتا.....!'' امین صاحب ان دونوں کو دکھ سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

علیزا والے معاملے کی خبر حورین کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ جو ولید کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ اس محبت بھری کہانی میں علیزا کا وجود اسے پریشانی میں ڈال گیا تھا۔ مگر تمام صورت حال جاننے کے بعد اس کا بھی ولید کو یہی مشورہ تھا کہ وہ عالیہ آپی کے بارے میں سوچے۔

''ولید! میں سمجھوں گی کہ قدرت نے ہمارا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا!'' حورین نے کھلے دل سے یہ کہہ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ خود غرض فطرت کی لڑکی ہرگز نہیں تھی۔

''ولید! آپ کو اپنی بہن کے بارے میں سوچنا چاہیے۔'' حورین جانتی تھی اگر اس کی محبت کی وجہ سے ولید نے علیزا کو نہ اپنایا تو سارا نقصان عالیہ اٹھائے گی۔ ایسی صورت میں وہ دلہن بن کر ولید کے گھر میں چلی بھی جائے تو نہ اس گھر میں اس کی کوئی عزت ہوگی اور نہ ہی قدر سو بہتر یہی تھا کہ وہ اسے بھول جائے اور علیزا کو اپنا لے۔

''حورین! میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتا!'' یہ ولید کا آخری فیصلہ تھا کہ وہ کسی صورت علیزا سے شادی نہیں کرے گا۔ گو کہ ابھی اس نے گھر میں کسی سے بھی حورین کا ذکر نہیں کیا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ یہی وقت مناسب ہے۔ گھر والوں کو بتا دیا جائے کہ وہ صرف اور صرف حورین سے شادی کرے گا۔

عالیہ کے سسرال والوں کی طرف سے اصرار بڑھنے لگا تو بلقیس نے بیٹے کو منانے کی سعی کی۔

''امی! کوئی فائدہ نہیں..... میں آپ لوگوں کی خاطر علیزا کو اپنا بھی لوں تو خوش نہ رکھ پایا تب بھی عالیہ آپی کی زندگی مشکل ہوگی، وہ علیزا کو خوش نہ رکھنے کا بدلہ عالیہ آپی سے لیں گے پھر بتائیں ہم کیا کریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ رشتہ قبول ہی نہ کیا جائے..... اور ویسے بھی میں حورین کو پسند کرتا ہوں اور شادی بھی اسی سے کروں گا.....!''

اب سب کو ولید کے انکار کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ ولید، علیزا کو ناپسند کرتا ہے اسی لیے انکار کر رہا ہے۔ مگر اب حقیقت سامنے آئی تو سب حیران پریشان رہ گئے تھے سوائے امین

صاحب کے..... کیونکہ وہ اکثر ولید کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ چکے تھے اور یقیناً وہ لڑکی حورین ہی تھی۔

''سن لیے اپنے چہیتے اور انوکھے لاڈلے کے کارنامے، نہ پڑھائی مکمل کی، نہ جاب ملی مگر عشق و عاشقی کا چکر چلا لیا ہے نواب زادے نے۔'' امین صاحب کی گونج دار آواز ہر ایک کی سماعتوں کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ امین صاحب کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ سمجھ رہے ہیں ماں بہن اپنے لاڈلے کے کرتوت سے واقف ہیں۔

''اچھا تو یہ بات تھی ولید بھائی..... اس وجہ سے علیزا سے منگنی پہ انکار کر رہے تھے؟'' کٹیلے انداز میں بولتی ندا نے ماں بہنوں کا دفاع ضروری سمجھا تھا کہ وہ بھائی کے اس کارنامے سے لاعلم تھیں۔

''ندا! تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے معاملات میں زیادہ اماں بی بننے کی ضرورت نہیں۔ جب دیکھو میری ہر بات میں ٹانگ اڑاتی رہتی ہو.....!''

ولید جو پہلے ہی امین صاحب کے کڑوے کسیلے جملے سن کر جل بھن رہا تھا' ندا پر برس ہی پڑا۔ باپ کی موجودگی کی وجہ سے آواز تو دھیمی رکھی تھی مگر لہجے سے غصہ چھلک رہا تھا۔

''ہاں بیٹا! نہ بولو اس کے سامنے' یہ تو گھر کا سب سے بڑا ہے تم لوگ اسی سے تو مانگ کر کھاتے ہو!'' امین صاحب کا ٹھنڈے لہجے میں کیا گیا طنز ولید کا جگر چھلنی کر گیا۔ وہ اپنے آپ کو روک رہا تھا۔

''تم سب تو اس کی باندیاں ہو۔ سر جھکا کر ادب سے اس کے سامنے کھڑی رہا کرو.....!'' امین صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ولید اور حورین کے معاملے سے ماں بہن ناواقف تھیں اب توپوں کا رخ صرف اور صرف لاڈلے کی طرف تھا۔

''دوست تو اس نے زمانے بھر کے آوارہ پال رکھے تھے۔'' اب یقیناً امین صاحب حورین کے بارے میں سخت الفاظ کہنے والے تھے۔

''ابو..... حورین بہت شریف لڑکی ہے!''

ولید، حورین کے متعلق کوئی غلط بات نہیں سن سکتا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ امین صاحب گہری نگاہوں سے ولید کو دیکھ رہے تھے۔

''چلیں چھوڑیں اس بات کو..... جوان بچے سے الجھنے کا کیا فائدہ؟'' بلقیس باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

''بلقیس! دیکھ رہی ہو تم ابھی سے اس لڑکی کی خاطر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے!''

اب طعنوں کی زد میں حورین بھی آ گئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ گرل فرینڈ کے ساتھ صرف ٹائم پاس ہو رہا ہے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ برخوردار اس لڑکی کے معاملے میں اس قدر سنجیدہ ہو گئے ہیں۔

''ابو! آپس میں الجھنے کا کیا فائدہ ہے۔ ہونا تو وہی ہے جو میری قسمت میں لکھا ہو گا!''

عالیہ ابھی بھی معاملہ سلجھانا چاہ رہی تھی۔ اس کے شوہر نے تو اس سے بات بھی کرنا چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ دوسری طرف یہی اصرار تھا کہ ولید کو مناؤ۔

''میں صرف اپنی بہن کی خوشی دیکھنا چاہتا ہوں!'' یعنی دوسرے لفظوں میں جتا دیا گیا تھا کہ ولید مان گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہمارا رشتہ مزید چل نہیں سکے گا۔ ولید کے حوالے سے تو عالیہ کو خوب جلی کٹی سنائی جاتی تھی۔

''ویسے کتنا خود غرض اور بے حس ہے تمہارا بھائی۔ اگر یہی بات مجھ پر آتی تو اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے ایک پل کی دیر نہ لگاتا.....!'' عالیہ کے شوہر نے طنز کیا۔

''ابو! آپ لوگ میری وجہ سے جھگڑا نہ کریں۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں!'' عالیہ نے قسمت پر صبر کر لیا تھا۔

چند دنوں بعد ہی طلاق کے کاغذات نے اس رشتے کا خاتمہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

دسترخوان پہ کھانے کے برتن رکھتی شافیعہ بالکل خاموش تھی۔

''ابو! چاول کھائیں گے یا روٹی.....؟''

گم صم اپنی سوچوں میں کھوئے امین صاحب نے بے دلی سے روٹی کا کہہ تو دیا مگر چہرے پہ چھائی فکر وغم کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ نہ بھوک ہے اور نہ ہی کھانے کی چاہ۔

''آپی! میرے لیے چاول لے آئیں!'' ولید جو ابھی ابھی آیا تھا۔ بھوک سے بے تاب ہوا جا رہا تھا اپنا موبائل فون جو بالکل جدید ماڈل کا تھا۔ سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بائیک کی چابی بھی وہیں رکھ دی تھی۔ وہ بھوک کے معاملے میں بے حد کچا تھا۔

''ندا..... کھانا جلدی لے آؤ..... بہت ہی سست ہو تم!'' انتظار بے قراری میں تبدیل ہوا۔

''کیا ہو گیا ہے ولید بھائی۔ سب کو ہی بھوک لگی ہے مگر صبر سے انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کی تو بھوک بھی غیر انسانی قسم کی ہے!'' ندا سالن کا ڈونگا احتیاط سے رکھتے ہوئے چڑ کر بولی تھی۔

''اور بریانی.....؟'' سالن کے ڈونگے کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے ولید نے پوچھا۔

''شافیعہ آپی! جلدی سے لے آئیں بریانی۔ ورنہ آج ولید بھائی بھوک کے مارے ہم سب کو نہ کھا جائیں!''

ندا نے ناگوار گھوری ولید پر ڈالتے ہوئے با آواز بلند شافیعہ کو پکارا۔ اسے ولید کی اس عادت سے سخت چڑ تھی۔ دسترخوان پہ ایک منٹ بھی کھانا لگنے میں دیر ہو جاتی تو طوفان مچا دیتا تھا۔ بچپن کی یہ عادت وقت گزرنے کے ساتھ مزید پختہ ہو گئی تھی۔

یہ انسانی عادتیں ابتدا میں گیلی مٹی جیسی نرم ہوتی ہیں۔ جیسے چاہو موڑو جس شکل ڈھالو ڈھل جاتی ہیں۔ جس سانچے میں رکھو ویسی ہی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مگر جب ایک بار پختہ ہو جائیں تو لاکھ کوشش کر لو مشکل سے ہی بدلتی ہیں۔

''تمیز سے.....!'' آواز اتنی تھی کہ ندا کے کانوں تک ہی پہنچی تھی کیونکہ باپ کی موجودگی کا کچھ لحاظ اور شرم تو تھی۔

شافیعہ نے آتے ہی ندا کو ڈپٹ کر خاموش کروایا تھا۔ ندا اس بات پر اکثر احتجاج کرتی تھی کہ دونوں بڑی بہنیں ولید کے معاملے میں اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھیں۔ وہ شور مچاتی۔ رونا دھونا کرتی مگر جیت ہمیشہ ولید کی ہی ہوتی۔

''شافیعہ آپی..... مجھے تو لگتا ہے' ولید بھائی ہی آپ کے سگے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کو ''بلقیس کے جھولے'' (بلقیس ایدھی) سے ملی تھی!'' ندا منہ بسور کر کہتی تو شافیعہ ہنس پڑتی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ آج معمول سے زیادہ خاموشی تھی۔

''عالیہ کہاں ہے؟'' امین صاحب نے ابھی پہلا لقمہ ہی لیا تھا کہ ایک فرد کی غیر موجودگی چونکا گئی۔

''اس کے سر میں درد ہے۔ کہہ رہی ہے کہ اسے بھوک نہیں ہے!'' بلقیس نے بتایا۔

''رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ صبح بھی ناشتے پر نہیں تھی!'' امین صاحب فکرمندی سے بولے۔

''دوپہر کو کچھ کھایا تھا؟'' امین صاحب نے ولید کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے بلقیس اور دونوں بیٹیوں پہ نگاہ ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہیں ابو.....!'' ندا نے مغموم لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ..... ایسے کیسے چلے گا؟'' امین صاحب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ سب ہی پریشان ہو گئے سوائے ولید کے جو مزے سے بریانی کھا رہا تھا۔

''بلاؤ اسے.....!'' امین صاحب کا انداز حکمیہ تھا۔

''ابو میں نے دو تین بار پوچھا ہے اسے بھوک نہیں ہے آپ تو کھانا کھائیں!'' شافیعہ نے جلدی سے معاملہ سنبھالنے کی سعی کی۔

''کیا بات ہے تم لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟'' امین صاحب کے دل کو کسی انہونی کا احساس ہوا

تھا۔

''نہیں نہیں..... کوئی بات نہیں ہے آپ کھانا کھائیں!'' بلقیس نے جبراً مسکراتے ہوئے تسلی دینا چاہی مگر لرزتی آواز نے ساتھ نہ دیا۔

اس دوران ولید بالکل نارمل تھا۔ دو تین بار گھڑی میں ٹائم دیکھ چکا تھا یقیناً کھانے کے بعد دوستوں کے ساتھ ہلے گلے کا پروگرام تھا۔ اس نے آخری چمچ منہ میں ڈالا اور پانی کا گلاس منہ سے لگا کر غٹاغٹ پانی پی گیا۔ ایک طائرانہ نگاہ ماں اور بہنوں پہ ڈالی تو دل نے اشارہ دیا کہ کوئی خاص بات ہے۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں تم لوگوں سے!'' امین صاحب کی آواز میں کرختگی کی آمیزش تھی۔

''ابو وہ..... عالیہ آپی!''

پھر شافیعہ نے اصل بات اگل ہی دی۔ جس سے ابھی تک امین صاحب لاعلم تھے بلکہ ولید اور ندا بھی۔ عالیہ کو طلاق ہوگئی تھی۔ اس کے شوہر نے نہ صرف فون پہ ذلیل وخوار کیا تھا بلکہ کاغذات بھی منہ پہ دے مارے تھے۔ امین صاحب دکان پہ تھے۔ ولید بھی گھر پر نہیں تھا اور ندا اسکول۔ بلقیس اس بات کو ابھی شوہر سے چھپا رہی تھیں کیونکہ امین صاحب کی طبیعت پچھلے دنوں سے کچھ ناساز تھی' انہیں ڈر تھا کہ ان کی طبیعت بگڑ نہ جائے۔

''کیا عالیہ آپی کو طلاق ہوگئی؟'' ندا اور ولید ایک دم چلائے تھے۔ ولید جو سمجھ رہا تھا کہ معاملہ سنبھل جائے گا۔ ان لوگوں کی دھمکی ''پانی کا بلبلہ'' ہوگی۔

''یہ تو زیادتی ہے!'' وہ سراپا احتجاج نظر آیا۔

''مل گیا تمہیں سکون اپنی من مانی کر کے!'' امین صاحب اس پر چلائے۔ وہ ولید کو عالیہ کی بربادی کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ ان کے مطابق اگر وہ حورین سے دست بردار ہو جاتا تو عالیہ کا گھر بس جاتا اور آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

''میری اولاد۔ اتنی سنگ دل..... اتنی خودغرض ہوگی۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔'' امین صاحب کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ پہلی بار نمی بھی جھلک رہی تھی۔

''ان کے لاڈ اٹھاؤ۔ فرمائش پوری کرو، موبائل، موٹر سائیکل لے کر دو!'' گھر والے جو یہ سمجھ رہے تھے کہ امین صاحب ان معاملات سے بے خبر تھے وہ غلط ثابت ہوا تھا یہ شاید ان سب کی بھول تھی۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ جہاں ہر انسان دو آنکھیں رکھتا ہے۔ وہاں گھر کے سربراہ کی تین آنکھیں ہوتی ہیں جو اللہ کی خاص عطا ہوتی ہے۔

''یاد رکھنا تم سب .....!'' انگشت شہادت شافیعہ کی جانب تھی۔

''یہاں میری آنکھ بند ہونے کی دیر ہے۔ یہ بے حس، خودغرض انسان تم لوگوں سے یوں آنکھیں پھیرے گا کہ جیسے تم لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو!'' دکھ اور رنجیدگی نے ان کا چہرہ مزید بوڑھا کر دیا تھا۔

کافی دنوں سے وہ بے حد دکھی بھی تھے اور طبیعت کی ناسازی نے بھی بے حال کر رکھا تھا مگر اب اس خبر نے تو جیسے ان کے اندر تباہی مچا دی تھی۔

''ابو! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کو ہر معاملے میں میری ہی غلطی نظر آتی ہے۔ یعنی میری کوئی زندگی نہیں!'' ولید نے بھڑک کر کہتے ہوئے ایک مدد طلب نگاہ ماں اور بہن پر ڈالی تو احساس ہوا کہ آج کوئی حمایت نہیں ملے گی۔

''بالکل جیو اپنی زندگی۔ کسی کی پرواہ نہ کرو۔ ہم مریں یا جئیں تم مناؤ رنگ رلیاں!'' امین صاحب کا دکھ سینے میں رینگنے لگا تھا جو وہ بولتے ہوئے کھانسنے لگے تھے۔

''ابو.....!'' شافیعہ اور ندا دونوں باپ کی جانب لپکیں۔

''خاموش ہو جاؤ ولید۔ خدا کے لیے!'' بلقیس نے ہول کر جیسے بیٹے کو چپ کروایا تھا۔

''بلقیس! اس سے کہہ دو میری نظروں کے سامنے سے چلا جائے۔ نہ یہ میرا بیٹا ہے اور نہ ہی میں اس کا باپ!'' امین صاحب کے چہرے کی سرخی ان

کی حالت بگڑنے کا پتا دے رہی تھی۔ آوازیں سن کر عالیہ بھی آ گئی تھی۔ اس دکھیاری کو یہ منظر مزید غم زدہ کر گیا تھا۔

''یہ میری وصیت ہے کہ یہ نا ہنجار میرے جنازے میں بھی شریک نہ ہو!'' یہ آخری جملہ بول کر امین صاحب خاموش ہو گئے تھے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس اچانک صورت حال نے ولید کو بھی پتھرا دیا تھا۔ حالات کی سنگینی کا لاڈلے کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا۔ ورنہ ماں باپ اور بہنوں کے طفیل تو اس نے زندگی میں صرف آسودگی ہی آسودگی دیکھی تھی۔

☆☆☆

گھر پہ سوگواری کی فضا چھا گئی تھی۔ سب کا رو رو کر برا حال تھا۔ سب بہنیں اور بلقیس ہاسپٹل تھیں۔ اداسیوں اور پریشانیوں میں گھرا ولید گھر میں تنہا تھا کہ شافیعہ اور ندا کی آمد ہوئی تھی۔ عالیہ اور بلقیس ہاسپٹل میں تھیں۔

''آپی! ابو کیسے ہیں؟'' شافیعہ اس کی بات سنی ان سنی کرتی بلقیس کے کپڑوں کی الماری کی جانب بڑھی تھی۔

''چھوٹی..... ابو کیسے ہیں؟'' جواب نہ پا کر ندا سے استفسار کیا تھا۔

ندا نے غصے کے مارے نہ تو ولید کی طرف دیکھا تھا اور نہ ہی جواب دینے کی ضرورت محسوس کی تھی..... ولید کی حالت غیر ہونے لگی۔ گویا سب اس کو مجرم سمجھ رہے تھے۔

''شافیعہ آپی..... پلیز میری طرف تو دیکھیں۔'' وہ دونوں شاید کوئی اہم چیز تلاش کر رہی تھیں۔

''آپی! بتائیں تو سہی ابو کیسے ہیں اب؟'' بے چینی حد سے بڑھی تو وہ دوبارہ بولا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ باپ کے حوالے سے اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ صحیح تھا کہ دونوں باپ بیٹے کی کبھی نہ بنی تھی مگر خون کا رشتہ تو تھا۔

''ابو کو بہت سیریس اٹیک ہوا ہے ولید۔ ڈاکٹرز نے فوری آپریشن کا کہا ہے!'' شافیعہ نے بنا اس کی جانب دیکھے مصروف انداز میں مختصراً بتایا اور پنجوں کے بل بیٹھ کر الماری کے آخری حصے میں مطلوبہ شے ڈھونڈنے لگی۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ لوگ؟'' دونوں کی پریشانی بتا رہی تھی کہ کسی اہم چیز کی تلاش ہو رہی ہے۔

''ڈاکٹرز نے ابو کے آپریشن کے لیے ایک بڑی رقم بتائی ہے۔ امی نے یہاں کچھ پیسے رکھے تھے!'' شافیعہ نے دیوانوں کی طرح ڈھونڈتے ہوئے ساری الماری الٹ دی تھی۔ مگر بلقیس کا وہ بیگ نہیں مل رہا تھا۔ اب وہ دونوں کمرے کے دوسرے حصوں میں تلاش کرنے لگیں۔ آخر دوسری الماری کی آخری دراز سے وہ بیگ مل گیا۔ مگر یہ کیا وہ تو خالی تھا۔ بیگ میں رقم نہیں تھی۔

''پیسے کہاں گئے؟'' شافیعہ تو غم سے رو پڑی تھی۔ وہ باہمت لڑکی جو تن تنہا بڑے بڑے محاذ پہ ڈٹ جاتی تھی مگر اس اچانک افتاد نے تو اسے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

آنکھوں میں آنسو بھرے وہ سر تھام کر بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ جیسے صدمے سے بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔

''آپی! یقیناً اس میں سے رقم ولید بھائی نے ہی چرائی ہو گی!'' ندا بھی گہرے صدمے کا شکار تھی سو شک ولید کی طرف چلا گیا۔

''مم..... میں نے تمہارا دماغ ٹھیک ہے ندا؟'' یہ الزام تھا یا حقیقت۔ ولید ایک دم بوکھلا سا گیا تھا۔ ولید کی بوکھلاہٹ شافیعہ کی نظروں سے بھی مخفی نہ رہی تھی۔ وہ اکثر ماں سے کوئی نہ کوئی فرمائش کر کے پیسے مانگتا تھا۔ آج پہلی بار شافیعہ کا دل بھی لاڈلے کی طرف سے میلا ہو گیا تھا۔

''ولید! امی کے بیگ سے پیسے تم نے نکالے ہیں؟'' آنکھوں سے آنسو پونچھتی وہ ولید سے خاصے تلخ لہجے میں مخاطب تھی۔ ولید کو یہ منظر متحیر کر گیا۔

انسان جن سے محبت اور پیار پاتا ہے اس کی

ڈانٹ اور مار نہیں سہہ پاتا۔ ولید کی بھی یہی حالت تھی۔

''آپی، آپ بھی.....!'' دکھ اور غم نے اس کے قدم پتھر کر دیے تھے۔

شافیعہ کی آنکھوں میں پہلی بار اس کے لیے غصہ تھا..... جو لاڈلے کے لیے سہنا دشوار تھا۔ ان آنکھوں میں ہمیشہ محبت دیکھی تھی۔ آج ''شک'' دیکھنا عذاب تھا۔

''مجھ سے قسم لے لیں آپی! میں نے!'' شکستہ لہجے میں کہتے ہوئے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے شافیعہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے لگا تھا کہ شافیعہ نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

''ابو..... صحیح کہتے ہیں۔ تم مردہ ضمیر ہو ولید!'' شافیعہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''تم تو اس گدھ کی مانند ہو ولید کہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی دن اپنی ماں بہنوں کو بھی نوچ ڈالے!''

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ولید، شافیعہ کا یہ روپ دیکھ کر اذیت کی وادی سے تنہا گزر رہا تھا۔ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف راستے بند تھے وہ اس وادی میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔

''ولید! تم چلے جاؤ یہاں سے..... دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے، ہمارے گھر سے!'' نفرت سے چلاتے ہوئے اس نے اسے گھر سے چلے جانے کا کہہ دیا تھا۔ وہ مرد ہو کر رو پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی رکنا عذاب ہو گیا تو آستین سے اپنی بہتی ہوئی آنکھوں کو پونچھتا تیز قدموں سے باہر نکلا ہی تھا کہ شافیعہ کے نمبر پہ بلقیس کی کال آ گئی۔

بلقیس کا پرانا بیگ خراب ہو گیا تھا' انہوں نے بیگ تبدیل کر لیا تھا مگر پریشانی میں شافیعہ کو رقم لانے کا کہا تو بتانا بھول گئیں کہ بیگ تبدیل کر لیا ہے۔

☆☆☆

مردہ چہرہ' تھکن زدہ وجود لیے وہ ارسلان کے سامنے تھا۔ اس کی حالت ایسے مسافر کی سی تھی جو طویل مسافت کے بعد پہنچا ہو یا پھر شکست زدہ بادشاہ کی جس سے اس کا تخت و تاج چھین کر اسے بے دخل کر دیا گیا ہو۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ اپنی سلطنت کا بادشاہ ہی تھا۔ بے تاج بادشاہ مگر آج سب کچھ اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ لہو کا رخ بھی حالات کی چال بھی۔ اس سے پیار کرنے والے اس سے بدگمان ہو گئے تھے۔ ان کی نظروں میں وہ اپنے لیے نفرت کا طوفان دیکھ کر آیا تھا۔

''ولید تمہارے حالات جان کر بے حد دکھ ہوا ہے!'' طویل اور گہری خاموشی کو ارسلان کی پرسوچ آواز نے توڑا تھا۔

''ارسلان، ولید کا کالج کا دوست تھا مگر اس سے سینئر تھا۔ حسن اتفاق کہ وہ حورین کا بھائی تھا جس کا علم ولید کو بہت دیر بعد ہوا تھا۔ اس شام جب مین روڈ پر کتب فروش کی اسٹال پر اس نے حورین کو دیکھا تھا جو واپسی پر کسی نوجوان کے ساتھ بائیک پر چلی گئی تھی، وہ ارسلان ہی تھا مگر اندھیرا ہونے اور ہیلمٹ کی وجہ سے وہ پہچان نہ پایا تھا۔ ارسلان ایک سلجھا ہوا سمجھ دار نوجوان تھا' اس نے ہمیشہ ولید کی درست سمت میں رہنمائی کی تھی۔

''ان سب کی نظر میں، میں قصوروار ہوں۔ وہ سب مجھ سے ناراض ہو چکے ہیں.....!''

ولید نے گویا سب کی شکایت لگائی تھی۔ اس لمحے اس کی حالت اس روٹھے ہوئے بچے جیسی تھی جس سے اس کے بڑوں نے ناراض ہو کر سارے کھلونے، چاکلیٹس اور من پسند چیزیں چھین لی تھیں اور اسے پہلی بار دھتکارا تھا نفرت کی مار ماری تھی۔ اسے زندگی کے سفر میں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ تو چند گھنٹوں کے لیے باہر جاتا تو شافیعہ اور عالیہ کی کئی کالز آ جاتیں۔ مگر آج اسے گھر سے نکلے کتنے گھنٹے گزر گئے تھے مگر کسی کا میسج تک نہیں آیا تھا۔

''چندا..... تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ ہم نے تو بس غصے میں ایسا کہہ دیا تھا!''

''اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ولید ان کی ناراضی غلط نہیں ہے۔ تم بہت حد تک قصور وار ہو.....!'' غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا ہی ارسلان کی ذات کا بہترین وصف تھا۔

''مطلب!''

''مطلب یہ کہ!'' پھر ارسلان نے اپنی بات کی پوں وضاحت کی کہ جس پر کبھی ولید نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

وہ اکلوتا تھا۔ اس نے صرف پیار لیا' فرمائشیں پوری کروائیں۔ کبھی ضد سے۔ کبھی لاڈ سے۔ اس کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔ کیونکہ اس کی بہنوں کی خواہش ہوتی تھی کہ ''لاڈلا'' کسی چیز سے محروم نہ رہے۔ اس کا دل نہ اداس ہو۔ کسی شے کے لیے ترسے نہ ..... ماں نے تو اکلوتے بیٹے کو ''ہتھیلی کا چھالا'' بنا کر پالا تھا۔ کبھی ڈانٹ بھی دیتی تو پھر کئی بار دلار کرتی۔ وہ سو رہا ہوتا تو کئی بار اس کی پیشانی چومتی۔ ایک بات پر ڈانٹ دیتی تو کئی باتوں پہ درگزر کر دیتی۔ باپ سے اس کے حصے کی ڈانٹ سن لیتی مگر اپنے ''لاڈلے'' پر آنچ نہ آنے دیتی۔

''بجائے اس کے کہ پیار تمہیں ذمہ دار اور حساس بناتا تم لاپروا اور غیر ذمہ دار ہو گئے۔ ذمہ داریاں ادا کرنے کے بجائے ان سے دامن چھڑانے لگے۔''

ارسلان نے بہت باریک بینی سے غیر جانبدارانہ تجزیہ کر دیا تھا۔ حورین کمرے کے باہر کھڑی تمام باتیں سن رہی تھی مگر اندر آ کر ولید کو شکستہ حال دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''ولید، میرے پیارے بھائی! زندگی صرف لینے کا نہیں دینے کا نام بھی ہے۔''

اور ولید نے تو ساری زندگی اپنے رشتوں سے لیا ہی تھا۔ پیار، توجہ، احساس وخیال دینے کے مفہوم سے واقف ہی نہیں ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے وہ خاصا مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔

''بے فکری اور لاپروائی سے گزرا زندگی کا ہر پل، ہر لمحہ یہاں تک کہ ہر ساعت آپ سے حساب مانگتی ہے اور آپ جواب دہ ہوتے ہیں۔ انسان چاہ کر بھی اس جواب دہی سے فرار نہیں اختیار کر سکتا.....!''

ارسلان نے چھوٹی عمر سے ہی تعلیم کے ساتھ ملازمت بھی شروع کر دی تھی۔ ولید اکثر کہتا تھا کہ ارسلان بھائی کم از کم کالج لائف کو تو انجوائے کریں کام کالج کے لیے تو عمر پڑی ہے۔''

''گھر کا بڑا اور اکلوتا ہوں۔ کیا کروں ذمے داریاں انجوائے ہی نہیں کرنے دیتیں۔'' وہ نہ صرف خود پڑھ رہا تھا بلکہ کما کر بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنا ہوا تھا اور چھوٹی بہن کو اعلا تعلیم دلوا رہا تھا۔

''ہر غلطی اور کوتاہی معمولی نہیں ہوتی ولید۔ کچھ کی ''تلافی'' عمر بھر کرنی پڑتی ہے ازالے کے لیے اپنا آپ گنوانا پڑ جاتا ہے۔ کفارے کے لیے زندگیاں تیاگ دینی پڑ جاتی ہیں۔'' ارسلان ہر نقطے کی مکمل وضاحت کر چکا تھا۔ اب آگے ولید کا کام تھا قدم آگے بڑھا کر سب ٹھیک کر لے یا پھر پچھتاووں کو عمر بھر کے لیے اپنا مقصد کر لے۔

''ولید ایک آخری بات اور کہنا چاہوں گا تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ میری بہن سے مخلص ہو مگر ولید.....!'' ارسلان نے مگر کا لفظ استعمال کر کے ولید کی سانسیں روک دی تھیں۔

''میں اپنی بہن کا ہاتھ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں نہیں دوں گا جو فرائض اور ذمہ داریوں سے ناواقف ہو!''

ڈوبتے ہوئے تھکے ماندہ سورج کی جانب ولید کی نظریں اٹھی ہوئی تھیں، شام کے سائے پھیلنے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ دن بھر کا تھکا ہوا سورج بے حد لاغر کسی بوڑھے کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس کی نہ حدت میں زور تھا نہ ہی کرنوں میں طاقت..... یہ جو ابھی تھوڑی بہت روشنی زمین تک آ رہی تھی۔ یہ سورج کی بچی کھچی توانائی کی بدولت ہی تھی۔

''باپ کی حیثیت بھی اولاد کے لیے سورج کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی تپش اکثر تکلیف دہ تو لگتی ہے

مگر اس کے ڈوب جانے سے سوائے اندھیرے کے کچھ نہیں ملتا پگلے!''

ولید اکثر باپ کی ڈانٹ پر دل برداشتہ ہو جاتا تو شافعہ اکثر اسے سمجھاتی مگر لاڈ پیار نے ''لاڈلے'' کو کچھ سمجھنے ہی نہیں دیا تھا مگر جب آج باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اسے اس بات کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

عالیہ نے اپنا سارا زیور، شافعہ نے تمام بینک بیلنس اور بلقیس نے اپنی تمام جمع پونجی لٹا دی تھی ڈوبتے سورج کو پھر سے توانا کرنے کے لیے۔ اب دعائیں آخری سہارا رہ گئی تھیں۔ اور ولید جس نے باپ کو ہمیشہ دکھ اور تکلیف ہی دی تھی' وہ باپ کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ اسے تو ہمیشہ امین صاحب سے یہی شکوے رہے تھے کہ انہوں نے کبھی اکلوتے سپوت کی قدر نہیں کی تھی۔ ہمیشہ ڈانٹ پھٹکار ہی دی تھی' ہمیشہ بیٹیوں کو پیار کیا تھا۔ اس کے حصے میں صرف طعنے ہی آئے تھے۔ اس کی نظر میں وہ ایک سخت گیر باپ تھے جنہوں نے ہمیشہ بے جا پابندیاں ہی لگائی تھیں۔ ''جنریشن گیپ'' کی وجہ سے وہ کبھی اپنی اولاد کو سمجھ ہی نہ پائے تھے۔ خاص طور پر بیٹے کو۔ اسی سوچ میں ولید نے بیس اکیس سال گزار دیے تھے۔ اسے تو سورج کی تپش ہمیشہ جان جلانے والی لگتی تھی۔ مگر آج اپنے اردگرد اندھیرا دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ۔

''واقعی اندھیرے میں راہیں گم ہو جاتی ہیں۔ راستے کھو جاتے ہیں۔ منزل دور ہو جاتی ہے اور سفر نا مکمل رہ جاتے ہیں!''

اسی پل عالیہ کے نمبر سے آتی کال پر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

''ہیلو!'' لاکھوں اندیشے سمیٹے ولید کی آواز..... اور.....اور.....اور.....!

☆☆☆

''ولید چندا کب تک آ رہے ہو؟'' یہ عالیہ کی کوئی چھٹی کال تھی۔ جن میں دو تین کالیں ارسلان کی بھی تھیں۔

''آپی! بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں.....!''

امین صاحب کو احتیاط سے سہارا دیتے ہوئے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بٹھاتے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔

امین صاحب کے آج بہت اہم ٹیسٹ تھے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ایک ہفتے سے لے رکھی تھی۔

''اب انکل کی صحت کے بارے میں ڈاکٹرز کی کیا رائے ہے؟'' کانفرنس کال میں سوال ارسلان نے کیا تھا۔ اب کی بار عالیہ خاموش تھی۔

''ارسلان بھائی.....ڈاکٹرز کے مطابق اب ابو پہلے سے کافی بہتر ہیں!'' ولید نے فرط محبت سے ایک نگاہ باپ پر ڈالی تو وہ بھی ہلکا سا مسکرائے تھے۔ عالیہ اور ارسلان نے بیک وقت ''کلمہ شکر ادا کیا تھا۔

''بس جلدی پہنچو' مہمان بھی آنے والے ہیں!'' عالیہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ولید اور امین صاحب گھر پہنچے تو سب تیار تھے۔ زرق برق لباس پہنے ندا کی خوشی تھی۔

''ولید بھائی! مٹھائی کا ٹوکرا.....!'' ندا کو لگا کہ ''لاڈلا'' خود کو لاکھ بدلنے کے باوجود کوئی نہ کوئی ڈنڈی مار آیا ہوگا۔

''لے لیا ہے دادی اماں.....!'' جواب میں شوخی کے ساتھ بلا کا اعتماد بھی تھا مگر پھر بھی ندا بے یقین تھی۔

''ابو! بھائی سچ کہہ رہے ہیں؟'' اس نے باپ سے تصدیق چاہی۔

''ہاں گاڑی میں رکھا ہے!'' تصدیق مسکراتے ہوئے کی گئی۔ ندا مطمئن ہو گئی مگر اب لاڈلا بگڑ گیا۔

''ویسے تمہیں شرم تو نہیں آتی چھوٹی؟ میں نے خود کو اتنا بدل لیا مگر پھر بھی اتنی بے یقینی!''

لاڈلا مخاطب تو ندا سے تھا مگر دیکھ سب کو ہی رہا

تھا بڑے لاڈ سے۔ امین صاحب محبت سے مسکرائے تھے اور تائیدی انداز میں سر کو جنبش دے کر اس کی حمایت کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی جگنوؤں کی مانند جھلملا رہی تھی۔

''ویسے ندا! تم نے میرے بچے کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ بے چارے کو چور ہی کہہ ڈالا۔'' بلقیس بھلا کیوں اپنے لاڈلے کی حمایت میں پیچھے رہتیں۔ آج تو انہیں امین صاحب کی بھی حمایت حاصل تھی اور کیوں نہ ہوتی لاڈلے نے اپنی تمام ذمہ داریاں احسن انداز میں سنبھال لی تھیں ماں باپ دونوں کو راضی کرلیا تھا۔

''ہاں بھئی۔ جو بھی تھا جیسا بھی تھا مگر میں بھی مانتا ہوں کہ میرا ''خون'' اتنا گھٹیا کام نہیں کرسکتا۔''

امین صاحب کی بات پر تو ولید کے اندر سکون ہی سکون اتر گیا۔ یوں جیسے سات سالوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہو۔

ارسلان کی باتوں کے بعد اس نے زندگی کا سفر ایک نئے انداز میں شروع کیا تھا۔

باپ کے اسی ''کھوکھے'' سے جس پہ گھڑی بھر کے لیے بیٹھنا بھی ''لاڈلے'' کو اپنی توہین لگتا تھا۔ اس کے مطابق یہ کام اس کے شایان شان نہیں تھا۔ وقت نے اس کو سکھا دیا تھا کہ کوئی کام بھی حقیر نہیں ہوتا۔ انسان کے سوچنے کا انداز کسی کام کو ذلیل وحقیر بنا دیتا ہے۔

''سوری ولید بھائی! میں پریشانی میں۔'' ندا نے کان پکڑ کر باقاعدہ معافی مانگی تھی' اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جذباتی پن میں وہ نہ صرف خود بدگمان ہوئی بلکہ شافیعہ کو بھی ولید سی متنفر کردیا تھا۔

''اچھا ولید بھائی، حورین بھابھی کی خاطر اس خوشی کے موقع پر ہی معاف کردیں۔'' ندا کی بات پر ولید بشاشت سے مسکرایا تھا۔ واقعی حورین کی محبت نے اسے بدل ڈالا تھا۔

اسی دوران شافیعہ اور طاہر (شوہر) بھی آگئے تھے۔ طاہر شافیعہ کا اسکول پرنسپل تھا۔ امین صاحب کی بیماری کے دوران اس نے ہر ممکن تعاون کر کے اپنا خلوص ثابت کیا تھا۔ اسی لمحے ولید نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شافیعہ کی زندگی میں طاہر بہترین شریک سفر ثابت ہوگا۔

پہلی بار زندگی میں احساس ہوا کہ واقعی ہر لمحہ جواب مانگتا ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ نہ صرف ایک کمپنی میں ملازمت بھی شروع کردی اور ساتھ ساتھ باپ کی دکان کو بھی سنبھالنے لگا۔ ارسلان کی رہنمائی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے دوست اکثر اس کا مذاق اڑاتے مگر اس نے سیکھ لیا تھا کہ یہ وقتی ذلتیں ہیں آئندہ آنے والی زندگی عزتوں سے مزین ہوگی۔ اور جب عالیہ اور ارسلان کی شادی ہوئی تو اس کے ضمیر پر دھرا ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے اپنا آپ ہلکا اور راستے روشن اور صاف لگنے لگے تھے۔ جن پر چل کر اس نے اپنی محبت اپنی حورین کو بھی حاصل کرلیا تھا۔ جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ آج اس کا اور حورین کا نکاح تھا۔

اگر شافیعہ آپی کہیں گی تو تمہیں معافی ملے گی گستاخ کنیز.....!'' شافیعہ کے سامنے ولید کے لاڈ کا انوکھا ہی انداز ہوتا تھا۔

لہجے اور آنکھوں میں شوخی مسکرا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے عالیہ اور شافیعہ کا لاڈلا تھا اور یہ لاڈ اور محبت ندا کے حصے میں نہیں آیا تھا..... اور اب خود کو سنوار کر اس نے ان سب کی محبتوں کو دوبارہ سے حاصل کرلیا تھا۔

لاڈلے نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ لاڈلا ہی نہیں بلکہ انوکھا لاڈلا ہے۔

''ہاں بھئی! اس خوشی کے موقعے پہ ہر خاص وعام کے لیے معافی کا اعلان کیا جائے۔'' شافیعہ نے بھی سفارش کی۔

''جا تجھے معاف کیا.....!'' ولید نے شوخ انداز میں کہا تو سب کے قہقہے بے ساختہ تھے۔

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030'' کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/7000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/8000 روپے،

مزید معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

نمرہ احمد

جالہ

بتیسویں قسط

وہ زور زور سے چلا کے سپاہیوں کو بلانے لگا۔ چند ثانیے میں سب دوڑے چلے آئے۔

''میرے کمرے میں رات کو کون آیا تھا؟ سوتے رہتے ہو تم لوگ؟'' وہ لال چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو۔ ڈھونڈو۔ وہ کہاں سے آیا تھا۔''

آئی تھی' کہنے کی جرأت اس میں نہ تھی۔ ایک عورت اس کے ہاتھ پیر باندھ کے چلی گئی؟ اونہہ۔ (اس نے اپنی کلائیوں کو سہلایا۔ سپاہی سارے میں پھیل گئے۔ خواب گاہ اور آس پاس کے کمرے چیک کیے ہر جگہ کی تلاشی لی۔ پھر واپس آئے اور اطلاع دی۔

''آقا! کوئی نہیں آیا رات کو۔ کسی کے آنے کا سراغ تک نہیں ہے۔''

پھر اس محافظ نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ''شاید آقا نے کوئی برا خواب دیکھا ہو؟''

مرسل نے ہاتھ جھلا کے اسے چلے جانے کا کہا۔ وہ سب چلے گئے تو وہ آئینے کے سامنے آیا۔ گہرے سانس لیے۔ اس کی رنگت بحال ہونے لگی تھی۔ شاید وہ صرف ایک برا خواب تھا۔ شہزادی تاشہ ایسی بھیانک حرکت کیسے کر سکتی ہے؟ اونہوں۔

وہ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اعصاب نارمل ہو رہے تھے۔ اور تب اس نے آئینے میں دیکھا.....

اس کی سامنے والی لٹ چھوٹی تھی۔ جیسے نیچے سرے سے خنجر کے وار سے کاٹ ڈالی گئی ہو۔

مرسل کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے اور رنگت ایک دفعہ پھر سفید پڑنے لگی۔

☆☆☆

اتوار۔ بائیس جنوری۔ جونکر اسٹریٹ۔ ملاکہ۔

وہ اب گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ گردن اٹھائے خالی خالی نظروں سے گھڑیال کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سوئیاں رات گہری ہونے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ اس دنیا میں واپس آنے کے ارادے نے اسے کتنا بے خوف بنا دیا تھا۔ مرسل نے اس بچے کو مارا تھا' تالیہ نے نہیں۔ خود کو یہ یقین دلا کے وہ مرسل شاہ کو ڈرانے گئی تھی۔ اور یہ سب اس کی توقع سے زیادہ آسانی سے ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ انتہائی حد تک بے خوف ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

ایک مراد تھا جس کے لیے وہ واپس قدیم ملاکہ گئی تھی۔ ایڈم کو دوامل جائے گی اور وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ لے گی۔ کے ایل کی کسی جیل میں سڑنے سے یہ بہتر تھا۔ لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ مراد اور مرسل' دونوں نے مل کے اس بچے کو مارا تھا' تب سے اسے قدیم ملاکہ اجنبی لگنے لگا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ واپس کے ایل جائے گی۔ فاتح اور ایڈم اس کے لیے بہت تھے۔ وہ دونوں اس کے ساتھ ہوں گے تو اپنی دنیا کے الزامات کا سامنا کرنا آسان ہوگا۔

لیکن.... گھڑیال کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں..... آہستہ آہستہ اسے یقین آنے لگا.... وہ دونوں اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ ان دونوں کو وقت کے اس چکر میں کھو چکی تھی۔

اب وہ کیا کرے؟ یہ دنیا بھی اپنی نہیں رہی تھی۔ اب یہاں سے وہ کہاں جائے؟

☆☆☆

بنداہارا کے محل کے کتب خانے میں دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی تو سارے میں چھائی خاموشی ٹوٹ گئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا ایڈم باہر نکل رہا تھا۔ بیساکھی کے سہارے چلتا' سفید کرتے پاجامے میں ملبوس' سر پہ ٹوپی جمائے' وہ قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے ایک نئے دن کے آغاز کے لیے تیار ہوا ہو۔ البتہ چہرے کی نقاہت برقرار تھی۔

وہ بیساکھی سے چلتا آگے آیا تو ٹھہر گیا۔

کتب خانے میں عین سامنے.... کتابوں کے ایک ریک کے ساتھ..... کرسی پہ فاتح بیٹھا تھا۔ اس کی میز پہ موم بتی جل رہی تھی اور وہ ایک کاغذ پہ جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ شاید وہ پوری رات سے ادھر تھا۔

ایڈم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔ وہ سر جھکائے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ ایڈم کھنکھارا۔ ''سر؟''

''تمہیں لگتا ہے، میں نے تمہاری بیساکھی کی آواز نہیں سنی؟'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''اوہ۔ شاید جن چیزوں کی عادت ہو جائے' ان کی موجودگی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔'' اس نے کرسی کھینچی' بیساکھی رکھی اور فاتح کے مقابل بیٹھا۔ ''آپ کو کون سا کام اتنا مصروف رکھے ہوئے ہے؟''

وان فاتح نے نظریں اٹھائیں۔ پھر مسکرایا۔ مسکرانے سے اس کی آنکھوں کے گرد لکیریں نظر آتی تھیں۔ چہرے پہ تکان تھی مگر لگتا تھا اس کی ہمت نہیں ٹوٹی۔

''میں ہم تینوں کو بحفاظت یہاں سے نکالنے کا لائحہ عمل ترتیب دے رہا ہوں۔''

''آپ کو واقعی لگتا ہے، ہم یہاں سے نکل سکیں گے؟'' ایڈم بے یقین سا لگتا تھا۔

نیم اندھیرے کتب خانے کی ساری کتابیں چونک کے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''اس دنیا میں معجزے نہیں ہوتے' ایڈم! یہاں

سبب اور ایکشن کا قانون رائج ہے۔ کچھ پانا ہے تو اس کے لیے کچھ کرنا تو پڑے گا۔''

''مجھے بھی کرنا چاہیے تھا مگر میں جلدی ہمت ہار جانے والوں میں سے ہوں۔''

''تم نے کہا تو ہے۔ بہت کچھ۔ تم اسٹارر پورٹر بن چکے ہو۔'' (تصحیح کی)۔ ''بن چکے تھے۔ ہماری دنیا میں۔''

''میں کیریئر کی بات نہیں کر رہا۔'' ایڈم نے ٹوپی اتار کے میز پہ رکھی تو اس کے بال نظر آنے لگے۔ وہ کہیں کہیں سے جھڑ گئے تھے۔ اور کہیں سے سفید ہو رہے تھے۔

''پھر؟'' وہ چونکا۔ ایڈم اب قطار در قطار پڑے ریکس کو دیکھ رہا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ چاروں طرف رکھی کتابیں سانس روکے اس کا جواب سننے کی منتظر تھیں۔

''مجھے کسی کو بتانا چاہیے تھا کہ میرا دل ملاکہ میں کیوں خالی ہو گیا تھا۔ مگر میں ہمت نہیں کر سکا۔''

فاتح کے لکھتے ہاتھ رک گئے۔ چند لمحے تک اس نے چہرہ نہیں اٹھایا۔

''ہاں۔ تمہیں بتانا چاہیے تھا۔'' اس کے جواب پہ ایڈم چونکا۔

کتابوں نے بھی ٹھٹک کے نظروں کا رخ فاتح کی طرف موڑا جو سادگی سے کہہ رہا تھا۔

''ہم جس کے بارے میں جو محسوس کرتے ہیں' اس کا احساس سامنے والے کو دلانا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ وجہ کے بغیر کوئی ایکشن وجود میں نہیں آتا۔''

میز پہ جلتی موم بتی کے شعلے سے موم کا آنسو ٹپکا اور کنارے پہ لڑھکتا گیا۔ پھر میز پہ گرتے ہی وہیں جم گیا۔ ہمیشہ کے لیے امر۔

''آپ تو کہتے تھے، یہ میری کم ہمتی ہے۔ محبت نہیں۔'' ایڈم نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں غلط تھا۔ تمہارے جذبے نے وقت کا امتحان سہا اور یہ کم نہیں ہوا۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن....'' اس نے گہری سانس لی' قلم رکھا اور پیچھے ہوتے ہوئے ایڈم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

''ہم دونوں جانتے ہیں کہ اب اس سب کا وقت گزر چکا ہے۔''

کتابوں نے اداسی سے پلکیں جھکا دیں۔ وہ اَن کہی باتوں کے مطلب سے آشنا تھیں۔ ان کو راز چھپانے کی عادت تھی۔

''آپ نے ان سے شادی کیوں کی تھی؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں؟'' آج وہ ساری شکایتیں کرنا چاہتا تھا۔ جانے اسے پھر موقع ملے نہ ملے۔

ریک میں سجی کتابوں نے دم سادھ لیا۔ سب کی نظریں نیم اندھیرے کتب خانے کی میز کے دونوں کناروں پہ بیٹھے دو افراد پہ جمی تھیں۔

فاتح چند لمحے خاموش رہا۔ جیسے ایڈم کے سوال کا جواب مہذب طریقے سے دینے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

''میں نے یہ سب اسے مرسل شاہ سے شادی سے بچانے کے لیے کیا تھا۔ اور ہمیں ملکہ کی مدد چاہیے تھی۔''

''لیکن اب تو سارے جواز ختم ہو چکے ہیں۔ پھر آپ نے اس تعلق کو ختم کیوں نہیں کیا؟''

''میں نہیں کر سکتا۔'' اس نے ایڈم کو دیکھتے ہوئے سادگی سے شانے اچکائے۔ ''شاید کبھی کرنا ہی نہیں تھا۔''

ایڈم نے نڈھال انداز میں سر جھکا دیا۔ اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی تھی۔

''اگر ہم واپس چلے گئے:.....تو کیا آپ اس تعلق کو قائم رکھیں گے؟''

کتب خانے میں اتنا گہرا سناٹا چھایا تھا کہ کتابوں کے سانس لینے کی آواز تک نہ آتی تھی۔

''ایڈم....اگر مجھے یہ تعلق ختم کرنا ہوتا تو میں

اس کے ساتھ واپس کیوں آتا؟ میں اسے اپنی دنیا میں واپس لے جانے پہ زور کیوں دیتا؟''

قدیم صفحات نے گہری سانس خارج کی۔

''کیا آپ نے یہ بات چے تالیہ کو بتائی ہے؟''

''نہیں۔ کیونکہ اس نے کہا ہے، وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''کیا کبھی کسی عورت نے اتنی آسانی سے وہ کہا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے؟''

''اسے لگتا ہے اگر وہ میرے ساتھ رہے گی تو وہ لوگوں کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ لوگ اس کو گھر توڑنے والی اور عصرہ کا قاتل سمجھیں گے۔''

''کیا اس سے پہلے آپ دونوں نے مشکل فیصلے نہیں کیے؟'' ایڈم نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی بات پہ فاتح چپ رہ گیا۔ کتب خانے کی کتابوں نے تمسخرانہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔

''میں اسے نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن مجھ سے تعلق تالیہ کے لیے مزید مشکلات لائے گا۔''

''کیا انہوں نے اس سے بڑی مشکلات نہیں دیکھ رکھیں؟''

کتابوں کی نگاہوں میں اب دلچسپی در آئی تھی۔ وہ ریکس کے درمیان سے گردن نکال نکال کے اس کا مکالمہ سن رہی تھیں۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں چے تالیہ کی خوشی چاہتا ہوں۔'' وہ آگے ہوا اور زور دے کر کہنے لگا۔ ''میں ان کو اپنے بارے میں اس لیے نہیں بتاتا کہ اب دیر ہو چکی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مقابلے میں ہمیشہ آپ کو منتخب کریں گی۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ ان کو بتائیں کہ آپ دونوں اب بھی ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ کے ایل میں۔ ان کو واپس لے جانے کے لیے کوئی خواب تو دکھائیں۔''

''تم یہ سب دل سے کہہ رہے ہو؟''

''ایڈم بن محمد عرصہ ہوا چے تالیہ سے دست بردار ہو چکا ہے۔ ایڈم شاید ان کی خوشی دیکھنے کے لیے زندہ بھی نہ رہے لیکن یہ خیال کہ وہ خوش ہیں ایڈم کے لیے کافی ہوگا۔''

پھر وہ بیساکھی کے سہارے اٹھا اور کرسی پیچھے دھکیلی۔ فاتح نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔

''آئی ایم سوری۔'' جانے اس نے کس چیز کے لیے افسوس کیا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا وان فاتح! کہ میں واپس جا سکوں گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ مراد راجہ کی دوا سے میں ٹھیک ہو سکوں گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں واپس ضرور جائیں اور ایک اچھی زندگی گزاریں۔''

''ہم تینوں واپس جائیں گے ایڈم۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''اور مراد راجہ کی دوا ضرور اثر کرے گی۔''

''مجھے کوئی دوا نہیں بچا سکتی۔'' ایڈم نے تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کیونکہ آپ نے مجھے سکھایا تھا کہ جو ہمیں خود کرنا آتا ہے صرف وہی ہماری جان بچاتا ہے۔''

''اور تمہیں کیا کرنا آتا ہے؟''

وہ سوگواری سے مسکرایا۔ ''مجھے کتابیں پڑھنی آتی ہیں۔'' پھر گردن موڑ کے خاموش رکھے ریکس کو دیکھا۔ ''اور وہ ابھی مجھے بلا رہی ہیں۔''

''کیا؟'' فاتح نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔

''کیوں؟ آپ کو لگا یہ کتابیں مردہ ہیں؟ اونہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''یہ جیتی جاگتی' سانس لیتی کتابیں ہیں۔ ورنہ مردہ چیز سے کوئی کیسے جینے کا راستہ سیکھ سکتا ہے۔ جب میں سوتا ہوں.... ساتھ والے کمرے میں.... تو مجھے لگتا ہے یہ مجھے آواز دے کر بلا رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے ان کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی مجھے ان سے۔''

''ایڈم....'' فاتح نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''نہیں سر۔ میں نے اتنے دن ضائع کیے ہیں۔ میں اتنے دن کتابیں نہیں پڑھ سکا۔ اگر یہ

میری زندگی کے آخری دن ہیں تو میں ان ہی کتابوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ میں نے شاہی مورخ کے عہدے سے آج صبح استعفیٰ دے دیا ہے۔'' وہ مڑا اور بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا شمالی کونے کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں پڑے ریک اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ فاتح نے ترحم سے اسے جاتے دیکھا۔

وہ بیماری کے باعث چیزیں تصور کرنے لگا تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا ورنہ کتابیں کہاں کسی کو آواز دے سکتی ہیں۔

جواب میں کتابوں نے اسے اسی ترحم سے دیکھا اور پھر ان سب کی نظریں ایڈم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

وہ ان کی طرف آرہا تھا۔ کتب خانے کی ساری کتابوں کے چہروں پہ مسرت آن ٹھہری۔ اتنے دن سے وہ اسے بلا رہی تھیں۔ بالآخر وہ ان کی سن چکا تھا۔

ویسے تو ان کے پاس اپنے ہر پڑھنے والے کے لیے کچھ خاص ہوتا تھا۔ اس کے دل کو ڈھارس دینے' یا اس کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے..... لیکن ایڈم بن محمد کے لیے ان کے پاس کچھ اور بھی تھا۔

☆☆☆

یہ چوتھی صبح تھی جب مرسل شاہ نے محل کی حفاظت بڑھا دی تھی۔ سینکڑوں پہرے دار دروازوں پہ پہرہ دے رہے تھے۔ اس کی خواب گاہ کی کھڑکیوں کے آگے لوہے کی سلاخیں لگائی گئی تھیں۔ غرض کوئی چڑیا کا بچہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔

آدھی رات تک مرسل کو خوف کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ وہ خنجر تکیے تلے رکھ کے سوتا تھا۔ کمرے میں مسلسل دو پہرے دار اس کے اوپر پہرہ دیتے تھے۔ کبھی وہ وحشت کے مارے ان کو نکال دیتا۔ کبھی واپس بلا لیتا۔

ساری رات وہ کروٹیں بدلتا۔ فجر کے قریب نیند آتی۔

اور پھر صبح جب وہ جاگتا تو محسوس ہوتا کہ اس کی گردن پہ کچھ رکھا ہے۔ وہ چونک کے اسے جھاڑتا تو بالوں کی ایک تازہ کٹی ہوئی لٹ سینے سے نیچے فرش پہ گرتی۔ وہ تیزی سے آئینے میں اپنے بالوں کا جائزہ لیتا۔ ہر روز ایک نئی جگہ سے بال کٹے ہوتے تھے۔

یعنی گزشتہ رات وہ پھر آئی تھی؟ اس کا خنجر ایک دفعہ پھر مرسل شاہ کی گردن کے اتنا قریب تھا؟ وہ ہر رات کیسے اس کے محل میں پہنچ جاتی تھی؟ یہ خیال اس کے سارے جسم پہ کپکپی طاری کر دیتا۔

آج صبح وہ محل کے سبزہ زار میں فوارے کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے۔ شاہی قبا پہن رکھی تھی۔ سر کی پگڑی سے سونے کی تاروں سے بنی لڑیاں نیچے گرتی کندھے تک آتی تھیں۔

وہ خاموش نظروں سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ گھنے درختوں کے باعث فوارے کے حوض کا پانی سبز نظر آتا تھا۔

اس کے دو خاص مشیر عقب میں کھڑے تھے۔ وہ سب کسی کے منتظر تھے۔ پھر انتظار ختم ہوا اور دو سپاہیوں کی معیت میں ایک آدمی آگے آیا۔

''آقا.... مورخ آچکا ہے۔''

مرسل شاہ دھیرے سے مڑا اور سامنے کھڑے نوجوان کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ سادہ پوشاک پہنے ہوئے تھا اور کندھے پہ ایک تھیلا تھا۔

''یہ آدم بن محمد تو نہیں ہے۔'' مرسل نے سوالیہ نظروں سے مشیر کو دیکھا۔

''آقا.... آدم بن محمد نے کل استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ شاید ہی دو چار روز جی پائے۔ شہزادی تاشہ نے بھی اس کے لیے رحم کی درخواست کی ہے۔ اس مورخ کو بھی شہزادی نے ہی تلاشا ہے اور یہاں بھیجا ہے۔''

تاشہ کے ذکر پہ مرسل کے تاثرات بدلے۔

جبڑے بھنچ گئے۔ مگر اس نے بس ہوں پہ اکتفا کیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اس کو اپنا مورخ تعینات کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔''

''شکریہ آقا۔'' نوجوان نے سر جھکا کے کہا۔ پھر سیدھا ہوا اور گلہ آمیز انداز میں کہنا شروع کیا۔

''آقا.... وہ آدم بن محمد دراصل ایک چور ہے۔ اس نے میرا تھیلا چرایا تھا ایک سرائے میں۔ اور یہ بنگارایا ملا یو میری کتاب کا نام تھا جو اس نے نقل کر کے....''

مرسل نے اکتا کے ہاتھ اٹھایا۔

''تمہیں یہاں اپنے مسئلے سلجھانے نہیں بلایا میں نے۔ تم وہ لکھو، جس کا حکم میں دے رہا ہوں۔ شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ لکھنا شروع کرو۔'' اسے اشارہ کیا۔ عبداللہ بن ابو بکر نے گڑبڑا کے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جلدی سے سر ہلا دیا۔

''جو بتا رہا ہوں، اسے خوب سن لو اور سمجھ لو۔ آج تم کتاب میں ان صفحات کا اضافہ کرو گے۔ اور ظہر سے پہلے اسے دربار میں پڑھ کے سناؤ گے۔ دربار میں پڑھی کتاب سارے ملاکہ میں پھیل جاتی ہے۔''

مرسل نے واپس رخ فوارے کی طرف موڑ لیا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے وہ پانی کے اچھلتے قطروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''لکھو کہ شہزادی کی آخری شرط پوری کرنے کے لیے مرسل شاہ نے خود اپنی جان لینے کی کوشش کی۔''

مورخ نے چونک کے سلطان کی پشت کو دیکھا۔ البتہ مشیر اور سپاہی نہیں چونکے۔ وہ سر جھکائے سپاٹ کھڑے رہے۔ سچ وہی ہوتا تھا جو سلطان کے منہ سے نکلتا تھا۔

''مگر جب وہ خنجر سے اپنی کلائی کاٹنے لگا تو شہزادی تاشہ اس کے کمرے میں آئی اور.....''

''گستاخی معاف آقا.... شہزادی تاشہ کیسے آئیں؟ بنا اجازت؟'' مورخ نے بات کاٹی تو مرسل کے ماتھے پہ بل پڑے۔

''لکھ دو کہ جادو سے آئی۔'' وہ گرجا۔ ''اور اس نے کہا کہ اس نے یہ ناممکن شرط اس لیے رکھی تھی تاکہ سلطان انکار کر دے۔ یہ شادی ناممکن ہے۔ یوں اس نے سلطان کی جان بچالی اور اسے خودکشی سے روک دیا۔ سلطان نے تاشہ کو آزاد کر دیا۔ اور اب ان دونوں کے راستے الگ ہیں۔''

سلطان نے گہری سانس لی۔ مورخ تیزی سے کاغذ پہ اہم نکات نوٹ کر رہا تھا۔ بار بار جھک کے درخت کے کنارے رکھی دوات میں قلم بھی ڈبوتا تھا۔

''مگر آقا.... وہ آپ کے کمرے میں جادو کے ذریعے آئی؟'' اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔ جادو سلطنت میں ممنوع تھا۔ اور سلطان مرسل جادوگروں کے کتنا خلاف تھا' سب جانتے تھے۔ پھر جادو کے لیے اس نے تاشہ کو کیسے معاف کر دیا؟

مرسل ضبط سے پلٹا اور چبا چبا کے بولا۔ ''وہ کالے علم والی جادوگرنی کی طرح نہیں.... بلکہ کسی.... کسی نورانی علم والی ساحرہ کی طرح آئی تھی۔''

مورخ کی آنکھیں چمکیں۔ ''پسونا..... ایسی ساحرہ جس کا جادو خدا کا بخشا ہوتا ہے۔''

''ہاں ہاں یہی لکھ دو۔ اور شکل گم کرو۔''

(تاشہ پسونا۔ واہ۔ ایسے لقب پہ شہزادی اس کو انعام واکرام سے ضرور نوازے گی۔) مورخ جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے لگا۔

اس نے شکل گم کر لی تو مرسل نے ہاتھ جھلا کے سب کو وہاں سے بھیج دیا۔ خود ایک دفعہ پھر وہ پانی کو دیکھنے لگا۔ مشیر خاص ابھی تک وہاں کھڑا تھا۔ وہ دھیرے سے گویا ہوا۔

''آقا..... آپ ناخوش لگ رہے ہیں۔''

''کیونکہ میں ناخوش ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''تو آپ نے شہزادی کو سزا کیوں نہیں دی؟ ان سے ہنسی خوشی علیحدگی کیوں اختیار کر لی؟''

مرسل نے عجیب سی نظروں سے مشیر کو دیکھا۔
''تاکہ شک خود پہ آنے دوں؟''
''کس شے کا شک؟''
''تمہیں کیا لگتا ہے .... ایک عورت مجھے یوں انکار کرے گی اور میں اسے جانے دوں گا ؟ اونہوں۔''
مشیر کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔
''آپ چاہتے ہیں کہ شہزادی تاشہ کو.....''
''اس کو بھی اسی بچے کے پاس بھیج دو جس کے مرنے کا اسے بہت غم ہے۔ مگر کسی کو ہم پہ شک نہیں ہونا چاہیے۔''
وہ سرد انداز میں کہہ رہا تھا۔ مشیر نے تعظیماً سر جھکایا۔ پھر دھیرے سے بولا۔
''جو حکم آقا۔'' پھر وہ ہچکچایا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آج کل شہزادی زیادہ وقت بنداہارا کے غیر ملکی مشیر کے ساتھ گزارتی ہیں۔''
مرسل بری طرح چونکا۔ ''کون ہے وہ؟''
''وہی سیاہ قبا والا جو اس دن دربار میں بولا تھا.... آپ کے سامنے۔ جو آج کل ہر جگہ بنداہارا کے ساتھ نظر آتا ہے۔''
''ہوں۔ اس پہ نظر رکھو۔ مجھے دونوں کے پل پل کی خبر چاہیے۔''
مرسل کی سرد آنکھوں میں انتقام کے شعلے جلنے لگے تھے۔

☆☆☆

قدیم ملاکہ کے بازار میں معمول کی رونق اور چہل پہل تھی۔ بازار میں ایک جگہ چائے کے ڈھابے پہ مراد راجہ عوام کے درمیان بیٹھا ان کے مسائل سن رہا تھا۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ خوش نظر آتا تھا۔ اس کے مداحوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ لوگ اس سے گلہ کر رہے تھے کہ کیسے سلطان کے سپاہیوں نے سونے کے پُل کی تعمیر اور مچھر وغیرہ اکٹھے کرنے میں ساری دولت برباد کر دی تھی۔
وہاں سب کو سلطان سے شکوے تھے۔ کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ شرائط تاشہ نے رکھی تھیں۔ جب سے یہ خبر پھیلی کہ سلطان اور تاشہ کے راستے الگ ہیں کیونکہ تاشہ نے یہ شرائط اس لیے رکھی تھیں تاکہ سلطان خود عقل کرے اور انکار کر دے تو سلطان مزید بے وقوف نظر آنے لگا تھا۔ اور تاشہ معتبر۔ اس نے سلطان کے ہاتھوں ملاکہ کے عوام کی دولت مزید ضائع ہونے سے بچا لی تھی۔ وہ تاشہ پسونا کہلوائی جانے لگی تھی۔
اس وقت جب مراد لوگوں کے مسئلے سن رہا تھا' بنداہارا کے محل کے تہہ خانے میں الاؤ جل رہا تھا۔ اس پہ ایک کڑاہی رکھی تھی جس میں کچھ پک رہا تھا۔ دھواں اوپر اٹھتا اور روشن دان سے باہر نکل جاتا۔ کمرے میں چند ایک موم بتیاں جلی تھیں۔ تالیہ بڑی سی ڈوئی کو کڑاہی میں چلا رہی تھی۔ اور اس سے اٹھتی بدبُو سے منہ کے برے برے زاویے بناتی تھی۔
''آپ رہنے دیں' میں کرلوں گا۔ آخر یہ میری دوا ہے۔'' ایڈم بیساکھی کے سہارے چلتا قریب آیا تو وہ پلٹی۔
''اتنا تو میں کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔'' پھر اس نے میز پہ رکھے نسخے سے کچھ پڑھا۔ اور ایک پیالے میں موجود شے کڑاہی میں انڈیل دی۔ مائع کا رنگ بدلنے لگا۔
''ہم باری باری کرلیں گے۔ ابھی بہت دن لگیں گے' چے تالیہ۔''
تالیہ نے گہری سانس لی' اور ایک کرسی کھینچ کے الاؤ کے قریب لائی۔ ایڈم اس پہ بیٹھ گیا تو اس نے ایڈم کو ڈوئی تھمادی۔
''تم اس دوا کو پینے سے بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے ایڈم۔'' اس نے تسلی دی تھی۔
ایڈم زخمی سا مسکرایا۔ ''ہاں۔ یہ میری واحد امید ہے۔''
''میں چلتی ہوں۔ مجھے کچھ اور کام کرنے ہیں۔'' وہ ہاتھ پونچھتی دروازے کی طرف بڑھی۔ تو ایڈم نے پکارا۔

''اگر میں واپس نہ جاسکا...تو میری ایک بات مانیں گی؟''

وہ دروازے کے قریب ٹھہر گئی۔ پھر دھیرے سے مڑی اور شکایتی نظروں سے ایڈم کو دیکھا۔ ''ایسے مت کہو۔''

''اگر میں واپس نہ جاسکا....'' اس نے دہرایا۔

''تو آپ وان فاتح کو مجبور کیجیے گا کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں اور اپنے خوابوں سے دست بردار نہ ہوں۔''

''اب کیا فائدہ؟ وہ تو استعفیٰ دے چکے ہیں۔''

''ہم بائیس جنوری.... اتوار کے روز یہاں آئے تھے۔ سوموار کی صبح ان کی سیکرٹری نے استعفیٰ جمع کروانا تھا۔ وقت وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ واپس جاتے ہی اپنے استعفے کو خود پھاڑ سکتے ہیں۔''

تالیہ ایک دم چونکی۔ ''اوہ....یعنی ابھی تک کوئی نقصان نہیں ہوا۔ فاتح اب بھی پارٹی چیئرمین ہیں۔''

''جی بالکل۔'' ایڈم مسکرایا۔

''اگر میں ان کو راضی کرلوں تو وہ وزیراعظم کا الیکشن ضرور لڑیں گے۔''

وہ اتنی پرجوش تھی کہ تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ وقت ابھی ان کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا۔ وہ فاتح کو اس کے خوابوں سے دست بردار ہونے سے روک سکتی تھی۔

☆☆☆

اتوار۔ بائیس جنوری۔ جونکر اسٹریٹ۔ ملاکہ۔

گھڑیال کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن سے ایک اداس سا خیال گزرا۔

تب اسے لگا تھا وقت اس کے ہاتھ میں ہے....لیکن وقت کب کس کے ہاتھ آیا ہے؟

اس نے شاکی نظروں سے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا....اور پھر آگے بڑھ گئی....وہ ایک دفعہ پھر سے بازار کی رونق کی طرف جارہی تھی۔ کوئی بھی چیز اسے یقین نہیں دلا پارہی تھی کہ جو اس کے ساتھ ہوا وہ حقیقت تھی۔ اسے اب بھی لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواب ہے۔ شاید بازار کی آوازیں اس کو جگا دیں۔ اور سب پہلے جیسا ہوجائے۔ وہ دونوں اس کو واپس مل جائیں۔

کتنی خوش تھی وہ اس دن جب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ فاتح کو استعفیٰ دینے سے روک سکتی تھی۔ جب سے اس نے استعفے کے بارے میں سنا تھا' اس کا دل بوجھل تھا۔ فاتح اپنے خوابوں کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ لیکن اس روز تہہ خانے میں ایڈم نے اسے امید دلائی تھی۔ وہ اس امید کا تعاقب کرتی فاتح کے پیچھے بازار تک گئی تھی۔

اس کا ذہن پھر سے قدیم ملاکہ کی طرف جانے لگا۔

☆☆☆

قدیم ملاکہ کا بازار معمول کی رونق سے معمور تھا۔

مراد راجہ اپنے 'عوام' میں گھرا باتوں میں مصروف تھا اور وان فاتح ایک دکان کے ساتھ کھڑا' چیزیں الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ قبا پہنے' سنجیدہ تاثرات چہرے پہ سجائے وہ گاہے بگاہے نظر اٹھا کے ہجوم کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ جب سے اس نے نکاح نامہ مراد کے حوالے کیا تھا' مراد نے چابی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہی جو اس نے سوچ رکھا تھا یا کچھ اور؟

پھر جیسے ہلچل سی مچی۔ دبی دبی سرگوشیاں بلند ہوئیں۔

اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

دوسری طرف سے تالیہ چلی آرہی تھی۔

ہجوم دوسری جانب تھا۔ اس لیے مراد یہاں متوجہ نہ ہوا۔ البتہ لوگوں نے فوراً راستہ چھوڑ دیا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ سادہ لباس میں ملبوس' وہ سفید گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھی۔ کوئی مصاحب یا کنیزیں ساتھ نہ تھیں۔ وہ اکیلی تھی پھر بھی لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا۔

وہ اسے دیکھ کے مسکرا دیا اور اس کی طرف بڑھا۔ دونوں ایک دکان کے چھپر تلے آمنے سامنے رک گئے۔

''شہزادی!''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی' ایک بچہ آگے آیا اور آہستہ سے مسکرا کے بولا۔ ''تاشہ پسونا۔'' تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا تو وہ شرما کے دکان میں واپس بھاگ گیا۔ وہ مسکرا دی اور بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''مرسل شاہ نے مجھے مزید پاپولر بنا دیا ہے۔'' انگریزی میں بولی تو وہ بھی مسکرایا۔

''حالانکہ یہاں نہ انٹرنیٹ ہے نہ ٹی وی مگر خبر کتنی جلدی پھیلتی ہے۔''

تالیہ نے گردن دائیں بائیں گھمائی اور اس قدیم طرز کے بازار کو دیکھا۔

''شاید اسی لیے یہاں سکون ہے۔''

''سکون تو کہیں بھی نہیں ہے' شہزادی۔ ہر دور کے اپنے مسئلے ہوتے ہیں۔ بس شور کم ہے۔'' ساتھ ہی فاتح نے ایک محتاط نظر دور موجود ہجوم پہ ڈالی۔ مراد راجہ چائے پیتا' باتیں کرتا مصروف نظر آ رہا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ مرسل شاہ نے شادی سے انکار کیسے کیا؟''

''تالیہ کے پلانز ہیں' تالیہ کی مرضی۔'' اس نے مسکراہٹ دبا کے شانے اچکائے۔ ''میں نے اس کے ایک پہرے دار کو خرید لیا تھا۔ وہ ہر رات اس کے بال کاٹ دیتا تھا۔ مرسل سمجھا میں وہاں آتی ہوں۔ وہ ڈر گیا۔ یہ کام آسان تھا ویسے۔ مجھے آپ سے شادی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔'' آخر میں چوٹ کی جسے وہ نظر انداز کر گیا۔

''یعنی یہ طے ہے کہ وہ جھوٹے صفحات ایڈم نے نہیں لکھے تھے۔ بلکہ نئے مورخ سے لکھوائے گئے تھے۔''

اردگرد سے گزرتے چند لوگ تالیہ کو مسکرا کے دیکھتے گزر رہے تھے۔ ان کی رحم دل شہزادی جب بھی بازار سے گزرتی تھی' کسی کو کچھ دے کر ہی جاتی تھی۔

''اس قلعے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

''نہیں۔'' فاتح نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''بہت کوشش کی مگر کوئی نہیں جانتا وہ کس کا ہے۔ کسی سرکاری دفتر میں اس زمین کی تفویض کا کاغذ تک نہیں ہے۔''

''آپ مجھے اس قلعے میں لے جائیں۔''

''تمہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں۔ میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ شاید دو دماغ زیادہ بہتر کھوج لگا سکیں۔''

فاتح نے ایک نظر مجمعے کو دیکھا' اور پھر سر اثبات میں ہلایا۔ ''میں اپنا گھوڑا لاتا ہوں۔''

چند ثانیے بعد وہ دونوں آگے پیچھے وہاں سے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ مراد راجہ بظاہر لوگوں سے محو گفتگو تھا مگر کن انکھیوں سے اسے سارا منظر بخوبی دکھائی دے رہا تھا اور اس کے چہرے پہ پھیلتی ناپسندیدگی واضح تھی۔

☆☆☆

چند میل کا یہ فاصلہ آج جلد طے ہو گیا تھا۔ سارا راستہ وہ خاموش رہے تھے۔ سوائے کسی ضروری بات کے' ان کے درمیان الفاظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔

سرسبز ٹیلوں کے درمیان دور سے وہ قلعہ دکھائی دینے لگا تو تالیہ نے اپنا گھوڑا روکا' اور نیچے اتری۔

''پیدل چلتے ہیں۔'' وہ اس سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔ اور کم از کم اس ویران قلعے میں وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے۔'' وہ چند ثانیے بعد خود ہی بول اٹھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے' ساتھ ساتھ روش پہ چل رہے تھے۔

''کیا آپ وہ سن سکتے ہیں جو مجھے کہنا ہے؟'' اس نے پونی ہاتھ سے کھینچ کر اتاری تو سیاہ بال آزاد ہو گئے اور ہوا سے پیچھے کو اڑنے لگے۔

''تم واپس نہیں جانا چاہتیں؟'' سرسبز اونچے

نیچے ٹیلوں کے درمیان بنی خاکی روش پہ وہ آگے بڑھتے جارہے تھے۔

''ظاہر ہے، میں جانا چاہتی ہوں۔'' وہ برا مان گئی۔ ''لیکن آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں نے کہا نا' میں تمہیں اس الزام سے بچالوں گا۔ میں ایک وکیل بھی ہوں۔ تمہارا کیس لڑوں گا۔''

''اور خود کو بچانے کے لیے کیا کریں گے؟''

وہ چونکا۔ پھر رک گیا۔ لگام چھوڑ دی اور اس کی طرف پورا مڑ گیا۔

''میرے اوپر صرف اثاثے چھپانے کا الزام تھا۔ میں نے اخلاقی جواز پہ استعفیٰ دیا تھا۔ ملائیشیا میں سیاست دانوں کا اثاثے چھپانا قانوناً نہیں' اخلاقاً جرم ہے۔ مجھے کوئی گرفتار نہیں کرسکتا۔ پھر مجھے کیوں خود کو بچانا ہوگا؟''

''آپ کا استعفیٰ ابھی تک کارمن کے پاس ہے۔ اس نے جمع نہیں کروایا۔''

وان فاتح رامزل کے تاثرات ایک دم سخت ہوگئے۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں استعفیٰ واپس لے لوں؟''

''میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے خوابوں سے دست بردار نہ ہوں۔''

فاتح نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

روش سامنے قلعے تک ختم ہوتی تھی۔ شام کی ٹھنڈی چھایا سارے پہ پھیلی تھی۔ دور دور تک سبزہ اور درمیان میں یہ پراسرار قلعہ..... بے حد حسین منظر تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

''آپ کا جرم اتنا بڑا نہیں تھا۔''

''میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اثاثے نہیں چھپاؤں گا پھر بھی لاپروائی میں' میں اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔''

''کیا آپ کے بعد آنے والے آپ سے بہتر ہیں؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں فاتح کہ وہ آپ سے بہتر ہیں تو آپ کا استعفیٰ عظمت کا ثبوت کہلائے گا۔ لیکن اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو آپ کا استعفیٰ بزدلی ہے۔ حقیقت سے فرار ہے۔''

وہ ٹھہر گیا اور گردن موڑ کے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا۔ پھر وہ قلعے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا سفید گھوڑا پیروی میں پیچھے چلنے لگا جبکہ فاتح کا گھوڑا گھاس میں ادھر ادھر منہ مارنے لگا تھا۔

قلعہ پراسرار اور ویران ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھا۔ اس کی دیواریں اونچی تھیں۔ سرمئی پتھروں اور لکڑیوں کی بنی دیواریں۔ صحن کے احاطے میں جنگلی گھاس پھونس اُگا تھا مگر وہ بہت بڑا نہ تھا۔ ایک طرف لکڑی جلانے کا سامان رکھا تھا اور وسط میں جلی بجھی لکڑیوں کی سیاہی بتاتی تھی کہ یہاں الاؤ جلایا گیا تھا۔

تالیہ نے اپنے گھوڑے کی لگام احاطے کے کونے میں باندھی اور خود اطراف کا جائزہ لیتی آگے بڑھنے لگی۔

''تو تم یہاں قلعہ دیکھنے نہیں آئی تھیں؟ تم مجھ سے یہ بات کرنے آئی تھیں؟'' وہ چوکھٹ پہ کھڑا غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

شہزادی نے پلٹ کے اسے دیکھا اور مسکرا کے پلکیں جھپکائیں۔

''بات کرنے کے لیے اتنی پرسکون جگہ اور کہاں ملے گی' فاتح صاحب؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

''شاید یہی وہ معمہ تھا۔'' وہ چونک کے بولا۔ ''یہ بات کرنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ خفیہ باتوں کے لیے.....'' اس کی نظریں گھاس پہ ایک جگہ جلی ہوئی لکڑیوں پہ پڑیں۔ ''ایک آدمی خود اپنے لیے اتنا بڑا الاؤ نہیں جلاتا۔ یہاں ایک سے زیادہ لوگ بیٹھتے ہوں گے۔''

''یعنی..... سن باؤ یہاں کسی سے ملتا تھا۔ اس کا کوئی خفیہ گروہ تھا۔''

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گھاس کو غور سے دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ''کوئی ایسا خفیہ گروہ جو سلطان سے چھپا ہوا ہو اور اس کے آشکار ہونے سے سن باؤ ڈرتا ہو۔ مگر یہ قلعہ..... یہ کس کا ہے؟'' وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا اور جلی ہوئی لکڑیوں کو آگے پیچھے کیا۔

''یہ سن باؤ کا گھر ہے۔'' وہ جس انداز میں بولی، وہ چونکا۔ گردن اٹھا کے دیکھا تو وہ ایک دیوار کے کونے میں کھڑی تھی۔ فاتح کی طرف پشت تھی اور دیوار پہ ہاتھ سے کچھ ٹٹول رہی تھی۔ اس کی آواز میں حیرت تھی۔

''یہ وہی دیوار ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی۔ اس پہ تاشہ کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔ مگر.....'' وہ تعجب سے پلٹی اور خالی احاطے کو دیکھا۔ ''یہ دیوار سن باؤ کی حویلی کا حصہ تھی۔ میں نے مجسمہ دیکھا تھا اور کنواں بھی۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں تھیں مگر میں نے ان کو خواب میں اکٹھے دیکھا تھا جس کا مطلب ہے کہ.....''

''کہ یہ دونوں سن باؤ کی ملکیت ہیں۔'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے سیدھا ہوا۔ ''کیا وہاں کچھ لکھا ہے؟''

تالیہ نے گردن جھکا کے غور سے دیکھا۔ شام ڈوب رہی تھی' اور نیلا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا دیوار پہ کچھ لکھا ہے' مگر پڑھا نہیں جا رہا تھا۔

دیا سلائی رگڑنے کی آواز آئی اور پھر وہ قریب آیا۔ اس کے ساتھ کھڑے فاتح نے سلگتی ہوئی تیلی دیوار کے قریب کی۔

ایک لمحے کے لیے تالیہ نے نہیں دیکھا کہ دیوار پہ کیا تھا۔

زندگی اس لمحے کتنی خوب صورت تھی نا۔ وہ ہر مسئلے سے آزاد تھے۔ ساتھ تھے۔ دنیا کے شور ہنگامے سے دور..... اپنے گھوڑوں کے ساتھ اس خوب صورت قلعے میں.....

شعلہ پوری تیلی کو کھا گیا تو فاتح نے اسے گرا دیا۔ روشنی بجھی تو وہ چونکی۔

''نہیں۔ یہ نظم نہیں ہے۔ یہ لکیریں ہیں۔'' وہ دوسری تیلی رگڑ رہا تھا۔ تالیہ نے سر جھکا اور توجہ دیوار کی طرف مرکوز کی۔ ابھی مسئلے ختم نہیں ہوئے تھے۔ ابھی وہ خوش نہیں ہو سکتی تھی۔

''ہر سات لکیروں کو کاٹا گیا ہے۔ یہ دنوں کا حساب ہے۔ ہفتوں کا۔''

''ہاں۔ قدیم زمانے میں لوگ اسی طرح دن گنتے تھے۔ یہ دیکھو۔ آخری.... (اس نے گنا) آخری ساٹھ دنوں کے اوپر کاٹا نہیں گیا۔''

''یعنی سن باؤ اور اس کے ساتھی جو بھی پلان کر رہے ہیں' اس کے وقوع پذیر ہونے میں ساٹھ دن رہتے ہیں۔''

''شاید اس سے کم۔ کیونکہ ہمارے چھاپے کے بعد سن باؤ ادھر نہیں آیا اور جتنے دن گزرے وہ اس نے نہیں کاٹے۔ اب سوال یہ ہے کہ سن باؤ کے ساتھی کون ہیں اور وہ کیا پلان کر رہے ہیں؟''

وہ مڑ گیا اور لکڑیوں کی طرف آیا۔ پھر جھک کے انہیں اٹھانے لگا۔

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''آگ جلا رہا ہوں۔ کیا تمہیں اندھیرے میں بیٹھنا ہے؟'' اس کی غائب دماغی پہ اسے ٹوکا تو اس نے خفت سے سر جھٹکا۔

''اب آپ سن باؤ کے خلاف کیا کریں گے؟''

قلعے کے احاطے میں الاؤ جل رہا تھا اور وہ دونوں پتھروں پہ اس کے گرد بیٹھے تھے۔ رات پوری طرح پھیل چکی تھی۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے مشعلیں لیے اندر گئے تھے اور کھنڈر کمروں کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ان چھوئے لگتے تھے۔ گویا سن باؤ کے ساتھی صرف احاطہ استعمال کرتے تھے۔

''مجھے معلوم ہے، مجھے سن باؤ کا کیا کرنا ہے۔'' وہ اب مطمئن تھا جیسے اسے معلوم ہو وہ سن باؤ کو کیسے

استعمال کرسکتا تھا۔

''آپ کو میرے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔'' وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں، میرا کوئی خاص کام نہیں تھا آج۔ راجہ بھی مصروف تھے سو میں آگیا۔''

''میں وقت کے اس سفر کی بات کر رہی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے، تم کیا بات کر رہی ہو۔''

اور پھر سے دونوں کے درمیان ایک شکوہ کناں خاموشی حائل ہوگئی۔ آگ سے لال انگارے چیخ چیخ کے اڑتے فضا میں گم ہونے لگے۔

''آپ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں واپس جا کے حالات کا مقابلہ کروں۔ اور خود آپ اپنے لوگوں سے فرار حاصل کر رہے ہیں۔''

''میں فرار نہیں حاصل کر رہا۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ایسا لگتا تھا اس نقطے پہ وہ ڈسٹرب ہوتا ہے۔

تالیہ نے اپنی مسکراہٹ چھپالی۔ اسے وان فاتح کی دکھتی رگ مل گئی تھی۔

''یہ فرار ہی ہے۔ آپ اپنے لوگوں کو نااہل اور ناخلف جانشینوں کے سپرد کر کے فرار ہو چکے ہیں' وان فاتح۔'' وہ اس رگ کو مزید دبا رہی تھی۔ ''آپ نہیں ہوں گے تو اشعر وزیراعظم بن جائے گا۔ وہ ملک کو تباہ کر دے گا۔ اس کا ذمے دار لوگ آپ کو سمجھیں گے۔''

''میں خود کو اس عہدے کا اہل نہیں سمجھتا۔''

''تو خود کو اہل بنائیں۔ مقابلے سے بھاگیں تو نہیں۔''

''میں نے بھرے مجمع میں دعوا کیا تھا کہ میں نے کبھی کوئی اثاثہ نہیں چھپایا۔ میری سزا ہے کہ.....''

''ہم سب نے بہت سزا کاٹی ہے' فاتح۔ بہت بڑی سزا۔ اب ان سزاؤں کو بند ہو جانا چاہیے۔'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''میں اپنے جرائم سے بھاگتے بھاگتے تھک چکی ہوں۔ میں واپس جاؤں گی' اس الزام کو فیس کروں گی اور آزادی حاصل کروں گی۔ آپ واپس جائیں' اس اخلاقی جرم کے بوجھ سے چھٹکارا پائیں اور اپنے مقصد کی طرف لوٹ جائیں۔ آج کے بعد ہم میں سے کوئی اپنے خوابوں پہ سمجھوتا نہیں کرے گا۔''

کوئی سلگتی لکڑی زور سے چٹخی۔ لال انگارے اڑاڑ کے فضا میں گم ہونے لگے۔

وہ خاموش ہو گیا اور سر نیچے جھکا لیا۔ پھر کافی دیر بعد اس نے چہرہ اٹھایا اور پوچھا۔

''کیا عوام بھی تمہاری طرح سوچیں گے کہ میں فرار ہو رہا ہوں؟''

اس کے چہرے سے لگتا تھا وہ ہرٹ ہوا ہے۔ اس کا سوال سادہ تھا۔ کسی حد تک معصوم بھی۔

اور اس لمحے تالیہ کو احساس ہوا کہ سب سے اونچی کرسی والا بھی سب کچھ نہیں جانتا۔ اسے بھی بہت سی باتیں دوسروں سے پوچھنی پڑتی ہیں۔ یا شاید کوئی بھی سب کچھ نہیں جانتا۔

''جی۔ وہ یہی سوچیں گے۔'' اس نے سر ہلایا۔ پھر ٹھہر کے بولی۔ ''کیا میرے الفاظ آپ کو تکلیف دے رہے ہیں؟''

الاؤ کے پار بیٹھا فاتح مسکرایا۔

''ایک آدمی تھا..... تمہاری طرح کا.... وہ ایک تتلی کے بچے کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' وہ کہنے لگا اور وہ دلچسپی سے وان فاتح کی ایک نئی کہانی سننے لگی۔

''تتلی کا ننھا بچہ اپنے cocoon (حفاظتی ریشمی خول) میں بند تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ باہر نہیں آپا رہا۔ اسے بہت کوشش کرنی پڑ رہی ہے.. تو اس آدمی نے احتیاط سے اس 'کوکون' کو کاٹ کے کھول دیا اور تتلی کا بچہ باہر آگیا۔ اسے لگا اس نے اسے تکلیف سے بچایا ہے مگر.....'' اس نے افسوس بھری سانس کھینچی۔

''اس بچے کے پنکھ چھوٹے تھے اور مکمل طور پہ بن نہیں سکے تھے سو وہ جلدی مر گیا۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ اگر وہ کوکون سے نکلنے کے لیے خود اسٹرگل کرتا

تو اس کے پروں تک خوراک پہنچتی۔ وہ انہیں زور لگا کے پھیلاتا تو وہ مضبوط بنتے۔ وہ اپنے زور پہ باہر آتا تو صحت مند ہوتا۔'' وہ اداس مسکراہٹ سے کہہ رہا تھا۔

''ہماری پریشانیاں بھی ہمارا کوکون ہوتی ہیں۔ ان سے نکلنے کے لیے تکلیف ہمیں ہی اٹھانی پڑتی ہے۔ میں تمہاری باتوں کی تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھ سے سچ بولا۔ جھوٹ بول کے کسی کو تکلیف سے بچا کے خود ہی اس کا کوکون کھول دینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنے دوستوں کو ان کے حصے کی تکلیف کاٹنے دین چاہیے۔''

وہ پھیکا سا مسکرائی۔ وان فاتح کے سارے فلسفے ایک طرف' وہ جانتی تھی وہ اپنی باتوں سے اسے دکھ دے گئی ہے۔ وہ اپنی طرف سے اخلاقی بنیاد پہ قربانی دے رہا تھا لیکن دنیا والے ایسی قربانیوں کی قدر نہیں کرتے تھے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میرا وہ فیصلہ غلط تھا؟ اس کی وجہ سے میری یادداشت واپس آئی تھی۔'' وہ آگ کو دیکھتے ہوئے یاد کر کے بولا۔

''سارے کھیل وقت کے ہیں' فاتح۔ اس وقت وہ درست فیصلہ تھا۔ آپ نے اس کو لینے کی جرأت کی' یہ بہت بڑی بات تھی۔ لیکن وقت نے آپ کو سوچنے کا موقع دیا۔ ہماری دنیا میں وقت آپ کے اگلے اور بہتر فیصلے کے لیے ٹھہرا ہوا ہے۔''

وہ صرف مسکرا دیا۔ نجانے راضی ہوا تھا یا نہیں۔ فی الحال کے لیے اتنا بہت تھا۔

''اگر ہمارا پلان کامیاب ہو جائے تو ہم بہت جلد واپس جا سکیں گے۔'' فاتح نے بات بدل دی۔

''کیا بابا ہمیں اتنی آسانی سے جانے دیں گے؟''

''میں ہر چیز ٹھیک کر لوں گا۔'' وہ رکا۔ ''بنگارایا ملایو کے مطابق شہزادی تاشہ کے کردار کا انجام کیا ہوا تھا؟ یاد ہے؟''

''ہوں۔'' اس نے مڑ کے اس دیوار کو دیکھا جس پہ کوئی نظم نہ لکھی تھی۔ ''سلطان نے جب شہزادی سے راستہ الگ کیا تو شہزادی کی ملاقات برونائی کے ایک جلاوطن شہزادے سے ہوئی تھی۔''

''برونائی کا ولی عہد۔ رائٹ۔'' فاتح نے یاد کر کے سر ہلایا۔

''جی۔ برونائی کے مرحوم بادشاہ کا بیٹا جو پناہ کی غرض سے ملاکہ آیا تھا۔ مراد راجہ کا مہمان بنا اور شہزادی کو دیکھتے ہی (پلکیں سادگی سے جھکائیں اور مسکراہٹ دبائی۔) اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ شہزادی کو بھی وہ پسند آ گیا سو دونوں نے شادی کر لی۔''

''واٹ اے ٹریجڈی۔'' وان فاتح نے ناگواری سے کندھے اچکائے اور گردن موڑ لی۔

''مگر تم نے کہا تھا، اس دیوار کی نظم میں شہزادی کی غلام سے شادی کا تذکرہ تھا۔''

''وہ نظم بنگارایا ملایو میں نہیں ہے۔ وہ میں نے صرف خواب میں دیکھی تھی۔ بنگارایا ملایو کے مطابق شہزادی کی شادی برونائی کے ولی عہد سے ہوئی تھی۔''

فاتح نے سنجیدہ مگر ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔

''برونائی کے ولی عہد اور شہزادی تاشہ شادی کے بعد برونائی کے لیے بحری سفر پہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک روز شہزادی ایک جادوئی سوئی سے کڑھائی کر رہی تھی جب ولی عہد اس کے پاس آیا۔ شہزادی نے منع کیا کہ اس کے ہاتھ میں جادوئی سوئی ہے' اس لیے وہ قریب نہ آئے مگر ولی عہد نے اسے مذاق سمجھا۔ یوں ہنسی مذاق میں ولی عہد کی پسلی میں سوئی چبھ گئی۔ اور وہ فوراً سے نیلا پڑ گیا۔ چند لمحوں میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ شہزادی اس واقعے سے اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے اپنی زندگی ختم کر لی۔ یوں اس بحری سفر سے وہ کبھی واپس نہیں آئی۔''

''شہزادی کو کیا ضرورت تھی جادوئی سوئی سے کڑھائی کرنے کی؟ اور غلطی سے کسی کی پسلی میں

سوئی کیسے چبھ سکتی ہے؟ سو اسٹوپڈ۔'' اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

''ویسے اگر کسی دن آپ کو بابا نے کسی نئے مہمان سے متعارف کروایا اور کہا کہ یہ برونائی کا ولی عہد ہے تو آپ کیا کریں گے؟.....''

''میں کہوں گا کہ یہ بہت جلد مرنے والا ہے۔ اب چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

وہ اکتا کے کہتا اٹھا اور لباس جھاڑا۔ تالیہ کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''بھلے وہ آخر میں مر گیا ہو.....لیکن بنگارایا ملایو کہتی ہے کہ شہزادی اس کی محبت میں واقعی گرفتار ہوئی تھی۔''

وہ اسے مزید برہم کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ مگر اندر سے وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کہانی فرضی تھی اور یقیناً سلطان کے نئے مورخ نے لکھی تھی۔

واٹ اے ٹریجڈی۔

☆☆☆

جس وقت وہ دونوں بنداہارا کے محل میں واپس آئے اس نے حرم کے دروازے پہ تالیہ کو الوداع کہا اور خود محل کے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کا کمرہ تھا۔ گھوڑا راستے میں سائیس کے حوالے کر کے وہ ابھی راہداری میں داخل ہی ہوا تھا کہ دیکھا مراد راجہ کا ایک سپاہی سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

''وان فاتح۔'' اسے دیکھ کے وہ اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔ ''صبح محل میں مقررہ وقت سے پہلے پہنچنا ہے۔''

''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں۔ راجہ نے کہا ہے کہ سارے شہر میں خبر پھیلا دی جائے کہ برونائی کا جلاوطن شہزادہ ہمارے محل میں قیام کرے گا اور دربار کا حصہ ہوگا۔''

''دیکھیں گے۔'' وہ ناگواری سے کہتا آگے بڑھ گیا۔

ایک عجیب سی بے چینی نے اسے آن گھیرا تھا۔

اس نے اپنا نکاح نامہ مراد راجہ کو دے دیا تھا۔ اس کے پاس اپنے اور تالیہ کے تعلق کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ راجہ اس خوش فہمی میں تھا کہ تالیہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گی۔ کیا اسی لیے وہ اب غیر ملکی امیر زادوں کو ملا کہ مدعو کر رہا تھا؟

☆☆☆

کال کوٹھڑی میں جڑی بوٹیوں کی عجیب سی مہک پھیلی تھی۔ نہ خوشبو تھی۔ نہ بدبو۔ بس ایسی بُو جسے پہلے چند لمحوں کے لیے برداشت کرنا مشکل لگتا۔ پھر اس کی عادت ہو جاتی۔

ایڈم بن محمد کڑاہی کے قریب بیٹھا اس میں ڈوئی ہلا رہا تھا۔ ہر چند ثانیے بعد ڈوئی ہلا کے رکھ دیتا اور گود میں رکھی کتاب کھول لیتا۔ وہ نڈھال سا لگتا تھا اور جسم پسینے میں بھیگا تھا۔

اندھیرے کمرے کی ڈیوڑھی کے قریب ایک مشعل جل رہی تھی۔ اس کی روشنی مطالعے کے لیے کافی تھی۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' آواز پہ وہ ڈر کے پلٹا۔ پھر گہری سانس لی۔

''قدیم ملے شاعری کی کتاب ہے۔ اور کیا آپ دستک دے کر نہیں آ سکتیں؟''

مگر وہ مزے سے چوکی کھینچ کے اس کے قریب بیٹھی اور دبے دبے جوش سے بتانے لگی۔

''میں نے فاتح سے بات کی ہے۔ ان کے استعفے کے بارے میں۔''

''کیا وہ اسے واپس لے لیں گے؟''

تالیہ نے انگلی ٹھوڑی پہ رکھ کے سوچا۔ ''شاید ہاں۔ وہ چپ ہو گئے تھے۔ یعنی وہ اس بارے میں

چنے لگے ہیں۔ یہ پروگریس ہے۔''

''یہی ان کے لیے بہتر ہے۔''

''اگر وہ وزیراعظم بن گئے تو کیا میں اور وہ کبھی ایک ہو سکیں گے ایڈم؟'' کڑاہی میں ابلتے مائع کو دیکھتے ہوئے وہ گم صم سے انداز میں بولی۔ ایڈم چند لمحے تک اسے دیکھتا رہا۔

''آپ نے تو ان سے کہا تھا کہ آپ ہماری دنیا میں بھی ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔''

''میں تالیہ ہوں۔ کیا میں نے کبھی اتنی آسانی سے سچ بولا ہے؟'' وہ تنک کے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

''آپ ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں باوجود اس کے کہ دنیا والے آپ کی اس شادی کو کبھی قبول نہیں کریں گے؟''

''ہاں۔ مجھے اپنی دنیا میں واپس اس لیے جانا ہے کہ وہاں فاتح ہوں گے۔''

ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ''آپ صرف ان کے لیے واپس جانا چاہتی ہیں؟''

''میرا ان کے علاوہ وہاں اور کون ہوگا؟ مگر میں ابھی تک ان سے ہمارے تعلق کے بارے میں بات نہیں کر سکی۔ کیا کروں؟''

''آپ یہ مشورہ کسی اور سے نہیں مانگ سکتیں کیا؟'' وہ برہمی سے کہہ کے سامنے دیکھنے لگا۔

''میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور ہے کیا؟'' وہ برا مان کے بولی تو ایڈم چپ ہو گیا۔

وہ بھی کیا کرتا۔ اس موضوع پہ وان فاتح سے بات کرنا جتنا تکلیف دہ تھا' تالیہ سے بات کرنا اس سے زیادہ کٹھن تھا۔ جس کو آپ پسند کریں' وہ آپ کے سامنے کسی اور کی بات کرے' کیسا اذیت ناک احساس تھا مگر اسے اپنا وقار بھی نہیں کھونا تھا۔ اس لیے.... گہری سانس لی اور تحمل سے کہا۔

''تو آپ ان سے خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں کہ آپ ان کی زندگی میں کہاں کھڑی ہیں؟''

''میں needy اور desperate نہیں لگنا چاہتی۔ یاد کرو' میرے باپا کے ساتھ اس قدیم دنیا میں رہنے کے فیصلے کا مطلب تھا، میں فاتح کو چھوڑ رہی ہوں۔''

''اور ایڈم کو بھی۔'' اس نے یاد دلایا۔ اسے ہمیشہ اپنا آپ یاد دلانا پڑتا تھا۔ مگر وہ اپنی کہہ رہی تھی۔

''اتنے دعوے کر کے اب میں ان کو کیسے کہوں کہ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

''آپ میں سے کسی کو انا کی دیوار گرانی پڑے گی۔'' اس نے جھک کے ڈوئی اٹھائی اور اسے کھولتے ہوئے کاڑھے میں چلانے لگا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، وہ دنیا کے سامنے مجھے اپنی بیوی کہہ سکیں گے؟''

ایڈم نے ڈوئی چلاتے ہوئے اسے دیکھا اور اداسی سے مسکرایا۔

''وہ آپ کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''کیا واقعی؟ تو پھر وہ کبھی کچھ کہتے کیوں نہیں ہیں؟''

''پہلے تو ان کی یادداشت واپس نہیں آئی تھی۔ مگر جب انہیں یہ تعلق یاد آیا تو آپ انہیں وقت کے سفر پہ لے آئیں۔ اور اپنا فیصلہ بھی سنا دیا کہ آپ انہیں چھوڑ رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ آپ کے ساتھ آئے ہیں تو اس کا اور کیا مطلب ہے؟ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ رہیں' چے تالیہ۔ آپ کو ان سے کھل کے بات کرنی چاہیے۔ کھل کے بات کر لینا ہمارے اکثر مسائل سے نکلنے کا راستہ ہوتا ہے۔''

''تھینک یو ایڈم۔ میرا دل تم سے بات کر کے ہمیشہ ایسے ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

''دوست اسی لیے ہوتے ہیں۔'' وہ مسکرا کے کہتا' اپنی کتاب لیے اٹھ گیا۔ اس کا دل پہلے سے زیادہ بوجھل ہو گیا تھا۔

تالیہ ڈوئی سنبھال چکی تھی۔ ان دونوں نے اپنی باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور سختی سے اس پہ کاربند تھے۔

☆☆☆

اس صبح سلطنت محل کے دربار کے دروازے کھلے تھے اور تمام شرکاء اندر کی طرف جارہے تھے۔ برآمدے میں چند افراد سلطان مرسل کے منتظر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک مراد راجہ بھی تھا جو اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ مصروف نظر آتا تھا۔

یہ برونائی کے چند تاجر تھے۔ شاہانہ قباؤں میں ملبوس' نگینوں والی انگوٹھیاں پہنے' وہ مسکرا کے مراد کی کسی بات پہ سر ہلا رہے تھے۔ وان فاتح ایک ستون کے ساتھ کھڑا چبھتی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے ولی عہد کون تھا؟ یہ سب ادھیڑ عمر یا عمر رسیدہ لگتے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ برونائی کے بادشاہ نے اپنے ایک بیٹے کو جلاوطن کر دیا ہے۔ وہ اصل ولی عہد تھا اور گزشتہ چند ماہ سے گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کیا مراد نے اسے ملاکہ بلوالیا تھا؟ کہیں مراد اس سے شہزادی کی شادی کا ارادہ تو نہیں رکھتا؟

یہ خیال سیاہ قبا میں ملبوس تنہا کھڑے وان فاتح کا مزاج مزید خراب کررہا تھا۔

دفعتاً مراد نے اسے اشارے سے قریب بلایا۔ فاتح سنجیدہ چہرے کے ساتھ ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ مراد نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ بس مہمانوں سے بات کرتا رہا۔

دفعتاً نقارہ بجا۔ ہٹو بچو کی صدا بلند ہوئی اور سب قطار بنا کے کھڑے ہو گئے۔ مرسل شاہ تشریف لا رہا تھا۔

ان کے قریب وہ رکا۔ یہ قطار غیر معمولی تھی۔ مراد نے بات کرنے کی اجازت طلب کی۔

''آقا!'' تعظیم پیش کرنے کے بعد مراد نے سر اٹھایا۔ ''یہ میرے مہمان ہیں۔ برونائی سے آئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ ان کے بارے میں سوال کررہے ہیں' اس لیے سوچا ان کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔''

مرسل کے تاثرات بدلے۔ وہ مسکرایا۔ ''کیا برونائی کا جلاوطن ولی عہد ہمارے ملک میں ہے؟''

سرسری نگاہ اس وفد پہ ڈالی۔

''جی آقا۔ یہ شمس الدین ہے' برونائی کا جلاوطن ولی عہد۔'' مراد راجہ نے کہتے ہوئے ہاتھ سے وان فاتح کی طرف اشارہ کیا۔

سب کی نگاہیں اس اشارے کی سمت اٹھیں۔

فاتح را مزل اپنی جگہ سن ہو گیا۔

مرسل نے اسے دیکھا تو چہرے کے زاویے بدلے۔ ''اچھا۔ تو تمہارا مشیر برونائی سے تعلق رکھتا ہے۔ تم نے پہلے ذکر نہیں کیا۔'' اس کی سرد آنکھیں فاتح پہ جمی تھیں۔ وہ جو چونک کے مراد کو دیکھنے لگا تھا' سنبھل کے سیدھا ہوا اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔

''آپ نے سوال نہیں کیا تھا' آقا۔ ملکہ نے ویسے بھی غیر ملکی مشیروں سے کام لینے کا جو رواج ڈالا ہے' مجھے لگا اس پہ عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور شمس الدین اپنی شناخت خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔''

''ہوں۔ اچھا لگا تم سے مل کے۔''

مرسل شاہ آگے بڑھ گیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ہمراہ ہو گئے۔ وہ دونوں تنہا رہ گئے تو فاتح کا ضبط جواب دے گیا۔

''آپ نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟'' اس کے انداز میں برہمی تھی۔

''کیونکہ اگر تم بھرے بازار میں شہزادی کے ساتھ گھومتے نظر آؤ گے تو تمہارے بارے میں سوال اٹھیں گے۔ مجھے ان کا جواب دینا تھا۔ سلطان کے کارندے بھی ٹوہ لینے لگے ہیں۔ اور کیا کہتا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کسی دوسری دنیا سے؟ یہ تاجر میرے جاننے والے ہیں۔ یہ راز کو راز رکھیں گے۔''

''اور اگر اصلی ولی عہد آ گیا؟''

''کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ سلطان مرسل چند دن کا مہمان ہے؟ چند دن کے لیے اس کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔''

فاتح نے ضبط کا تلخ گھونٹ اندر اتار لیا اور خاموش ہو گیا۔ لیکن پھر وہ دربار میں نہیں گیا۔ وہ اس

وقت تازہ ہوا میں رہنا چاہتا تھا۔

وہ گھوم کے محل کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ یہاں درختوں کے درمیان مصنوعی فوارہ ابل رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا' اور جھک کے چلو بھر پانی بھرا۔ پھر اسے چہرے پہ ڈالا۔ یہ عمل کئی دفعہ دہرایا یہاں تک کہ گریبان بھیگ گیا۔

ملاکہ آنے کے بعد اور اس سے پہلے وہ مختلف قسم کے احساسات سے گزرا تھا۔ مگر یہ احساس سب سے عجیب تھا۔

(برونائی کے ولی عہد کی موت شہزادی تاشہ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔)

اس نے سر جھٹک کے اس خیال کو بھی جھٹکنا چاہا مگر اب یہ آسان نہ تھا۔ یہ ایسے تھا جیسے گردن کی پشت پہ کوئی پھونک دھیرے دھیرے چل رہا ہو۔

جیسے رات کو کمرے کے باہر قدموں کی چاپ مدھم آواز سنائی دیتی ہو۔

جیسے کوئی بلا تعاقب میں ہو.....

وہ آستین سے چہرہ پونچھتے ہوئے مڑا تو ٹھٹک گیا۔

سامنے سن باؤ کھڑا تھا۔ چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''برونائی کا ولی عہد؟ مراد راجہ نے اچھی کہانی گھڑی ہے لیکن میں تمہاری حقیقت جانتا ہوں۔'' وہ طنز سے کہتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں درختوں کے درمیان آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''میں نے مراد راجہ کی چند چیزوں کی تلاشی بھی لی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس لوگوں کو مستقبل کے زمانے میں بھیجنے کا جادو ہے۔ تم.... تم مستقبل سے آئے ہو اور تم ہم سب کا مستقبل بھی جانتے ہو۔''

''بس؟ یہی معلوم ہوا ہے تمہیں؟ اگر تم مجھ سے مہذب انداز میں پوچھتے تو میں خود ہی بتا دیتا۔ تم نے ایسے ہی وقت ضائع کیا' سن باؤ۔'' وہ ہنس دیا تھا۔ جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ ''میں چھ سو برس بعد کے زمانے سے آیا ہوں۔''

سن باؤ کی چھوٹی آنکھیں برہمی سے مزید چھوٹی ہوئیں۔

''تم نے ملکہ کو دھمکی دی۔ پھر میرے پیچھے آئے۔ اس وقت سے ڈرو وان فاتح' جب ہم تمہارے پیچھے آئیں گے۔''

فاتح آرام سے فوارے کی منڈیر پہ بیٹھا اور سر اٹھا کے سن باؤ کو دیکھا۔ پیچھے فوارے سے آتے چھینٹے اس کی پشت پہ ٹھنڈی پھوار کی طرح برسنے لگے۔

''ہمارے زمانے میں ایک محاورہ بولا جاتا ہے' وانگ لی۔ کہ پھندا صرف تب تک پھندا ہوتا ہے جب تک آپ کو اس کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ جب معلوم ہو جائے تو وہ پھندا نہیں رہتا۔ وہ مقابلہ بن جاتا ہے۔ مجھے مقابلے کب برے لگے ہیں؟'' مسکرا کے شانے اچکائے۔

وانگ لی نے بس طنزیہ مسکراہٹ کے ہنکارا بھرا اور مڑ گیا۔

اس کے جاتے ہی فاتح کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ برونائی کے ولی عہد کا انجام پھر سے یاد آنے لگا تھا۔

☆☆☆

محل کی پشت پہ حرم کا برآمدہ بنا تھا جس میں شاہانہ طرز کی کرسیاں لگی تھیں۔ ملکہ یان سوفو وہاں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ کنیزیں اور غلام اردگرد مستعد کھڑے تھے۔ ملکہ کا لباس گلابی تھا اور پیالی پہ بھی گلابی رنگ کے نقش و نگار بنے تھے۔ اس کا پیالی تھامنے کا انداز بھی محبت لیے ہوئے تھا۔ یہ اس کے چین سے لائے خاص برتن تھے۔ اور ان کے ساتھ ملکہ کے جذبات جڑے تھے۔

وہ مسکرا کے نقش و نگار کو دیکھ رہی تھی جب کنیز نے کھنکھار کے اطلاع دی۔

''وان فاتح آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

یان سوفو چونک کے سیدھی ہوئی۔ پیالی سامنے رکھ دی۔ چہرے کا رنگ بدلا مگر گردن اکڑ ائی۔ ''ہاں اسے بھیجو۔ اور اس کے ہوتے ہوئے ہمہ وقت سپاہی یہاں تعینات رہیں گے۔''

''درست' ملکہ۔ مگر وہ نہتا ہے۔ اس کے پاس اسلحہ تک نہیں ہوتا۔''

''جو کہا ہے، وہ کرو۔''

وہ جب برآمدے کے زینے چڑھ کے سامنے آیا تو یان سوفو نے دیکھا' وہ مزید مختلف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کرتے پاجامے پہ نفیس سی سیاہ قبا پہن رکھی تھی اور ایک آزاد رئیس نظر آتا تھا۔ یہ وہ غلام نہیں تھا جس سے وہ چند ماہ پہلے ملی تھی۔

دور دور تک سپاہی تعینات کھڑے اسے گھور رہے تھے۔ فاتح نے ایک نظر ملکہ کو دیکھا' سر جھکا کے تعظیم پیش کی اور مسکرایا۔

''ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اور میں تم سے تنہائی میں بات کیوں کروں گی؟ اس روز کی دھمکی یاد ہے مجھے' ولی عہد برونائی۔'' وہ طنز سے بولی۔

فاتح نے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کے کنیز کی طرف بڑھایا۔ کنیز نے جھٹ اسے ملکہ کے سامنے کیا۔

یان سوفو نے اسے گھورتے ہوئے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ پھر اسے پڑھا۔

پھر چونک کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔

''ہمیں اکیلا چھوڑ دو۔'' سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ وان فاتح کا مدعا سننے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

وانگ لی کی سرخ حویلی دوپہر کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ وانگ لی کی سواری ابھی ابھی وہاں آن رکی تھی اور وہ گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ چونکہ کافی فربہ تھا' اس لیے اترنے کے بعد پہلے اپنا سانس بحال کیا' پھر چغہ درست کیا' پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ دفعتاً ٹھٹک کے رکا۔

سامنے ملکہ کا قاصد منتظر کھڑا تھا۔

''سن باؤ۔ میں محل میں آپ کو ڈھونڈ نہیں پایا۔ ملکہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے ایک مہر بند خط اس کی طرف بڑھایا۔ وانگ لی نے تیزی سے اسے تھاما۔ ملکہ کی خاص مہر توڑی اور خط نکالا۔

''وانگ لی..... غلام فاتح میرے پاس آیا تھا اور جو اس نے مجھے تمہارے خفیہ قلعہ کے بارے میں بتایا ہے' اس کے بعد سے میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ اپنا سامان سمیٹو اور ملاکہ سے کوچ کر جاؤ۔''

وانگ لی کی رنگت پھیکی پڑی۔ اس نے کاغذ جیب میں ڈالا اور جلدی سے گھوڑے کی طرف لپکا۔

''ملکہ محل میں ہیں؟''

''نہیں۔ وہ اپنے دو چینی سپاہیوں کے ہمراہ کہیں روانہ ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں۔''

''یعنی فاتح نے ان کو اس قلعہ کا پتا دے دیا ہے۔'' اس نے تیزی سے گھوڑے کا رخ موڑا اور اسے ایڑ لگا دی۔ گھوڑا اب سرپٹ دوڑتا' دھول اڑاتا دور جا رہا تھا۔ اسے جلد از جلد ملکہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔

ابھی شام نہیں اتری تھی جب وانگ لی اونچے نیچے سبز ٹیلوں کے درمیان بنے قلعہ کی سڑک تک آ پہنچا۔ قلعے کے باہر ملکہ کے دو سپاہی کھڑے تھے۔ اسے آتے دیکھ کے انہوں نے راستہ دیا۔ وہ تیزی سے نیچے اترا اور دروازے کی طرف بھاگا۔

صحن کی چوکھٹ پہ وہ ٹھٹک کے رکا۔ ملکہ کہیں نہیں تھی۔

مگر سامنے وان فاتح کھڑا تھا۔

اور اس کے پیچھے بند اہارا کے مسلح سپاہی گھوڑوں پہ موجود تھے۔

وانگ لی چونک کے پلٹا مگر اب چند سپاہی جانے کہاں سے نکل کے اس کے عقب میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

''ملکہ کہاں ہیں؟'' اس نے بظاہر رعب دار آواز میں پوچھا۔

فاتح نے مسکرا کے اسے مخاطب کیا۔

''تمہیں ملکہ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے' سن باؤ۔ وہ اس قلعہ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتیں۔''

''وہ خط..... وہ سپاہی؟'' وانگ لی کا سانس اٹک گیا۔

''میرے لیے ملکہ کے تین چینی سپاہی خریدنا یا شہزادی تاشہ کے لیے جعلی خط تیار کرنا قطعاً مشکل کام نہیں ہے۔ تم ہمیں نہیں جانتے' وانگ لی۔''

کھیل سمجھتے ہی وانگ لی کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔

''یہاں ہر طرف بنداہارا کے سپاہی ہیں۔ تمہارا گھوڑا ابھی وہ تحویل میں لے چکے ہیں۔ یہاں سے بھاگنے کا بھی فائدہ نہیں۔ اس لیے بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ کرسی میز پہ۔ میرے ملک کے لوگوں کی طرح۔''

نرمی سے کہہ کے فاتح نے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

وانگ لی نے آستین سے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھا۔ چند لمحے وہ متامل رہا۔ پھر قلعے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ فاتح اس کے پیچھے آیا۔

اندر ایک ویران کمرہ بنا تھا۔ وہاں ایک میز کے گرد دو کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے میں کوئی مشعل نہ تھی البتہ کھڑکی سے آتی دن کی روشنی کافی تھی۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' وانگ لی بیٹھتے ساتھ ہی بے چینی سے بولا۔

''کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں کس طرح کے لوگوں سے ملتے ہو۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھا اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

''تم چینی باغیوں کے ایک گروہ کی سرپرستی کر رہے ہو جو شاہ چین کا تخت چھیننا چاہتے ہیں۔ تم یان سوفو کے باپ سے غداری کر رہے ہو۔''

وانگ لی میز پہ مٹھیاں رکھے آگے ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم حب الوطنی کے بارے میں کیا جانتے ہو' غلام فاتح؟''

''اوہ۔ تم خود کو محب وطن کہہ رہے ہو؟''

''میں غدار نہیں ہوں۔ جو کر رہا ہوں' اپنے ملک کے لیے کر رہا ہوں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ اس نے نہ تردید کی نہ کوئی صفائی دی۔ ''تم ملکہ کو بتا کے مجھے چوک میں پھانسی دلوانا چاہتے ہو۔ تو ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''

''تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے؟''

''تمہیں ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟ تم بنداہارا کے مشیر ہو اور میں ٹھہرا ایک غیر ملکی۔ میرے قول پہ تمہارے الزام کو ہمیشہ فوقیت دی جائے گی۔'' وانگ لی نے شانے اچکا دیے۔ فاتح چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

''تمہارا ذکر تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے میں نے۔ چھ سو سال بعد کے زمانے میں بھی تمہارا مجسمہ اور تمہارا گھر لوگوں نے محفوظ کر کے رکھا ہے۔''

وانگ لی اپنی جگہ بالکل ساکت ہو گیا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ میرا ذکر صدیوں بعد بھی محفوظ رہے گا؟''

''ہاں۔ اور میں نے اپنے باپ سے کہہ کے تمہاری سرخ حویلی خریدی تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ اس میں ایک مجسمہ تھا۔ سن باؤ وانگ لی کا مجسمہ۔ میں وانگ لی کا بچپن سے پرستار تھا۔ میں نے تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر اچھے الفاظ میں پڑھا تھا۔'' وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا اور وانگ لی سکتے میں چلا گیا تھا۔

''مجھے کیسے معلوم کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟''

فاتح نے شانے اچکا دیے۔ ''کیا میں نے آج تک تم سے کوئی جھوٹ بولا ہے؟ کیا میں نے تمہاری جان نہیں بچائی تھی؟ ہم ایک دوسرے کے مخالف ہو

چکے ہیں' لیکن میں اب بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ تمہیں تاریخ شاہ چین کے وفادار غلام کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

کافی دیر تک اس ویران قلعے میں سناٹا چھایا رہا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو' غلام فاتح؟''

''میرے پاس دو راستے ہیں۔ میں یا تو ملکہ کو تمہاری اصلیت بتا دوں کیونکہ جس بغاوت کو تم اٹھا رہے ہو' یہ بہت جلد شاہ چین کا تختہ الٹ دے گی۔ یہ معلوم ہونے پہ ملکہ تمہیں مروا دے گی۔ اور دوسرا راستہ.....'' فاتح نے گہری سانس لی اور لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں۔

(وہ کم عمر لڑکا سرخ اینٹوں والے فرش پہ اکڑوں بیٹھا تھا اور گردن اٹھائے اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کا باپ اس کے قریب جھکا کہہ رہا تھا۔

''یہ وانگ لی ہے۔ ایک جری مرد۔ حالانکہ وہ ایک تائی ژان (مخنث غلام) تھا مگر بہت سے مردوں سے بہتر تھا۔ وہ شاہ چین کا سب سے وفادار غلام تھا۔ جب چین میں بغاوت اٹھی' تو وانگ لی وہاں نہیں تھا۔ ہوتا تو اپنے بادشاہ کو بچا لیتا۔''

''وہ کہاں تھا' بابا؟''

''اس کو ملاکہ کے بنداہارا نے کسی قلعے میں دیکھا اور اس کا کوئی راز پالیا۔ وانگ لی عزت دار آدمی تھا۔ اس نے توہین کروانے کے بجائے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور چپ چاپ ایک سمندری سفر پہ روانہ ہو گیا جس سے وہ واپس نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی موت اسی ساتویں بحری سفر کے دوران واقع ہوگئی تھی۔'')

''دوسرا راستہ یہ ہے کہ.....'' فاتح نے پلکیں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میں تمہیں رسوا نہ کروں اور تمہیں محفوظ راستہ فراہم کروں۔ تم استعفیٰ لکھ دو اور اپنے ملک واپس چلے جاؤ۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم اپنے بادشاہ سے غداری کر رہے تھے۔ تمہارا نام تاریخ میں اچھے الفاظ سے لکھا جائے گا۔''

''میرے ساتھ بھلائی کر کے تمہیں کیا ملے گا؟'' سن باؤ نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارے جانے سے میرے چند کام آسان ہو جائیں گے۔''

''تم اور مراد راجہ مرسل شاہ کے خلاف بغاوت تیار کر رہے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو اس بغاوت کو روک دوں گا۔ لیکن تم مجھے پھانسی چڑھوا کے بھی راستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر محفوظ راستے کا مقصد؟''

فاتح نے آزردہ مسکراہٹ کے ساتھ کندھے اچکائے۔ ''ایک پرانے دوست کے لیے میں اتنا تو کر سکتا ہوں۔''

''میں اور تم کبھی دوست نہیں رہے۔''

''ایک دوسری دنیا میں تم میرے لیے ایک پرانے دوست کی طرح ہی تھے۔''

چند لمحے دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی چھائی رہی۔

''کیا واقعی شاہ چین کے خلاف بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟'' وہ غور سے فاتح کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔''

''اور اگر میں نے محفوظ راستہ نہ لیا تو تم مجھے گرفتار کر کے پھانسی چڑھوا دو گے؟''

''بالکل۔''

وانگ لی نے گہری سانس لی۔ ''میرے پاس محفوظ راستے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے' غلام فاتح۔ میں عزت سے اپنے ملک واپس جانا چاہتا ہوں۔''

فاتح نے کرسی دھکیلی اور اٹھا۔ ''میرے سپاہی تمہارا سامان سمیٹنے سے بندرگاہ تک تمہارے ساتھ رہیں گے تاکہ اگر تم کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو تو وہ تمہیں روک سکیں۔ تم ملکہ سے ملے بغیر

یہاں سے چپ چاپ روانہ ہو جاؤ گے۔"

وہ سپاٹ انداز میں کہہ کے دروازے کی طرف بڑھا جب سن باؤ نے پکارا۔

"اگر تم واقعی مستقبل کے زمانے سے آئے ہو تو مجھے بتاؤ..... چین واپس جا کے میرے ساتھ کیا ہو گا؟"

فاتح کے قدم وہیں زنجیر ہو گئے۔ پھر اس نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"تم کبھی ملاکہ واپس نہیں آؤ گے۔ میں بس اتنا بتا سکتا ہوں۔"

وانگ لی نے شانے اچکائے۔ "مجھے نہیں معلوم تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ۔ لیکن میں واپس چین جانا چاہتا ہوں۔"

وانگ لی کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ مرنے سے یہی بہتر تھا۔

مگر اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کبھی بھی چین نہیں پہنچ پائے گا۔

☆☆☆

اتوار۔ بائیس جنوری۔ جونکر اسٹریٹ۔ ملاکہ۔

وہ انسانوں کے ہجوم کی درمیان میں سر جھکائے چل رہی تھی۔ پیر اٹھاتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔ کبھی ذہن یہ سوچنے لگتا کہ وہ اب کیا کرے۔ کبھی وہ گزرے واقعات کو یاد کرنے لگ جاتی۔

اسے وہ دن یاد آیا جب فاتح نے اسے تنبیہہ کی تھی۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس کی ایک لمحے کی خطا اتنا بڑا نقصان کر سکتی تھی۔ کیسے..... اس سے کیسے ہوئی یہ غلطی؟ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ ہر چیز پلان کے مطابق جا رہی تھی... پھر..... وہ کیسے ایک لمحے کے لیے ہر شے سے غافل ہو گئی؟

چلتے چلتے وہ ایک دفعہ پھر اسی کافی شاپ کے دروازے تک آ رکی۔ باریستا نے اس کی طرف دیکھا تو مسکرا کے استفہامیہ انداز میں اندر آنے کو کہا۔ وہ گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔ پھر اندر داخل ہو گئی۔

"کیا اب آپ کچھ لیں گی؟" وہ اس کے قریب آ کے بولا۔ کچھ دیر پہلے وہی تھا جس کے سامنے وہ روئی تھی۔ اور پھر شاپ سے باہر نکل گئی تھی۔ باریستا کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ تنہا' اداس سی لڑکی اتنی عام سی بات پہ کیوں رونے لگ گئی تھی۔ البتہ اب وہ بہتر لگ رہی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں۔ اور انداز گم صم سا تھا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں.... میں دور سے سفر کر کے آئی ہوں۔ اکیلی ہوں۔" وہ اٹک اٹک کے کہہ رہی تھی۔

"فکر نہ کریں۔ ایک کپ ہماری طرف سے۔ آیئے۔"

وہ اسے ایک میز تک لے آیا۔ اس سے من پسند کافی پوچھی اور خود واپس کاؤنٹر کی طرف چلا گیا جہاں دو تین گاہک آن کھڑے ہوئے تھے۔

وہ شیشے والے دروازے کے ساتھ بیٹھی' گم صم سی باہر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

باغ کے سرسبز درختوں کے درمیان وہ ایزل اور کینوس سیٹ کیے' پینٹ کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ رنگ کے دھبے انگلیوں اور بازوؤں پہ بھی لگے تھے۔ وہ گردن جھکائے مسکراتے ہوئے رنگ بھر رہی تھی جب آہٹ پہ چونکی۔ سر اٹھایا تو دیکھا' وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

آج اس نے بھورا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سیاہ قبا ندارد تھی۔ اسے دیکھ کے تکان سے مسکرایا۔

"آپ تھکے تھکے لگتے ہیں' ولی عہد برونائی۔"

"سن باؤ کو روانہ کر کے آیا ہوں۔ ساتھ میں شاہی مورخ کو وہ سب بھی لکھوایا ہے جو ہم نے کتاب میں پڑھا تھا۔ سن باؤ عزت سے ہماری کہانی سے الگ ہو چکا ہے۔ اور ثابت ہوا کہ اس قصے کو ایڈم نے نہیں' میں نے کتاب کا حصہ بنایا تھا۔"

تالیہ برش رکھنے لگی تو وہ بے دھیانی سے ہاتھ سے پھسل گیا۔

"ان اوزاروں کے ساتھ احتیاط کیا کریں'

شہزادی۔ آپ کی ذرا سی غلطی کسی کی جان لے سکتی ہے۔'' اس کے انداز میں جانے کیا تھا' تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

''اوہ پلیز' فاتح۔ مجھے اب اس کتاب کے ایک لفظ پہ بھی بھروسا نہیں ہے۔'' وہ برا مان گئی۔ ''میں آپ کی جان نہیں لوں گی۔ بے فکر رہیں۔''

''معلوم نہیں کیا حقیقت ہے' کیا فسانہ ہے۔'' فاتح نے شانے اچکائے۔ وہ اس بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

''آپ نے اپنے استعفے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟'' کچھ دیر بعد وہ دونوں ساتھ ساتھ باغ کے درمیان روش پہ چل رہے تھے جب تالیہ نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اور ہمارا رشتہ؟ اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم؟''

اس نے کہہ ڈالا۔ بنا کسی تاثر کے۔ سپاٹ سے انداز میں۔ مگر فاتح کے قدم رک گئے۔ وہ اس کی طرف مڑا اور چونک کے اسے دیکھا۔

''میں سوچتا تھا یہ آسان ہوگا۔''

''تعلق توڑنا؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''اونہوں۔ استعفیٰ دے کر تمہارے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہوگا۔ میرے اوپر سے ذمہ داریوں اور خوابوں کا بوجھ ختم ہو جائے گا۔ میڈیا مجھ سے جواب طلبی نہیں کرے گا۔ میں جس کے ساتھ چاہوں رہ سکوں گا۔ ایک پرسکون پرائیوٹ لائف۔''

وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ وہ واقعی ان دونوں کے بارے میں سوچتا تھا؟

''لیکن؟'' تالیہ نے سوالیہ ابرو اٹھایا۔

''لیکن اگر میں اپنے عہدے پہ قائم رہا' تو میں کیسے دنیا کو سمجھاؤں گا کہ میری ایک دوسری بیوی بھی ہے جو.....''

''جو میری پہلی بیوی کی قاتل ہے۔'' وہ برہمی سے بولی۔ فاتح نے گہری سانس لی۔

''نہیں۔ جو مجھ سے عمر میں بیس سال چھوٹی ہے اور جو مجھ سے بہت مختلف ہے۔''

''آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں؟'' اسے یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں۔ اپنے لیے نہیں۔ نہ ہی اس بات سے کہ عصرہ کی موت تازہ ہے' یا میرے دو بچے ہیں۔ میں تمہارے لیے ڈرتا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ''تم اس دن درست کہہ رہی تھیں۔ اگر تم مجھ سے تعلق کے حوالے سے لائم لائٹ میں آئیں تو میڈیا تمہیں Home wrecker ثابت کرے گا۔ عصرہ کے قتل کا الزام سب کو سچ لگے گا۔ وہ تمہاری کردار کشی کریں گے۔ وہ تم پہ اتنا کیچڑ اچھالیں گے کہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔'' وہ دکھ سے کہہ رہا تھا۔ تالیہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''تم نے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہو گی کیونکہ اس طرح سب تمہیں قصوروار کہیں گے۔''

''مجھے معلوم ہے' میں نے کیا کہا تھا۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''کچھ اختلافات انسان رد کیے جانے کے لیے پیش کرتا ہے۔ لیکن میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ ''آپ'' کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں؟''

تالیہ کو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ اسی لیے وہ انہیں جھپک نہیں رہی تھی۔

''کوئی تالیہ مراد کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟''

وہ مسکرا کے بولا اور ایک لمحے کے لیے اس کی ساری مسافتیں انجام کو پہنچیں۔

ساری ریاضتوں کا پھل مل گیا۔

اس کی آنکھ کے کنارے سے پانی کا قطرہ نکلا اور نیچے لڑھک گیا۔

''مگر.....''

(ایک تو یہ مگر!)

''مگر اس روز جو کچھ تم نے کہا..... ان باتوں نے میرے لیے یہ فیصلہ مشکل بنا دیا ہے۔''

''اور میں نے ہی کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ واپس جانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ رہنا چاہیں گے؟''

وہ درختوں کے درمیان آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''اگر مجھے تمہارے ساتھ نہ رہنا ہوتا تو میں اپنی ''دنیا'' چھوڑ کے تمہارے لیے یہاں نہ آتا۔''

اور تالیہ کو اپنے سارے جواب مل گئے تھے۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو کے مسکرا دی۔

''لیکن آپ اپنا استعفیٰ واپس لیں گے۔'' یہ سب کہنا آسان ہو گیا تھا۔

وہ چپ ہو گیا۔ ''اگر میں دوبارہ اپنے کیریئر کی طرف گیا تو تمہارے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔''

''ہو جائے۔'' وہ ابھی تک مسکرا کے اس کو دیکھ رہی تھی۔

''اور تم میرے سب مسئلوں میں آخر تک میرے ساتھ رہو گی؟''

''میں نے آپ سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ اگر سارے ملائیشیاء میں کوئی آپ پہ یقین کرنے کو تیار نہ ہو تب بھی میں وہ واحد انسان ہوں گی جو آپ کے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ کیا آپ کو اب بھی تالیہ کی ہمت پہ شک ہے؟''

''ہم اسی لیے یہاں کھڑے ہیں کیونکہ تمہارے اعصاب عصرہ کے قتل کا الزام نہیں سہہ سکے تھے۔''

''مگر میں نے سبق سیکھ لیا ہے۔ وہ میری غلطی تھی۔ اب میں اس کو نہیں دہراؤں گی۔''

وہ کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا تو وہ اس کے پیچھے آئی۔

''اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے تھے تو اتنا عرصہ مجھے بتایا کیوں نہیں اور.....''

وہ گھوم کے اس کے سامنے آنے لگی جب ایک عجیب سی آواز آئی۔

زن سے ایک تیر قریبی درخت میں پیوست ہوا۔

تالیہ تیزی سے نیچے ہوئی۔ یکے بعد دیگر تیر چل رہے تھے اور درختوں میں پیوست ہو رہے تھے۔

چند لمحے کے لیے اس کا ذہن بالکل سن ہو گیا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ فاتح اس کے ساتھ زمین پہ جھکا ہوا ہے۔ وہ اس کو نیچے رہنے کا کہہ رہا ہے اور پھر چلا چلا کے سپاہیوں کو بلا رہا ہے..... عجیب خوف زدہ کر دینے والی گھڑی تھی وہ..... وہ چہرے کے سامنے بازوؤں کی قینچی بنائے' سر نیہواڑے بیٹھی رہی۔

''دو حملہ آور تھے آقا۔ سپاہیوں کے آتے ہی بھاگ گئے۔ اور محل میں کہیں گم ہو گئے۔ یا کیا معلوم باہر نکل چکے ہوں۔''

اس نے سر اٹھایا تو اردگرد جمگھٹا لگ چکا تھا۔ مراد راجہ کی پریشان اور غصیلی شکل سب سے پہلے نظر آئی۔

مراد نے ہاتھ سے اسے سہارا دیا تو وہ اس کے سہارے سے اٹھی' پھر اس کے کندھے سے لگ کے کھڑی ہو گئی۔

''یہ زہر میں بجھے تیر تھے۔'' فاتح نے ایک تیر درخت کے تنے سے کھینچ نکالا اور پہلے اس کے پھل کو دیکھا۔ پھر نظر اٹھا کے مراد کو۔

''درختوں کے باعث وہ نشانہ نہیں لے سکے۔ عجلت میں لگتے تھے۔ مگر وہ ڈرانے نہیں مارنے آئے تھے۔''

''مجھے کوئی کیوں مارنا چاہے گا؟'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''اب تو ہر چیز ٹھیک ہو چکی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' فاتح ابھی تک تیر کے پھل کا معائنہ کر رہا تھا۔

مراد کے ماتھے پہ شکنوں کا جال بچھا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور

خود ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ فاتح نے اسے کہنی سے تھاما اور اسے لیے محل کی طرف چل دیا۔ وہ پریشان لگتا تھا۔

وہ بھی قدرے شل سی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ انتہائی صدمے سے وہ سنبھل چکی تھی لیکن تعجب ابھی تک برقرار تھا۔

''مجھے کون مارنا چاہے گا؟'' اور ذہن مزید بیدار ہوا تو صبح کے سویرے کی طرح دماغ کے خانوں میں روشنی بھرنے لگی۔

''ظاہر ہے وہ شخص جس کی گردن پہ تم نے چاقو رکھا تھا۔'' وہ غصے سے بولا۔ اس کی کہنی اس نے اس کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے چھوڑی تھی۔

''اب تم یہیں رہو گی۔ اندر۔ سپاہیوں کے حصار میں۔'' وہ فکرمندی اور برہمی سے کہہ رہا تھا۔

''ہر چیز ہمارے منصوبے کے مطابق جا رہی ہے۔ ہم ذرا سی بھی غلطی نہیں افورڈ کر سکتے تالیہ۔''

تالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب محبت کو پالینے کی امید بندھ جائے تو جان جانے کا خوف کتنا بڑھ جاتا ہے۔

وہ بہت بہادر تھی۔ آج وہ ڈر گئی تھی۔

''وہ مجھے نہیں مار سکتا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے فاتح سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ وہ پلٹنے لگا جب وہ ایک دم بولی....

''اگر اس نے مجھے مار دیا.... اور میں آپ کے ساتھ واپس نہ جا سکی..... تو؟''

وہ آہستہ سے پلٹا اور افسوس سے اسے دیکھا۔ ''کیا تم کوئی اچھی بات نہیں کہہ سکتیں؟''

''اگر میں آپ کے ساتھ واپس نہ جا سکی تو آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔ نہیں مجھے ایسے نہ دیکھیں۔ میری بات سنیں۔ آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔''

''کہو۔''

''مجھے کچھ بھی ہو جائے.... لیکن آپ اپنے خوابوں سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ آپ اپنا استعفیٰ واپس لیں گے اور اس عہدے تک پہنچیں گے جو برسوں سے آپ کا خواب تھا۔ آپ ایسا کریں گے نا' فاتح؟''

وہ مشعلوں سے روشن قدیم راہداری میں کھڑے تھے۔ ان کے سایے دیوار پہ پڑ رہے تھے اور ماحول میں ان جانا سا خوف در آیا تھا۔

''میں استعفیٰ واپس لے لوں گا۔ اور ہم تینوں ایک ساتھ واپس جائیں گے۔ میں ''یہ'' وعدہ کرتا ہوں۔''

تسلی دلانے والے انداز میں کہہ کے فاتح نے اسے اندر جانے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

آدھی رات کو شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں مدھم بتیاں جلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بستر پہ چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ پہ چونک چونک جاتی۔ تکیے تلے رکھے خنجر تک ہاتھ جاتا۔ پھر سر جھٹک دیتی۔

دفعتاً وہ بستر سے نکلی۔ بال باندھے۔ چمڑے کے اونچے جوتے پہنے' اور سر پہ شال لپیٹے کھڑکی کی طرف آئی۔ بنا آواز کے وہ باہر کود گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اصطبل سے اپنا گھوڑا نکال رہی تھی۔

دفعتاً قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے تیزی سے خنجر نکالا اور دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ سانس روک لی۔ خنجر تان لیا۔ اگر حملہ آور اس کا تعاقب کر رہا تھا تو وہ.....

''تالیہ.....؟'' وہ اسے آواز دے رہا تھا۔

فاتح کی آواز نے ایک دم خنجر پہ اس کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ اوٹ سے باہر نکلی۔

''آپ یہاں کیسے؟''

وہ چوکھٹ پہ کھڑا تھا۔ کچھ فکرمند، کچھ خفا لگتا تھا۔

''کیونکہ میں نے تمہاری حفاظت کے لیے بہت سے سپاہیوں کو مامور کر رکھا ہے۔ تم کمرے سے نکلو گی تو مجھے خبر ہو جائے گی۔'' پھر تاریک اصطبل

پہ نظر ڈالی۔ ''تم اس وقت کہاں [redacted]''
وہ مسکرادی۔ ''چلیں [redacted]''
''آپ کی کافی۔'' [redacted] کاؤنٹر چھوڑ کے اس کے پاس آیا اور [redacted] کافی سے بھرا کپ رکھتے ہوئے بولا تو تالیہ پولی۔ چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ پھر کپ لو۔
''آپ کو کچھ اور چاہیے مادام؟''
''اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے گم صم سے انداز میں دائیں بائیں گردن ہلائی۔ باریستا واپس اپنی جگہ پہ آیا تو ایک دوسرے ویٹر نے اس کو خفگی سے کہا۔
''ہم فری کافی صرف اس کسٹمر کو دیتے ہیں جس کی سالگرہ ہوتی ہے۔ تم نے خوامخواہ اس لڑکی کو دے دی۔''
''اس نے کہا تھا اس کی سالگرہ ہے۔'' وہ مدافعانہ انداز میں بولا۔ لڑکی کی میز قریب ہی تھی۔ اس نے بھی سن لیا تھا۔ ان دونوں کو دیکھا اور پھیکا سا مسکرائی۔
''یہ درست کہہ رہا ہے۔ آج میری سالگرہ ہے۔ میرا اس دنیا میں آنے والا دن۔''
اور پھر سے گردن موڑ لی۔ دوسرا ویٹر عجیب سی نظروں سے اس لڑکی کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں پہ واضح طور پہ خون لگا ہوا نظر آتا تھا۔ تازہ خون جو اب خشک ہو چکا تھا۔ وہ خون ہی تھا۔ رنگ نہیں۔
وہ بھی اب اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن دوبارہ سے پیچھے اس رات تک جانے لگا، جب وہ دونوں ایک دفعہ پھر اسی قلعے کی طرف چلے آئے تھے۔ فاتح اتنا لمبا سفر خوامخواہ کرنے پہ ناخوش تھا لیکن شہزادی کی بات ماننے کے سوا چارہ نہ تھا۔
قلعے کے صحن میں جلی بجھی لکڑیوں کا ڈھیر ویسے ہی پڑا تھا۔ وہ دونوں ان سرد لکڑیوں کے پاس آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
''تم آج کے واقعے سے ڈر گئی ہو؟'' وہ اس کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
تالیہ نے پلکیں اٹھائیں۔ ''تالیہ مرنے سے نہیں ڈرتی۔''
''پھر کس چیز کا خوف تالیہ کو سونے نہیں دے رہا تھا؟''
''اگر وہ تیر میرے بجائے آپ کو لگ جاتا؟ تو میں کیا کرتی؟''
فاتح نے چہرہ تعجب سے پیچھے کیا۔ پھر ہلکا سا مسکرایا۔
''تو تم میرے لیے فکر مند تھیں؟ میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں' تالیہ۔''
''میں نے آپ کو جادوئی سوئی سے مار دیا تھا۔ کیا میں واقعی اتنی بڑی غلطی کر سکتی ہوں۔'' وہ ایک دم روہانسی ہوگئی۔
''اوہو.... وہ کتاب سچ نہیں بول رہی۔''
''مجھے اس دنیا سے بہت خوف آنے لگا ہے۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ کسی بھی بڑے نقصان سے پہلے۔ پلیز فاتح۔''
''میں نے وعدہ کیا ہے نا' ہم واپس ضرور جائیں گے۔'' وہ اسے نرمی سے یقین دلا رہا تھا۔
اندھیرے صحن میں وہ دونوں آج بھی اسی طرح بیٹھے تھے۔ لیکن آج درمیان میں آگ کا الاؤ نہ تھا۔ نہ حدت تھی نہ روشنی۔ صرف سرد سا اندھیرا تھا۔
''اب مجھے امید ملی ہے۔ کہ میں اور آپ کبھی ایک ہو سکیں گے۔ میں اب اس کو کھونا نہیں چاہتی۔''
''ہمارے ایک ہونے سے تمہاری زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔''
''اس کریزی دنیا سے زیادہ مشکل تو نہیں ہو گی۔'' پھر قدرے شک سے اسے دیکھا۔ ''کیا آپ واقعی میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں؟''
وہ پورے دل سے مسکرادیا۔ ''ہاں۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ رہو۔ کیونکہ.....''

''کیونکہ مجھے آپ کی اور آپ کو میری ضرورت ہے۔'' اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہاں اور..... میں اب تالیہ مراد کے بغیر اپنے مستقبل کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' اندھیرے صحن میں بیٹھا فاتح بتانے لگا۔ اوپر آسمان پہ تارے اور چاند سب اکٹھے ہو کے دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔

''مجھے تمہاری عادت ہو چکی ہے۔ جب میں سب بھول چکا تھا اور تم صرف میری چیف آف اسٹاف تھیں' تب بھی تمہارے بغیر زندگی مشکل لگتی تھی۔ اور اب تو سب یاد آچکا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' اندھیرے کے باوجود اس کی آنکھیں بنا کسی دقت کے فاتح کا چہرہ دیکھ سکتی تھیں۔

''مثلاً یہ کہ میرا اور تمہارا رشتہ زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔ زمانہ جو بھی ہو' زمین جیسی بھی ہو' فاتح رامزل تالیہ مراد کے بغیر نامکمل ہے۔ جو تم میرے لیے ہو تالیہ' وہ میرے لیے کبھی کوئی نہیں بن سکا۔ جو جگہ تمہاری ہے میرے دل میں' وہ کبھی کسی کی نہیں ہوسکی۔ میں تمہارے لیے جو فونڈنیس محسوس کرتا ہوں' وہ.....''

''فونڈنیس۔'' شہزادی نے ناگواری سے ابرو اٹھایا۔ ''صرف فونڈنیس؟ آپ کو اپنے احساسات بس یہی لگتے ہیں؟''

''شاید۔''

''آپ کو کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی شاید ورنہ آپ کو اپنے احساسات کے درست نام معلوم ہوتے۔''

اس نے مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔ ''یعنی آپ کو محبت ہوئی ہے شہزادی؟''

''جی۔ مجھے ہوئی ہے۔ اور میں اتنی بہادر ہوں کہ سرِ عام اعتراف کرسکتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو فاتح نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔

''جانتا ہوں۔''

وہ چونکی۔ رنگ بدلا۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا بات۔ کیسی بات۔ لیکن لبوں سے بس یہی پھسلا۔

''کب سے؟''

''قریباً پانچ سو ستاون برس سے۔''

چند لمحے کے لیے وہ سانس نہیں لے سکی۔

وہ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا محسوس کرتی ہے۔ ایسے شخص کو وہ کیا کہے؟ ظالم یا.....؟

''اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ میرے لیے صرف fondness محسوس کرتے ہیں تو آپ خود اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے وان فاتح۔'' تنک کے بولی تو اس نے شانے اچکا دیے۔ اب وہ جھک کے لکڑیوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ غالباً اسے آگ جلانی تھی۔

''آپ واپس جا کے بدل تو نہیں جائیں گے؟''

''تم اس بات سے ڈرتی ہو کہ میں سب کچھ پھر سے بھول جاؤں گا؟''

''کیا مجھے ڈرنا نہیں چاہیے؟ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی کچھ بھول گیا تو ہم واپس اسکوائر ون پہ کھڑے ہوں گے۔''

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش ایڈم یہ سب بھول جائے۔ اس نے سب سے زیادہ تکلیف سہی ہے۔'' وہ اب پنجوں کے بل بیٹھا آگ جلا رہا تھا۔ پہلے چنگاریاں جلیں۔ پھر یکا یک شعلہ بھڑک اٹھا۔ فاتح نے مسکرا کے پیچھے دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے چونک کے گردن ادھر ادھر گھمائی۔

وہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جس سے وہ دیوار پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ تعجب سے اٹھا۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''اپنی تقدیر پوری کر رہی ہوں۔''

فاتح نے ایک جلتی لکڑی الاؤ سے نکالی اور اسے بلند کیے تالیہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ دیوار کو شعلے نے مزید روشن کردیا۔

تالیہ کے ہاتھ میں ایک موٹی' نوکیلی سوئی تھی

جس سے وہ دیوار پہ کھرچ کھرچ کے لکھتی جا رہی تھی۔

''تاشہ.....
جو شہزادیوں جیسی تھی...
اس نے ایک غلام سے شادی کی تھی
اور اسے آزاد کر دیا تھا۔
اس نے ملاکہ کے لوگوں کی
خدمت کی تھی پورے دل سے.....
اس نے دشمنی مول لی سلطان سے
اور دوست بنائے عام لوگوں میں.....
اور بالآخر اس نے خود کو بھی آزاد کر دیا.....
ناکردہ گناہوں کے بوجھ سے.....
ماضی کے غم سے.....
وہ اس حال میں گئی اس دنیا سے
کہ وہ تیار تھی ہر الزام کا مقابلہ کرنے کے لیے....
بہادری سے.....''

نظم مکمل کر کے اس نے سوئی نیچے کی اور پلٹی۔

''کیا یہ عمارت ہمارے زمانے تک محفوظ رہے گی؟ اور یہ نظم بھی؟'' فاتح کی محتاط نظریں اس سوئی پہ جمی تھیں۔

''نہیں۔ میں نے صرف اسے خواب میں دیکھا تھا۔ ایسی کوئی عمارت ہمارے زمانے میں نہیں ہے۔ غالباً پرتگالیوں نے اسے بھی جلا دیا تھا۔ اور آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو اس سوئی سے نہیں ماروں گی۔'' آخر میں جل کے بولی۔

''میں نے بطور باس تم سے کافی سخت کام لیے ہیں۔ میں اس کے لیے شرمندہ ہوں۔'' وہ چوکنا سا کہہ رہا تھا۔

''اُف فاتح۔ یہ محض موٹی کڑھائی کی سوئی ہے۔ میں اسے ابھی آگ میں پھینکتی ہوں۔'' وہ واقعی آگے آئی اور اس سوئی کو جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ وان فاتح نے گہری سانس خارج کی۔

''آر یو شیور تمہارے پاس ایسی کوئی دوسری سوئی نہیں ہے؟''

تالیہ بے اختیار ہنس دی۔ ''آپ کو چاہیے کہ آپ میرے ساتھ اچھا برتاؤ رکھیں۔ ورنہ کیا معلوم میرے پاس ایسی کئی سوئیاں پڑی ہوں۔''

''ہمیں واپس جانا چاہیے۔ اب مجھے تم سے خوف آنے لگا ہے۔'' وہ سر جھٹک کے کہتا آگے بڑھ گیا تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس دی۔

☆☆☆

اگلا سارا دن خاموشی سے کٹا۔ لگتا تھا محل پہ موت کا سناٹا چھایا تھا۔ سب چپ چاپ اپنے کاموں میں لگے تھے۔ اگلے روز مراد راجہ اور مرحوم سلطان کے بیٹوں نے بغاوت کرنی تھی۔ یہ وہ بغاوت تھی جو مراد راجہ بہت عرصے سے تیار کر رہا تھا۔ اور اب بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی تھی۔ تالیہ کو حکم تھا کہ وہ تہہ خانے کی کال کوٹھڑی میں ایڈم کے ساتھ رہے گی۔ اسی لیے وہ سرِ شام ہی وہاں چلی گئی تھی۔

وسط کمرے میں انگارے دہک رہے تھے اور کڑاہی میں موجود مائع ابل رہا تھا۔ وہ ڈوئی ہلاتی، خلاء میں دیکھتی کسی سوچ میں گم تھی۔ کھلے بال شانوں پہ گر رہے تھے اور کان پہ ایک سوکھا پھول اٹکا تھا۔

ایڈم کمرے کے دوسرے کونے میں دیوار کے ساتھ فرش پہ بیٹھا تھا۔ گھٹنوں پہ کتاب رکھی تھی جس کو وہ دیے کی مدھم روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے نظر اٹھا کے اسے بھی دیکھتا جو کسی خیال میں غرق نظر آتی تھی۔

''آپ اداس کیوں ہیں؟ اب تو وہ کہہ چکے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ ایک نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتے ہیں۔''

تالیہ نے نظروں کا رخ اس کی طرف موڑا۔ پھر ڈوئی رکھی اور دونوں ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھی۔

''اور اگر پھر سے وہ سب کچھ بھول گئے؟''

''اس دفعہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ تسلی دینے لگا۔

''کیا میں غلطی سے ان کو سوئی چبھو کے مار سکتی

ہوں؟"

"چے تالیہ.... چے تالیہ...." ایڈم نے افسوس سے کہتے ہوئے کتاب رکھی' اور لاٹھی کے سہارے اٹھا۔ پھر لنگڑا کے چلتا ہوا اس کے سامنے آیا اور بیٹھا۔ "کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی مر سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔"

اس نے دہل کے ایڈم کو دیکھا۔ "اللہ نہ کرے۔ تمہاری دوا بالکل تیار......"

"Let's face it" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "ضروری نہیں ہے کہ دوا اثر کرے۔ اگر یہ ٹھیک نہ بنی.... یا اگر اس نے الٹا اثر کر دیا.... تو میں مر بھی سکتا ہوں۔ میں ہماری کہانی کا بے کار کردار ہوں جس کی ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ میرے کردار کے کرنے کے لیے اب کچھ نہیں بچا اس لیے اگر کوئی خطرے میں ہے تو وہ میں ہوں۔ وان فاتح یا آپ نہیں۔"

"ایڈم ہماری زندگی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اور تمہارے پاس اب بھی کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

وہ تکلیف سے مسکرایا۔ "بس یہی کہ میں اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ وہ میرے بغیر اکیلے ہوں گے۔ میں ان کی ساری زندگی کی کمائی ہوں۔"

"تم ان کے پاس ضرور جاؤ گے۔"

"اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیا آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گی؟" وہ آگے کو جھکا اور سادگی سے پوچھا۔ تالیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ میرے ماں باپ کا خیال رکھیں گی؟"

"ان کو کبھی کسی معاملے میں مشکل نہیں پیش آئے گی' آئی پرامس۔"

"میں مالی معاملات کی بات نہیں کر رہا۔" وہ آزردگی سے بولا۔ "جب بچے پاس ہوتے ہیں تو وہ ماں باپ سے باتیں کرتے ہیں۔ اگر میں نہ رہا تو میں چاہتا ہوں کہ ان سے کوئی بات کرنے والا ہمیشہ موجود رہے۔ آپ بس مجھ سے اتنا وعدہ کریں کہ آپ ان کے لیے 'وقت' نکالتی رہیں گی۔ وقت وہ سب سے بڑا تحفہ ہے جو ہم کسی کو دے سکتے ہیں۔"

تالیہ نے سر ہلا دیا۔ سارے چکر اس 'وقت' کے ہی تھے۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ دونوں چونک کے مڑے۔ فاتح اندر داخل ہو رہا تھا۔ تالیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"آج تو بغاوت کی رات ہے۔ ایسے میں بنداہارا کا مشیر یہاں کیا کر رہا ہے۔"

"یہ میری لڑائی نہیں ہے۔" وہ شانے اچکا کے کہتا ان کے قریب آیا اور تیسری چوکی کھینچی اور باری باری ان کو دیکھا۔

"دوا تیار ہو گئی؟"

"صبح سے پہلے ہو جائے گی۔ یہ کافی تھکا دینے والا عمل تھا۔" تالیہ نے ڈوئی پھر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ فاتح نے ایک نظر ایڈم کو دیکھا' پھر تسلی دی۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا نا' میں تمہیں واپس ضرور لے کر جاؤں گا۔"

"اگر آپ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے' مجھے تب بھی آپ سے گلہ نہیں ہوگا۔"

فاتح نے سوالیہ نظروں سے تالیہ کو دیکھا اور ابرو اچکائے۔ (اسے کیا ہوا ہے؟)

"ایڈم کو یقین نہیں ہے کہ دوا اثر کرے گی۔"

"دوا ضرور اثر کرے گی' ایڈم۔"

"اور اگر کچھ غلط ہو گیا؟ یا ہمارا پلان فیل ہو گیا؟ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مجھے یہ نہیں کھانی چاہیے۔" وہ متذبذب سا دھواں اڑاتی کڑاہی کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم نے حرف بہ حرف ترکیب پہ عمل کیا ہے؟"

"جی.... لیکن......"

"پھر کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اپنا یہ مایوس چہرہ درست کرو اور دوا تیار کرو۔"

"مگر.... فاتح.... کیا معلوم دوا کی ترکیب غلط ہو.... یا کچھ اور...... شاید ایڈم کو یہ نہیں کھانی چاہیے۔" وہ بھی متذبذب ہو گئی مگر وان فاتح نے سختی

سے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کرایا۔

''یہ ایڈم کا آخری آپشن ہے۔ اس کو شکوک میں مت ڈالو۔'' ایڈم نے سر ہلا دیا اور تہہ خانے میں پھر سے خاموشی چھا گئی۔ کڑاہی سے نکلتے دھوئیں کے مرغولے اوپر اٹھ اٹھ کے فضا میں گم ہونے لگے۔

''اب ہم ساری رات کیا کریں گے؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''صبح کا انتظار۔ ایک روشن صبح کا انتظار۔'' فاتح اوپر چھت پہ بنے روشن دان کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ فی الوقت سب کچھ پلان کے مطابق جا رہا تھا۔

جس وقت مراد راجہ کے سپاہی مرسل شاہ کے محل کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے' اور مرسل کو نیند سے اٹھا کے' زنجیروں میں جکڑے قید خانے میں بند کر رہے تھے.... اس کوٹھڑی میں جلتا الاؤ بجھ چکا تھا۔ کڑاہی اب ٹھنڈی تھی۔ سارا مائع سوکھ کے ایک سفید سفوف میں بدل چکا تھا۔ مٹھی بھر سفوف۔

ایڈم بن محمد اب اس سفوف کو پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل رہا تھا۔ سفوف ختم ہوا تو اس نے جام رکھا اور گہری سانس لے کر ان دونوں کو دیکھا جو سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ترکیب کے مطابق دوا کھا کے مجھے سو جانا چاہیے۔ جب میں اٹھوں گا تو بالکل تندرست ہو چکا ہوں گا۔ میں اب سونے جا رہا ہوں۔ مجھے ابھی سے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے لاٹھی اٹھائی اور کھڑا ہو گیا۔ تالیہ امید اور فکر مندی کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کیا وہ دوبارہ ایڈم کو دیکھ پائے گی؟ وہ بھی تندرست حالت میں؟ اس کا جواب صرف وقت کے پاس تھا۔

☆☆☆

سلطنت ملاکہ پہ آج صبح کا سورج بہت سی تبدیلیاں لیے طلوع ہوا تھا۔ مرسل شاہ قیدی بن چکا تھا۔ ملکہ یان سوفو ایک روز پہلے ہی محل سے فرار ہو چکی تھی۔ گزشتہ سلطان کے بیٹے تخت پہ قابض ہو چکے تھے اور مراد راجہ ان کا بندا ہارا تھا۔

بنگارایا ملایو کے مطابق یہ باغی شہزادے چند ہفتے ہی حکومت کر سکے تھے۔ مراد نے ان کی فوج کو استعمال کیا' ان کے ذریعے مرسل کو ہٹایا' اور چند ہفتے بعد ان شہزادوں کا پتا بھی صاف کیا اور خود سلطان بن بیٹھا۔

مگر ابھی یہ سب ہونے میں کافی وقت تھا۔ اس لیے فی الحال وہ صرف بندا ہارا تھا اور درست موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

مرسل کو اس نے اپنے محل کے قید خانے میں ڈالا تھا اور سپاہیوں کی بھاری نفری اس پہ پہرے کے لیے تعینات کر رکھی تھی۔ اس تنگ و تاریک کال کوٹھڑی میں قید مرسل شاہ کی حالت عجیب تھی۔ رات اس کو نیند سے اٹھایا گیا تھا' اس لیے وہ ابھی تک شب خوابی کے پاجامے قمیص میں ملبوس تھا۔ بال بکھرے تھے اور دیوار کے قریب سکڑا بیٹھا تھا۔ یہ وہی قید خانہ تھا جہاں ایک زمانے میں ایڈم بن محمد کو قید کیا گیا تھا۔

خیر.... وقت وقت کی بات تھی۔

مرسل ناخن چباتے ہوئے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ جب اسے احساس ہوا سامنے کوئی کھڑا ہے۔ چونک کے سر اٹھایا تو دیکھا..... سلاخوں کے پار مراد راجہ کھڑا تھا۔ اکھی گردن' لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ' اور آنکھوں میں تپش۔ مراد کی شاہی پوشاک اور ماتھے کی پٹی سے لٹکتی سنہری زنجیریں بتاتی تھیں کہ وہ نئے سلطان کا بھی منظورِ نظر ہے۔

''مراد راجہ۔'' وہ غصے سے اٹھا اور سلاخوں کی طرف آیا۔ پھر انہیں پکڑ کے جھٹکا دیا اور مراد کو گھورا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ میں نے تمہیں دوست سمجھا تھا۔''

''اب بھی بہت لوگ مجھے دوست بنتے ہیں۔ خدا معلوم ان کا انجام کیا ہو گا۔'' مراد نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہاں سے نکالو مراد۔'' وہ سلاخوں کو پکڑے غصے اور بے چینی سے بولا تو مراد نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

''جانتے ہو تم ابھی تک زندہ کیوں ہو؟'' پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ''کیونکہ تم نے ہمیں بتانا ہے کہ یان سوفو کہاں ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم وہ عورت کہاں ہے۔'' وہ زچ ہو کے بولا۔ بکھرے بال' بے ترتیب حلیے والا مرسل سلاخیں پکڑے کھڑا عجیب بے بس سا لگتا تھا۔

''یان سوفو کو بغاوت سے پہلے تم نے کہاں بھیجا ہے۔ وہ ابھی تک ہمارے ہاتھ کیوں نہیں لگی۔''

''میں نے اسے کہیں نہیں بھیجا.... مجھے نہیں معلوم۔'' مرسل غصے سے کف اڑاتا اب زور زور سے مراد کو لعن طعن کرنے لگا تھا۔ مراد سپاٹ چہرے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''یان سوفو کی تلاش میں پوری سلطنت میں سپاہیوں کو دوڑایا گیا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ شاید مرسل نے اسے چین بھیج دیا ہے۔''

عارف کہتے ہوئے اس کے ساتھ قید خانے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ مراد نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''ہوں۔ مرسل نے اسے بھیجا ہے' یعنی مرسل کو بغاوت کا علم تھا؟ اگر ایسا تھا تو وہ خود کیوں نہیں بھاگا؟'' مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یان سوفو کو کسی اور نے بھیجا ہے۔ اسے بغاوت کی مخبری ہوگئی تھی۔ وہ مرسل کو چھوڑ کے پہلے ہی نکل گئی تاکہ اس کی جان بچ جائے....''

''یان سوفو ملکہ تھی۔ اس نے بغاوت کو بروقت کچلنے کے بجائے بھاگ جانے کو ترجیح کیوں دی؟'' عارف نے پوچھا تو آواز میں حیرت تھی۔

''اسے مرسل کی طاقت پہ بھروسا نہ رہا تھا۔ یا شاید اس نے ہماری بغاوت کو اس کے اصل قد سے بڑا سمجھا تھا۔ وہ ڈر گئی اور بھاگ گئی۔''

وہ دونوں اب محل کی راہداری میں آ گئے تھے۔ اونچی کھڑکیوں سے روشنی چھن کے اندر آ رہی تھی۔ مراد کمر پہ ہاتھ باندھے آگے چل رہا تھا اور عارف پیچھے۔ دفعتاً عارف اس کے برابر آیا اور سرگوشی میں بولا۔

''آدم نے آج صبح دوائی کھالی ہے' راجہ۔''

مراد نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''اس کی حالت کیسی ہے؟''

''میں صبح اس کے کمرے میں گیا تو وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ اور.....'' عارف خاموش ہوا تو مراد نے تیزی سے کہا۔ ''کیا' عارف؟''

''اس کے ہاتھ خراب ہونے لگے ہیں۔''

مراد نے سینے میں قید سانس آزاد کی اور سختی سے آنکھیں میچیں۔

''یعنی وہ کوڑھ سے مرے گا۔ اس ترکیب کے مضر اثرات میں کوڑھ کا مرض شامل تھا۔ تیزی سے پھیلتا کوڑھ جو اس کی جان لے لے گا۔''

راہداری میں ایک دم ویرانی سمٹ آئی۔ کھڑکی سے اندر آتی چیونٹیوں کی قطار گویا سہم کے دونوں کی گفتگو سننے لگی۔ مشعلوں نے اپنے شعلے افسوس سے نیچے کر لیے اور ہوا اپنا سانس روکے ساکت ہوگئی۔

''کتنی دیر لگے گی اس کو مرنے میں' راجہ؟''

''آج رات تک کوڑھ اس کے سارے جسم پہ پھیل جائے گا۔ وہ کل کا سورج نکلنے سے پہلے مر جائے گا۔'' مراد کا چہرہ سرد اور سپاٹ تھا۔

''شہزادی تاشہ کو آپ کیا کہیں گے؟ وہ بہت واویلا کریں گی۔'' عارف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''میرے پاس اس مسئلے کا حل موجود ہے' عارف۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔'' مراد نے ابرو اٹھائے اور مسکرایا۔

اس کے چہرے کی جھریاں اور آنکھوں کی چمک عارف کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

''ریڈی.... گیٹ سیٹ.... گو۔''

اپنی خواب گاہ میں سنگھار میز کے آئینے کے سامنے تالیہ بیٹھی تھی۔ کنیز اس کے بال بنا رہی تھی جب اس نے آنکھیں بند کر کے خود سے کہا۔ پھر کھنکھاری اور پیچھے کھڑی کنیزوں کو حکم جاری کیا۔

''آدم اب تک بیدار ہو چکا ہوگا۔ باغ سے

تازہ پھول توڑ کے لاؤ۔ ہر رنگ کے پھول۔ ہر خوشبو کے پھول۔ میں اس کے لیے گلدستہ خود بناؤں گی۔''
اس کے انداز میں محبت ہی محبت تھی۔

جب تک کنیز نے اس کے بالوں پہ سنہری کلپ لگایا' اور ہار کا کنڈا اس کی گردن کے پیچھے بند کیا' غلام اور کنیزیں پیچھے رکھی میز پہ پھولوں کا ڈھیر لگا چکے تھے۔

''بہت خوب۔ ہمیں آدم کا بھرپور طریقے سے استقبال کرنا ہے۔''

ہلکے نیلے کامدار باجو کرنگ میں ملبوس' کان میں ایک پھول اٹکائے کھڑی شہزادی اب مسکرا کے ٹہنیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اس نے خود گلدستہ بنایا' اسے باندھا اور پھر کنیزوں کی معیت میں کمرے سے نکلی۔

باغیچہ پار کیا تو دور دور تک پھیلے غلاموں اور خادموں نے دیکھا کہ شہزادی کتب خانے کی طرف جا رہی ہے جہاں شاہی مورخ بیمار پڑا ہے۔ اتنا تو سب جان چکے تھے کہ اس کا علاج شہزادی خود کروا رہی تھی اور شہزادی کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج وہ تندرست ہونے والا ہے۔

''ایڈم.... ایڈم!'' کھنکھار کے تالیہ نے ایک ہاتھ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دوسرے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر بستر نفاست سے بنا دکھائی دے رہا تھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے تھے اور.....
اور کمرہ خالی تھا۔

بستر سے یوں لگتا تھا یہاں رات کوئی سویا ہی نہیں ہے۔ ایڈم کی بیساکھی البتہ پلنگ کے ساتھ زمین پہ گری تھی۔

تالیہ کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ ''آدم کہاں ہے؟'' وہ تیزی سے اندر آئی۔ کمرے کے ہر کونے میں دیکھا۔ بستر کے نیچے۔ الماری کے اندر۔ کھڑکی سے باہر۔ ایڈم کہیں نہیں تھا۔

''مجھے آدم بن محمد ہر حال میں چاہیے۔ اس کو ڈھونڈ کے لاکر دو مجھے ابھی۔''
اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ غصے سے۔ پریشانی سے۔ اور وہ پہریداروں کو چلا چلا کے کہہ رہی تھی۔ گلدستہ اس کے ہاتھوں سے نیچے گر چکا تھا۔

مگر کسی کو نہیں معلوم تھا وہ کہاں تھا۔ اسے رات کمرے میں آتے سب نے دیکھا تھا۔ نکلتے نہیں۔ سپاہیوں کی دوڑیں لگ گئیں۔ سارے میں افراتفری مچ گئی۔

مگر ایڈم بن محمد کا سراغ کہیں نہیں ملا۔

بندا ہارا کے محل سے دور.... ایک عمارت تھی جسے خطرناک قیدیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں ایک تنہا' تنگ تاریک کوٹھڑی تھی۔ تین طرف دیواریں اور ایک طرف سلاخوں والا دروازہ۔

مراد اس کوٹھڑی کے باہر کھڑا تھا۔ عارف بھی ہمراہ تھا اور دونوں کی نظریں کوٹھڑی کے فرش پہ لیٹے ایڈم پہ جمی تھیں۔

اس کی آنکھیں بند تھیں اور بازو پہلو میں گرے تھے۔ بایاں ہاتھ سیاہی مائل ہو رہا تھا جیسے جلد گل سڑ گئی ہو۔

کوٹھڑی کے باہر ایک ہی مشعل روشن تھی۔ مدھم روشنی میں بس یہی دکھائی دیتا تھا کہ گلنے سڑنے کا عمل اس کے بائیں ہاتھ سے ہوتا ہوا گردن تک پہنچ گیا تھا۔ کرتے کے گلے سے جھانکتے کوڑھ سے اس کا چہرہ ابھی محفوظ تھا۔

''اس کو ابھی تک ہوش نہیں آیا؟''

''یہ غنودگی میں ہے۔ ابھی جاگا تھا۔ پھر غش کھا گیا۔''

عارف مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔ مراد آگے آیا اور سلاخوں کے پار پیچھے چت لیٹے ایڈم کو غور سے دیکھا۔

''آدم۔''

اس کی آنکھیں کھلیں۔ چند لمحے وہ چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے خواب میں کھویا انسان لمبی نیند سے اٹھتا ہے۔

وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ پھر گردن جھکا کے خود کو دیکھا۔ بائیں بازو پہ نظر پڑی تو آنکھیں خوف سے پھیلیں۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ اس نے جھٹکے سے

گردن اٹھائی اور مراد راجہ پہ نظر ٹھہری۔

مراد نے محسوس کیا کہ وہ مسلسل بایاں بازو اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کا بایاں بازو بے جان سا لگتا تھا۔ وہ پہلو میں زمین پہ گرا تھا۔

ایڈم بن محمد نے بے بسی سے مراد کو دیکھا۔

''میرا بازو.... اس میں درد بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے یہ محسوس کیوں نہیں ہو رہا' مراد راجہ؟'' اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

''مجھے افسوس ہے' آدم۔'' مراد نے بنا تاثر کے محض اتنا کہا۔ ایڈم نے دوسرے ہاتھ کے زور پہ اٹھنے کی کوشش کی مگر یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس میں اب اٹھنے کی سکت نہ رہی تھی

''میں نے دوا بالکل ٹھیک بنائی تھی۔ مگر..... کیا ترکیب غلط تھی؟'' ساتھ ہی بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں راجہ۔ آپ مجھے غلط ترکیب نہیں دے سکتے۔''

''میں نے کہا نا' مجھے افسوس ہے۔''

''آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' اس کی مراد پہ ٹھہری بے یقین آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

''تم اس بات پہ قناعت کیوں نہیں اختیار کر لیتے کہ تمہارے مقدر میں بس اتنا ہی تھا؟ تم عام سے نوجوان تھے۔ تمہارے مقدر نے تمہیں مہینوں تک محل میں رہنے دیا۔ امراء' وزرا اور سلطان کے ساتھ وقت گزارنے دیا۔ تمہاری لکھی کتاب صدیوں تک یاد رکھی جائے گی۔ اس سے زیادہ تم اپنے مقدر سے کیا چاہتے ہو؟''

''راجہ۔'' وہ اسے دیکھ کے رہ گیا۔ ''میرے ماں باپ..... وہ بوڑھے ہیں..... وہ اکیلے ہیں۔''

''تم اتنے برس ان کے ساتھ رہے۔ ان کی خدمت کی۔ وہ اپنے مقدر سے اس سے بڑھ کے کیا چاہتے ہیں؟'' مراد راجہ نے ساتھ ہی حیرت سے شانے بھی اچکائے تھے۔

''راجہ..... خدا کے لیے۔ مجھے ٹھیک کر دیں۔ کوئی دوا' کوئی جادو' کچھ تو ہوگا۔''

مگر مراد کمر پہ ہاتھ باندھے آگے بڑھ گیا۔

ایڈم بے قراری سے پیچھے سے چلایا۔

''مجھے بچے تالیہ سے ملنا ہے۔ ان کو میری خبر کر دیں۔ ان سے کہیں ایک دفعہ مجھ سے ملنے آجائیں۔''

وہ خود کو گھسیٹ کے سلاخوں کے قریب لانے لگا۔ مراد ان سنی کیے آگے بڑھ رہا تھا جب ایڈم نے وہاں کھڑے عارف سے التجا کی۔

''تم..... تم مجھے قلم کاغذ لا دو۔ میرا پیغام ان تک پہنچا دو۔'' پھر آواز دھیمی کی۔ ''وہ تمہیں اس کے بدلے میں انعام دیں گی۔ مال' سونا' جو تم کہو۔''

عارف نے استہزائیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ ''تم مجھے اپنے اس راجہ سے بددیانتی کرنے کا لالچ دے رہے ہو جو سلطان بننے والا ہے؟''

مراد نے پلٹ کے ایڈم کو دیکھا جو سلاخیں پکڑے بے بسی سے عارف کی منت کر رہا تھا۔

''یہ چند دن کا مہمان ہے' عارف۔ اسے خط لکھنے دو۔'' اور اسے اشارہ کیا۔ عارف نے استعجاب سے ابرو اکٹھے کیے مگر راجہ کا حکم حتمی تھا۔ اس نے بس ایک برہم نظر ایڈم پہ ڈالی اور راجہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ایڈم سلاخوں سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''اس کو قلم کاغذ دینا دانشمندی ہوگی' راجہ؟'' عارف ناخوش لگتا تھا۔

''وہ جو لکھے' اس کو میرے پاس لانا۔ ہم اس کی لکھائی کی نقل تیار کر کے اپنی مرضی کا خط شہزادی کو دے سکتے ہیں۔''

''اس کی لکھائی تو بنگارایا ملایو سے بھی مل جائے گی۔''

''مگر اس کتاب میں ذاتی نوعیت کی باتیں نہیں ہوں گی۔ کوئی لقب' کوئی فقرہ' جو صرف شہزادی جانتی ہو۔ ورنہ وہ کیسے یقین کرے گی کہ یہ خط آدم کا لکھا ہے؟''

وہ زینے چڑھتے آہستہ سے کہہ رہا تھا۔ ''اور

ہاں۔اس کی خوراک بند کر دو۔صرف پانی دو۔پانی اس کا مرض بگاڑے گا۔میں اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔''

عارف اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔وہ دونوں اب قید خانے سے دور نکل آئے تھے۔

☆☆☆

بند اہارا کے محل کے باغیچے میں تالیہ مراد اس وقت اضطرابی حالت میں ٹہلتی نظر آ رہی تھی۔انگلیاں مروڑتی' دائیں سے بائیں چکر کاٹتی وہ دانتوں سے نچلا لب زخمی کیے جا رہی تھی۔پسِ منظر میں قطار میں ہاتھ باندھے کھڑی کنیزیں اور غلام دکھائی دے رہے تھے جو سہمے کھڑے تھے۔صبح سے شہزادی چیخ چلا رہی تھی اور وہ نشانے پہ تھے۔

دفعتاً روش پہ دور سے آتا عارف دکھائی دیا تو ایک کنیز نے کھنکھار کے اسے اطلاع دی۔وہ چونکی اور اس طرف پلٹی۔پھر ماتھے پہ بل ڈالے عارف کو آواز دی۔وہ فوراً اس کی طرف آیا۔

''تم صبح سے کہاں تھے؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' اس کا ضبط کا دامن گویا چھوٹ گیا تھا۔غصے میں زور سے بولی تو عارف نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا' شہزادی؟''

''آدم کہاں ہے؟'' وہ کمر پہ ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔

''آج صبح تک تو یہیں تھا۔اب کہاں گیا؟ کتب خانے میں نہیں ہے کیا؟''

وہ چونکی۔''صبح؟ تم نے اسے صبح دیکھا تھا؟''

''جی' شہزادی۔وہ مراد راجہ کی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا۔'' عارف نے بظاہر یاد کر کے بتایا۔

''اس کے کندھے پہ ایک تھیلا بھی تھا۔''

''وہ....وہ ٹھیک تھا؟'' تالیہ نے بے قراری سے پوچھا۔وہ پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

''جی۔وہ بالکل ٹھیک تھا کیونکہ اس نے گزشتہ رات دوا پی لی تھی۔اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ظاہر ہے اس نے ٹھیک ہونا ہی تھا۔''

عارف کے الفاظ پہ پیچھے کھڑے غلاموں اور خادموں میں پرجوش سرگوشیوں کے تبادلے ہوئے۔ خود تالیہ کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔اس نے گہری سانس لی۔

''تو وہ تندرست نظر آ رہا تھا۔'' اس کا ہاتھ ابھی تک سینے پہ تھا۔چہرے کے تاثرات ذرا بہتر ہوئے مگر پھر وہ دوبارہ سے فکرمند ہوئی۔''وہ صبح بابا سے ملا۔پھر کہاں گیا؟''

''مجھے نہیں معلوم شہزادی' میں تو سیدھا سلطنت محل چلا گیا تھا۔آپ راجہ سے معلوم کر لیں۔'' وہ سادگی سے بتا رہا تھا۔

''اوہ۔اچھا۔'' وہ اب اطمینان سے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔چہرے کی رنگت بحال ہو رہی تھی۔

''میں جاؤں' شہزادی؟''

''ہاں۔نہیں۔ٹھہرو۔بابا کہاں ہیں؟''

''وہ سلطنت محل میں ہیں۔عشاء کے بعد آئیں گے۔آپ کہتی ہیں تو میں آپ کو وہیں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں۔میں ان کا انتظار کر لوں گی۔'' پھر وہ بڑبڑائی۔''وہ ٹھیک تھا' اتنا ہی کافی ہے۔''

اس کا ہاتھ ہنوز دل کے مقام پہ تھا۔اب وہ خود سے بڑبڑاتی پلٹ رہی تھی۔عارف نے اسے جاتے دیکھا اور سوچا....سب منصوبے کے مطابق جا رہا تھا۔ساری اداکاری' سارے کرتب' سب درست تھے۔

بہت جلد اس کی ان دوسری دنیا کے لوگوں سے جان چھوٹنے والی تھی۔اس کے بعد صرف وہ ہوگا۔مراد راجہ کا دایاں ہاتھ۔وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔

پھر چونکا۔اسے فوراً واپس جا کے مراد کو اس سارے واقعے کی اطلاع کرنی تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جویریہ مریم

قصہ کہانی لکھنے کا

وہ بڑے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھی۔ خیالات تواتر سے اتر رہے تھے۔ قلم بغیر رکے چلتا ہی جارہا تھا مگر معین کی آمد نے خلل ڈال دیا۔ ''یہ تمہیں صوفے کی ہتھی پر چڑھ کے ہی لکھنا ہوتا ہے کیا۔ محترمہ ثمن فیاض!'' وہ پھیل کے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ ''پلیز میرے لکھنے میں دخل مت دو۔ مجھے جلدی جلدی لکھ کے پوسٹ بھی کروانا ہے۔ پانچ تاریخ ہے صبح'' ثمن نے التجا کی تھی اور پھر سے رجسٹر پر جھک گئی۔ ''ارے چھوڑو بہنا! یہ فضول کام شائع تو ہونا نہیں ہے۔ پھر فائدہ اتنی محنت کرنے کا۔''

ثمن کو آگ لگ جاتی تھی معین کے ایسے جملے سن کر تمہیں شرم آنی چاہیے اتنے عظیم کام کو فضول کہتے ہوئے اور اچھی تحریروں کے لیے ادارے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ تم مجھے بدگمان نہ کیا کرو۔ سمجھے۔'' وہ غصے سے اسے گھورتی پھر رجسٹر پر جھک گئی۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم جو اور جتنا لکھ کے بھیج دو تمہیں منہ نہیں لگایا جائے گا میری پیاری بہنا! اس لیے میں آج ہی ٹشو خرید لاؤں گا۔ ڈھیر سارے۔'' معین کو مزا آرہا تھا اسے چڑانے میں معین تم منحوس باتیں کرنا بند نہیں کرسکتے۔ ثمن نے روہانسی ہوکر کہا تھا۔ ''ارے کیوں تنگ کررہے ہو بہن کو۔''

لاؤنج میں داخل ہوتیں دادو۔ ثمن کی التجا سن چکی تھیں۔ ''ارے ایک بہن ہے اسے بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیئے تم لوگ۔'' معین اس الزام پر تڑپ گیا تھا۔ ''دادو! آپ بھی ناں کمال کرتی ہیں۔ یہ آپ کی اکلوتی پوتی اپنے شوق میں صفحے سیاہ کرتی رہتی ہے اسے سمجھا رہا ہوں۔''

''ہیں؟؟ ثمن یہ کیا شوق پال لیا ہے تم نے۔ معین ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا!'' دادو سنگل صوفے پر بیٹھی اب اسے حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اپنا ایک پرانا غم یاد آیا تھا۔ اور ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ''دادو آپ بھی۔'' ثمن نے صدمے سے دادو کو دیکھا تھا۔ دیکھا میں صحیح کہہ رہا تھا ناں تم سے معین کی باچھیں چر گئیں۔

''ویسے بھی تم پڑوسیوں کی لڑائی لکھ رہی ہو۔ کہانی تو دوسرے لفظوں میں ایک سبق ہوتی ہے۔ اب ہمارے جنگجو پڑوسیوں کی لڑائی میں سبق کہاں سے آگیا۔'' وہ اسے چڑانی مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ثمن نے دانت پیسے تھے۔ ''تمہاری یہ باتیں مجھے زہر سے بھی زیادہ بری لگتی ہیں۔ اب تم ہی اتنے بے عقل ہو تو میں کیا کرسکتی ہوں۔ تمہاری زبان بند کرنے کی نیت سے وضاحت کررہی ہوں کہ اس لڑائی میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بات کا بتنگڑ بنا کر طوفان نہیں اٹھانا چاہیے بلکہ تحمل و برداشت سے کام لے کر درگزر کرنا چاہیے۔ تاکہ رشتوں میں دراڑیں نہ آئیں۔ گھر کوئی چڑیا کا گھونسلہ نہیں ہوتا۔ جو درخت سے گر کر بکھر گیا اور پھر سے اکٹھا کرکے درخت پر بنالیا

گیا۔ گھر بسانے کے لیے اپنے آپ کو مار کے رہنا پڑتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب ساری لغزشیں ختم ہو جاتی ہیں۔'' دادو نے حیرت سے اپنی پوتی کو گھورا تھا۔ پھر اپنی آنکھیں رگڑیں۔ معین بھی چپ ہو گیا تھا۔ ''اب مجھے لکھنے دیں۔ اور دادو! پلیز! آپ تو مخالف نہ ہوں۔ میرے شوق کی آپ تو خود بھی رسالے شوق سے پڑھتی رہی ہیں۔'' ثمن نے اس انداز سے کہا تھا کہ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

''ثمن بیٹا! پہلے میرا قصہ سن لو۔ پھر خود ہی فیصلہ کر لینا کہ لکھنا ہے یا نہیں۔ ویسے ایک بات میں بھی یقین سے کہتی ہوں کہ یہ مویاں (سوری) تمہاری کہانیاں تو دور کی بات خط بھی شائع نہیں کریں گی۔'' معین کی ہنسی نکلی تھی۔ ''دادو آپ کو خوش کر رہی ہیں۔'' ثمن نے احتجاج کیا دادو نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑیں اور معین کو گھورا وہ فوراً سنجیدہ ہو کے بیٹھ گیا۔ ''اچھا تو سنو۔'' دادی نے کسی منجھے ہوئے قصہ گو کی طرح انہیں اپنی طرف

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

متوجہ کیا تھا۔ وہ دونوں دل و جان سے متوجہ ہوئے تھے۔ ثمن صوفے کی ہتھی سے اتر کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے بھی ایک دفعہ لکھنے کا شوق چڑھا تھا۔ دادی نے کہنا شروع کیا۔ ''اوہ! معین نے حیرت سے دادو کو دیکھا تھا۔ ثمن خوش ہوئی تھی۔''

''اس وقت فیاض میرا بڑا بیٹا چودہ سال کا ہوگا۔ میں کہانیاں اور خطوط لکھ لکھ کے فیاض کو دیتی اور میرا بچہ ذمہ داری سے پوسٹ کر کے آتا۔ میں ہر مہینے کا رسالہ بڑی امید سے کھولتی مگر میری کہانیوں اور خطوط کا کہیں نام و نشان تک نہ ملتا۔ فیاض سے پوچھتی بیٹا پورے ٹکٹ لگوائے تھے ناں کہیں بغیر ٹکٹ کے لیٹر بکس میں تو نہیں گھسا آئے۔ سو خیال آتے دل میں فیاض مجھے یقین دلاتا کہ امی جان میں پوری ذمہ داری سے اچھے طریقے سے پوسٹ کر کے آیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں اگلے مہینے چھپ جائے گی آپ کی کہانی۔'' دادو نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ اسی وقت فیاض بھی آفس سے آگئے اور صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گئے سلام کر کے اور دھیان سے سننے لگے کہ کس موضوع پر بات کی جارہی ہے۔ ''پھر دادو۔'' ثمن بے تاب ہوئی جارہی تھی سننے کے لیے۔

''پھر کیا بیٹا۔ میں پورا مہینہ انتظار کی سولی پر لٹکی رہتی۔ اگلے مہینے کا رسالہ آتا اور میرا نام و نشان پھر ندارد، میں پھر خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ ناراضگیوں اور گلے شکووں سے بھرا خط لکھ کے فیاض کو دوڑائی پوسٹ کرنے کے لیے، میرا بچہ فوراً اپنا کھیل چھوڑ کر ڈاکخانہ جاتا۔ تھک گیا میرا بچہ چکر چکر لگا لگا کر مگر خط اور کہانیاں نہ شائع ہونے تھے نہ ہوئے۔ میں رسالہ کھول کر دیکھتی اپنا نام پھر نہ پا کر دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگتی۔ تمہارے دادا اتنا مذاق اڑاتے۔ میرا جینا دوبھر کر دیتے چڑا چڑا کر، خط نہ لگنے پر رو رہی ہے۔ کہانی نہ چھپنے پر رو رہی ہے۔ ارے ایک سال تک۔ میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا جاتا رہا۔ موئیوں (سوری) ذرا رحم نہ آیا مجھ پر نہ میرے بچے پر، تھک گیا میرا بچہ ڈاکخانے جا جا کر، دادی نے شفقت سے فیاض کو دیکھا تھا جو سر جھکائے سن رہے تھے۔ ایکدم کھنکار اٹھے۔ ''امی جان! میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اپنی نادانی میں کی گئی غلطی اور بے ایمانی کی۔'' معین اور ثمن نے چونک کر اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ دادو بھی حیران ہوئی تھیں ''کون سی غلطی بیٹا کیسی معافی'' وہ بول اٹھیں۔

''فیاض کا سر ندامت سے جھک سا گیا۔ امی جان! جو کہانیاں اور خطوط آپ مجھے پوسٹ کروانے لیے دیتی تھیں وہ میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہر میں پھینک دیتا تھا اور پیسوں کی چیز کھا لیتا تھا۔ مجھے معاف کردیں امی جان!''

دادو نے بے یقینی سے اپنے فرماں بردار بچے کو دیکھا تھا اور معین اور ثمن اپنی ہنسی روکنے کے چکروں میں بے حال ہوئے جارہے تھے۔

''مجھے معاف کردیں امی جان۔ مجھے آپ کے احساسات کا آج اندازہ ہوا ہے۔ میں تو بچہ تھا اس وقت گھر سے نکلتے ہی نیت خراب ہوجاتی تھی اور میں جلیبیاں اور نان پکوڑے کھا کر گھر آجاتا تھا۔ کہانیاں نہر میں پھینک دیتا ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔'' اب اتنا وقت گزر گیا فیاض! اب میں تمہیں کیا سزا دوں۔ اگر اسی وقت علم ہوجاتا تو وہ چھترول کرتی کہ عمر بھر یاد رکھتے۔ خیر اب زیادہ دل پر نہ لو۔ معاف کردیا۔'' دادی بے بسی سے بولیں۔ ''شکریہ امی جان!'' فیاض دھیرے سے کہہ کر اٹھ گئے اور کچن میں چلے گئے جہاں ان کی بیگم کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

''دادو! اب تو آپ میرے لکھنے پر پابندی نہیں لگائیں گی ناں۔'' ثمن نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ ''نہیں بیٹا لکھو لکھو۔ اور خود پوسٹ کر کے آنا معین کے ساتھ جا کر کہیں یہ بھی .....'' دادو بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئیں۔ معین تڑپ کے رہ گیا تھا اور ثمن قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

☆☆

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ　　ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن　　عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کسے الزام دوں میں رائیگاں ہونے کا اپنے
کہ سارے فیصلے میں نے کیے اپنی خوشی سے

ہر اک لمحہ مجھے رہتی ہے اک تازہ شکایت
کبھی تجھ سے، کبھی خود سے، کبھی اس زندگی سے

مجھے کل تک بہت خواہش تھی خود سے گفتگو کی
میں چھپتا پھر رہا ہوں آج اپنے آپ ہی سے

وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خامشی سے

جو چاہے وہ ستم مجھ پر روا رکھے یہ دنیا
مجھے یوں بھی توقع اب نہیں کچھ بھی کسی سے

ابھی عرفان کونپلوں کو بہت کچھ دیکھنا ہے
تمہیں بے رنگ کیوں لگنے لگا ہے سب ابھی سے

عرفان ستار

اپنی اپنی یہاں پہ ذات ہیں سب
میں سمجھتا تھا میرے ہاتھ ہیں سب

لوٹ کر خود بھی وہ نہیں آیا
وہ جو کہتا تھا تیرے ساتھ ہیں سب

یہ محبت، یہ روشنی، خوشبو
عمرِ رفتہ کے حادثات ہیں سب

میرا کردار ہی کہانی ہے
باقی کردار واقعات ہیں سب

کارِ آساں نہیں حیات مری
میرے حصّے میں سو مہمات ہیں سب

دل پہ مت لیجیے ارے ابرک
سانس تک ہی تو مشکلات ہیں سب

ابتاب ابرک

شبنم ہے کہ دھوکا ہے کہ جھرنا ہے کہ تم ہو
دل دشت میں اک پیاس تماشا ہے کہ تم ہو

اک لفظ میں بھٹکا ہوا شاعر ہے کہ میں ہوں
اک غیب سے آیا ہوا مصرع ہے کہ تم ہو

دروازہ بھی جیسے مری دھڑکن سے جڑا ہے
دستک ہی بتاتی ہے پرایا ہے کہ تم ہو

اک دھوپ سے الجھا ہوا سایہ ہے کہ میں ہوں
اک شام کے ہونے کا بھروسا ہے کہ تم ہو

میں ہوں بھی تو لگتا ہے کہ جیسے میں نہیں ہوں
تم ہو بھی نہیں اور یہ لگتا ہے کہ تم ہو

احمد سلمان

جاگتی رات کا وہم

رات جاگی تو کہیں صحن میں سوکھے پتے
چرمرائے کہ کوئی آیا ہے، کوئی آیا ہے
اور ہم شوق کے مارے ہوئے دوڑے آئے
گو کہ معلوم ہے نہ تو ہے نہ تیرا سایہ ہے
ہم کہ دیکھیں کبھی دالان، کبھی سوکھا چمن
اس پہ دھیمی سی تمنا کہ پکارے جائیں
پھر سے ایک بار تیری خواب سی آنکھیں دیکھیں
پھر تیرے ہجر کے ہاتھوں ہی بھلے مارے جائیں
ہم تجھے اپنی صداؤں میں بسانے والے
اتنا چیخیں کہ تیرے وہم لپٹ کر روئیں
پر تیرے وہم بھی تیری ہی طرح قاتل ہیں
سو وہی درد ہے جاناں کہو کیسے سوئیں
بس اسی کرب کے پہلو میں گزارے ہیں پہر
بس یوں ہی غم کبھی کانی کبھی تھوڑے آئے
پھر اچانک کسی لمحے میں جو چٹخے پتے
ہم وہی شوق کے مارے دوڑے آئے

شگفتہ جاہ

رنگارنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک گھر کو آگ لگ گئی جبکہ گھر والے گھر میں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حادثے کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ آگ تمہاری دشمن ہے۔ جب تم سونے لگو تو اسے بجھا دیا کرو۔"

پانی،

پانی پینے کے صحیح اوقات جب وہ جسم پر بہتر انداز میں اثر انداز کرتا ہے۔

1۔ ایک گلاس صبح اٹھنے کے بعد، اندرونی اعضاء کو متحرک کرتا ہے۔

2۔ ایک گلاس نہانے کے بعد، خون کے پریشر کو کم کرتا ہے۔

3۔ دو گلاس کھانا کھانے کے آدھے گھنٹے پہلے، ہاضمے کو بہتر کرتا ہے۔

4۔ آدھا گلاس سونے سے پہلے، ہارٹ اٹیک اور دماغی امراض سے بچاؤ میں مدد کرتا ہے۔

شکر ہے،

لندن میں نسلی فسادات زوروں پر تھے۔ موتی سنگھ اور شیر سنگھ کو ایک سنسان علاقے میں تین گورے غنڈوں نے روک لیا۔ اور مار مار کر انہیں ادھ موا کر دیا اور ان کی جیبوں کا بھی صفایا کر دیا۔ لیٹرے چلے گئے تو شیر سنگھ نے کراہ کر موتی سنگھ سے کہا۔

"شکر ہے ان ظالموں کی نظر میری بیلٹ میں چھپے ہوئے ریوالور پر نہیں پڑی۔ اگر وہ ریوالور دیکھ لیتے تو ہم دونوں کو ہمارے ہی ریوالور سے ختم کر دیتے۔"

اس پر موتی سنگھ کو بہت غصہ آیا اور بولا۔

"جب تیرے پاس ریوالور تھا تو تو نے انہیں گولیاں کیوں نہیں مار دیں؟"

"ارے! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آؤ! انہیں اب ڈھونڈتے ہیں۔"

ستم ظریفی،

ایک سنسان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک شخص کو روکا اور کہا۔

"کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟"

وہ صاحب بولے "ضرور ضرور مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ ٹاس کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بٹوا لے گا۔"

احتیاط،

آفس سے تھکی ہاری خاتون چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہوئی۔ سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں موند کر تھوڑا سا ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی بس چلی ہی تھی کہ اگلی قطار میں بیٹھے ایک صاحب نے اپنا موبائل نکالا اور اونچی آواز میں

گفتگو شروع کر دی۔ ان کی گفتگو کچھ اس طرح سے تھی۔

"جان! میں کامران بول رہا ہوں۔ بس میں بیٹھ گیا ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں۔ ہاں ہاں مجھے پتا ہے کہ سات بج رہے ہیں پانچ نہیں۔ بس ذرا آفس میں کام زیادہ تھا اس لیے دیر ہو گئی۔"

"نہیں جان، میں شبنم کے ساتھ نہیں تھا۔ میں تو باس کے ساتھ میٹنگ میں تھا۔"

"نہیں جان! تم ہی میری زندگی ہو، ہاں قسم سے۔"

اس اونچی آواز میں گفتگو سے خاتون کا سارا ریلیکس کرنے کا پروگرام غارت ہو چکا تھا اور وہ بہت اَن ایزی محسوس کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد تک بھی جب یہ سلسلہ جاری رہا تو خاتون کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اٹھی اور فون کے پاس جا کر زور سے بولی۔

"کامران ڈارلنگ! فون بند کرو، بہت ہو چکا۔ اس پاگل عورت کو کتنی صفائیاں دو گے۔"

اب کامران صاحب اسپتال سے واپس آ چکے ہیں لیکن پبلک مقامات پر انہوں نے موبائل فون کا استعمال مکمل طور پر بند کر دیا ہے۔

سانجھے کاروبار کا گُر

میں ایک ایسی کاروباری فیملی کو جانتا ہوں جو چار بھائی ہیں اور اب تین بھتیجے بھی بزنس میں شامل ہیں۔ ٹریڈنگ کے علاوہ دو ملوں کے مالک بھی ہیں۔ گھر الگ الگ مگر کاروبار سانجھے کا ہے۔ ان کے گھریلو اور کاروباری امن و امان پر لوگ رشک کرتے ہیں۔ بڑے بھائی سے بے تکلفی زیادہ ہے۔ چنانچہ ایک روز ہر سو پھیلی اس آشتی کا راز پوچھ ہی لیا۔ بولے۔

"ہم نے آج تک اپنی بیوی سے اپنے بزنس کی کوئی بات نہیں کی۔ یقین نہیں تو تمہاری بھابھی کو بلوائے دیتا ہوں۔"

نیک بخت آئیں، تو میں نے ان سے تصدیق چاہی، بولیں۔

"تمہارے بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ نہ انہوں نے کبھی بتایا نہ ہم نے کبھی پوچھا۔"

جلی ہوئی روٹی

بچپن کی باتیں انسان پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ بعض اوقات اس کا پورا مزاج بنا دیتی ہیں۔ بھارت کے مرحوم صدر جو اسی سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی میں جہاں بھی رہے، جس عہدے پر بھی رہے، انہوں نے کبھی کھانے میں نقص نہیں نکالا۔ جو ملا خاموشی سے کھا لیا۔

اس کے پیچھے ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ جب وہ چھوٹے تھے اور ان کا خاندان کافی بڑا تھا۔ سارے کاموں کے ساتھ ساتھ روٹی پکانے کی ذمہ داری بھی ان کی ماں کی تھی۔ ایک دن وہ روٹی پکا رہی تھیں کہ ایک روٹی جل گئی۔ ماں نے وہ روٹی اپنے لیے رکھ لی۔ ان کے باپ نے جب وہ روٹی اپنی بیوی سے مانگی تو انہوں نے منع کر دیا کہ وہ ان کے لیے دوسری روٹی پکا رہی ہیں۔ لیکن شوہر نے زبردستی یہ کہہ کر کہ مجھے جلی ہوئی روٹی پسند ہے، وہ روٹی لے لی۔ جب سب کھانا کھا کر اپنے بستروں پر سونے چلے گئے تو عبدالکلام نے اپنے باپ کے پاس جا کر چپکے سے پوچھا۔

"کیا واقعی آپ کو جلی ہوئی روٹی پسند ہے؟"

والد نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا! جلی ہوئی روٹی کس کو پسند ہو سکتی ہے؟"

عبدالکلام نے اپنے والد سے پوچھا۔

"پھر آپ نے ماں سے جھوٹ کیوں بولا؟"

اس پر والد نے مسکرا کر بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تمہاری ماں سارا دن کام کرتی ہیں۔ ہمیں اچھا کھانا پکا کر کھلاتی ہیں۔ میں نے اس کے ہاتھ کی پکی سینکڑوں روٹیاں کھائی ہیں۔ اگر ایک دن جلی ہوئی روٹی کھا لی تو کیا ہوا؟ یہ روٹی اگر میں نہ کھاتا تو تمہاری ماں کھاتی اور مجھے یہ منظور نہیں تھا۔"

عبدالکلام اپنے والد کی یہ بات کبھی فراموش نہ کر سکے۔

(کاش مردانگی کے زعم میں مبتلا کھانا اٹھا کر پھینکنے والے مرد اس واقعے سے سبق سیکھیں)

موتی مالا ،

☆ دولت کھاد کی مثال ہے۔ جب تک اسے پھیلایا اور تقسیم نہ کیا جائے، فائدہ نہیں دیتی۔
(بیکن)

☆ جس دماغ میں اپنے سوا کوئی گنجائش نہ ہو تو اس میں بھلا کوئی اور چیز کس طرح سما سکتی ہے۔
(چیوبرٹ)

☆ ہم میں سے اکثر خاموشی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں لیکن اس بات سے بہت کم آگاہ ہیں کہ خاموشی کب اختیار کرنی چاہیے۔
(آسکر وائلڈ)

☆ دولت ہونے سے آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور دولت نہ ہونے سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔ (والٹیئر)

ملیحہ طاہر۔ جہیراں

بے تکلف ،

چیونٹے زیادہ تر ناراض رہتے ہیں۔ ادھر سے ادھر بے قرار پھرتے ہیں۔ اس لیے ان سے گفتگو کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی۔

ایک تیز طرار چیونٹی نے ہمت کر کے ایک چیونٹے سے پوچھا۔

"چیونٹے چیونٹے! تیرا سر اتنا بڑا کیوں ہے؟"

چیونٹے میاں اپنے متعلق سوال سن کر ذرا دیر کو رکے اور غرور سے جواب دیا۔

"سر بڑا سردار کا۔"

چیونٹی کو حوصلہ ہوا۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

"اور یہ کمر کیوں اتنی پتلی ہے؟"

"نازنینوں کی طرح جو ہے۔"

"اچھا ٹانگیں کیوں اتنی پتلی ہیں؟"

چیونٹے نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہرن کی خصوصیت ہے مجھ میں۔"

چیونٹی نے مرعوب ہو کر ذرا بے تکلفی سے پوچھا۔

"لیکن یہ پچھلا حصہ اتنا بڑا کیوں ہے؟"

چیونٹے میاں نے سخت ناراض ہو کر چیونٹی کو دیکھا اور اپنی سابقہ اکڑ اور غرور سے کہا۔

"جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو، مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کرو۔"

پانچ منٹ کے لیے ،

☆ اگر زمین سے پانچ منٹ کے لیے آکسیجن ختم کر دی جائے تو کیا ہو سکتا ہے؟

☆ تمام سمندروں سے پانی ختم ہو جائے گا کیونکہ آکسیجن کے بعد اس میں صرف ہائیڈروجن باقی رہ جائے گی۔

☆ ہم سب کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے کیونکہ ہم ہوا کا اکیس فیصد دباؤ کھو دیں گے۔

☆ زمین کھردری ہو جائے گی کیونکہ زمین کا پینتالیس فیصد حصہ آکسیجن سے بنا ہے۔ آکسیجن کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

نمرہ۔ کراچی

تاج بیگم ،

شہاب الدین شاہ جہان کی ماں کا نام تاج بیگم المشہور جگت گسائیں تھا۔ وہ اپنی دانشمندی خوش بیانی اور حاضر جوابی میں مشہور تھی۔ تاج بیگم موٹا راجا اودے کی چہیتی بیٹی تھی۔ تاج بیگم کی وفات شاہ جہاں کے والد جہانگیر ہی کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ اس لیے شاہ جہاں اپنی بادشاہت کے زمانے میں اپنی ماں کی سرپرستی سے محروم رہا لیکن شاہ جہاں نے اپنی حکومت میں اپنی ماں کا لقب "بلقیس مکانی" رکھا۔

فضہ بلال۔ کراچی

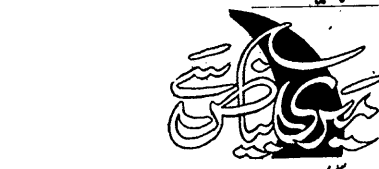

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

فائزہ بھٹی ــــــــ پتوکی

ذکر کرتی تھی ہر جگہ تیرا
ہم نے خوشبو کے کان کھینچے ہیں

زرینہ خانم لغاری ــــــــ مظفر گڑھ

خوب ہے یہ شوق کا پہلو بھی
میں بھی برباد ہو گیا تو بھی!

اقصیٰ ناصر ــــــــ گلستان جوہر

جو موت سے نہ ڈرتا تھا وہ بچوں سے ڈر گیا
ایک رات خالی ہاتھ جب مزدور گھر گیا

اقرا عزیز ــــــــ گاؤں دریا خان جلبانی

ہو لے کے دوش پر اب تک دہائی دیتی ہیں
پرانی دستکیں اب تک سنائی دیتی ہیں

عذرا ناصر ــــــــ کراچی

خدا کرے تجھے تاحیات میری کمی رہے
خدا کرے تیری عمر بہت دراز ہو

نسیم اسحاق انجم ــــــــ کنگن پور

طے کیا ہے تو کر ہی جاتا ہے
دل تو حد سے گزر ہی جاتا ہے

ثوبیہ شہزادی ــــــــ کھڈیاں خاص

بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کر کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
ایک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وفاداروں کو خفا سوچ کے کرنا

فاطمہ سہیل ــــــــ ٹیکسلا

میری زندگی کا یہ طویل سفر گراں
الٰہی میں تیرا بندہ ہوں ناتواں
لکھ دے تقدیر میں میرا طبیب حاذق
تو خوب جانتا ہے میرے درد کا درماں

سیدہ بخاری ــــــــ فاضل شاہ

ہم جیت بھی سکتے تھے اس عشق کی بازی کو
وہ جیت کے کتنے خوش ہوں گے یہ سوچ کر ہار گئے

نور فاطمہ ــــــــ میاں چنوں

احباب بنے پھرتے تھے لوگ ہر طرف
ضرورت پڑی تو کوئی بھی کام نہیں آیا

قصہ بلال ــــــــ کراچی

وفا کا درس ملتا ہے تو بس ان کی پاک ہستی سے
جنہیں عرشِ معلیٰ پہ بھی امت یاد رہتی ہے

حرا ملک ــــــــ وہاڑی

خدا کرے کہ تجھے میں بھی منتظر نہ ملوں
تو میرے پاس جو اس بار لوٹ کر آئے

سعدیہ عرفان ــــــــ شریف آباد

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا

ثمرہ، اقرا ــــــــ کراچی

تیرے روکے سے وہ بدعہد کہاں رکتا ہے
پاؤں چھونے سے تو بہتر ہے اسے جانے دے

عائشہ، تحریم ــــــــ فیصل آباد

بہت مجبور آنکھیں تھیں، بہت بے ربط جملے تھے
ضرورت کو بیاں کرنے سے اک خوددار قاصر تھا

غنساء طاہر ــــــــ ڈیرہ اسماعیل خان

خیالِ یار کی رنگینیوں میں گم ہو کر
جمالِ یار کی عظمت نکھار دی ہم نے
اسے نہ جیت سکے گا اب غمِ زمانہ
جو کائنات ترے در پہ ہار دی ہم نے

شکیلہ نثار ــــــــ فاروق آباد

کیا خبر تھی کبھی چلے گی ایسی بھی ہوا وصی
خشک پتوں کی طرح سب دوست بکھر جائیں گے

کوثر خالد سودا ــــــــ جڑانوالہ

مرے تخیل کے شہر سارے سلگ رہے ہیں
مری نظر میں یہ کیسا مقتل سجا ہوا ہے
مرے خدایا مجھے یہ کیسا کمال بخشا
محبتوں میں وجود ایندھن بنا ہوا ہے

امت الصبور

خاتونوں کی ڈائری

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

کبھی کبھی زندگی کی دشوار راہوں پر چلتے چلتے یوں ہی کوئی یاد ماضی کے بند دریچوں کو کھول دیتی ہے اور ایک کسک دے جاتی ہے۔ دل کی ڈور سے بندھے ان بچھڑے ہوئے لوگوں کی یاد سے دل کا آنگن مہک اٹھتا ہے۔ گلزار کی یہ غزل بھی انہی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے

خوشبو جیسے لوگ ملے افسانے میں
ایک پرانا خط کھولا، انجانے میں

شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں

رات گزرتے شاید تھوڑا وقت لگے
دھوپ انڈیلو تھوڑی سی پیمانے میں

جانے کس کا ذکر ہے اس افسانے میں
درد مرے لیتا ہے، جو دہراتے میں

دل پر دستک دینے کون آ نکلا ہے
کس کی آہٹ سنتا ہوں، ویرانے میں

ہم اس موڑ سے اٹھ کر اگلے موڑ چلے
ان کو شاید عمر لگے گی آنے میں

حمدہ خان کی ڈائری سے

احمد فراز کی شاعری میں رومان اور انقلاب کا جو امتزاج ہے، وہ مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ ایک باکمال سراٹھا کر جینے والوں کی شان اور کمال درجہ کی محبوبیت اور احساس جمال بھی۔ ان کی یہ نظم آپ سب کی نذر کر رہی ہوں۔

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی
نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی
محبتوں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

وہ قربتیں، وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں
اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں

شبنم حسین کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر شبنم شکیل کی یہ غزل سب قارئین کے لیے

چلتے رہے تو کون سا اپنا کمال تھا
ایسا سفر تھا جس میں ٹھہرنا محال تھا

آپہنچی فیصلے کی گھڑی پر نہ کھل سکا
جینا تھا سہل یا مجھے مرنا محال تھا

رہتی تھی اس میں آٹھوں پہر اک چہل پہل
رونق میں دل کا شہر کبھی بے مثال تھا

میں خود میں گم تھی پر مجھے اپنی خبر نہ تھی
دیکھا جو آئینہ تو عجب میرا حال تھا

آخر شکستِ دل میرا اعزاز بن گئی
باعث میرے عروج کا میرا زوال تھا

دانیہ عقیل کی ڈائری سے

عثمان صدیقی ان چند شعراء میں سے ہیں جو زندگی کی تلخیوں سے گزرنے کے باوجود غزل کی رنگینی کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی یہ غزل آپ کی نذر کر رہی ہوں۔

دیکھتے دیکھتے گزرے ہیں زمانے کتنے
زندگی کرنے کو پالے ہیں بہانے کتنے

کیا بیاں کرتے: جو کرتے بھی تو کیا حاصل تھا
کیسے بتلائیں زباں پر تھے فسانے کتنے

ہم جو محفل سے اُٹھے، کوئی نظر بھی نہ اُٹھی
وہ بگڑ کر جو اُٹھے، دوڑے منانے کتنے

کوئی تعبیر کسی خواب کی پائی نہ کبھی
خواب دیکھتے تھے محبت میں سہانے کتنے

ہم تو اُٹھ آئے کہ اندر تھا اپنے رنگ
آ گئے بزم میں پھر رنگ جمانے کتنے

کسی منزل کا پتا تھا نہ کوئی منزل تھی
گم کردہ رہ چلے راہ دکھانے کتنے

ثمرہ، اقراء کی ڈائری سے

کیسے بتائیں ہجر کی ساعت کتنی بھاری تھی
تین سو پینسٹھ دنوں سے لمبی رات گزاری تھی

رات اچانک ہی نہیں کچھ پر دلنے دکھ ہوئے
اصل میں یہ کیفیت اُن پر شام سے طاری تھی

ہم نے تو جب بھی ذکر کیا ہے شہر سے جانے کا
اُدھر جواب میں لمبی چپ یا گریہ و زاری تھی

کئی برس تک رات کی اُنگلی تھام کے پھرا کیے
کبھی نہ اُس نے ہاتھ چھڑایا، ایسی یاری تھی

جہاں پہ اکثر لگ جاتی ہے بازی سانسوں کی
اُسی جوا خانے میں ہم نے زندگی ہاری تھی

ٹھنڈی میٹھی ایک بھی شام اس در سے ملی نہیں
جلتی جوانی ہم نے جس دہلیز پہ واری تھی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

دستِ مسیحا
نگہت سیما
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

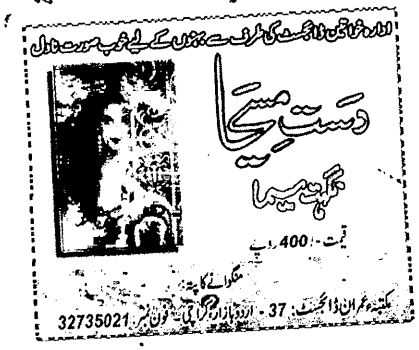

بقیہ خط آپ کے

10 اگست 2020ء کو اگست کا شمارہ ملا، ٹائیٹل بے حد پسند آیا۔ آپ نے میرا خط شامل کر کے مجھے بے پناہ خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔

سب سے پہلے حسن کو بتایا۔ وہ تو اپنا نام اور اپنی باتیں پڑھ کر اتنا خوش ہوا۔ اپنی ٹیوشن ٹیچر کے پاس لے کر گیا، انہیں تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں نے خط بھیجا اور وہ شامل بھی ہوگیا۔ خود میری بڑی بہنیں، بھانجیاں، بھتیجی۔ ''کرن'' دوستیں حیران ہوتی ہیں اور خوش بھی اور میری بڑی باجی کی دیورانی ہیں، ان کے بھی چار بچے ہیں وہ بھی میری طرح اسی ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں بقرعید پر پی وی چینل سے فلم ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ ٹائیٹل پر فرحت اشتیاق کا نام دیکھ کر بے پناہ خوشی ہوئی۔

مجھے آج بھی یاد ہے، سب سے پہلے خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے ناول (رفعت سراج کے) پر ڈرامہ سیریل ''تاوان'' بنا تھا۔ (آپی رفعت سراج نے ہی لکھا تھا نا؟ اف یہ یادداشت؟) پھر شام سے پہلے نگہت عبداللہ۔ میری ذات ذرہ بے نشان، عمیرہ احمد اور پھر تو ایک کے بعد ایک لائن لگ گئی اور اب تو ماشاءاللہ فلم کی اسٹوری بھی ہماری ڈائجسٹ رائٹرز لکھ رہی ہیں۔ فرحت بھی اب جلدی سے خواتین ڈائجسٹ کے لیے بہت زبردست سا ناول لکھیں وہ بھی سلسلے وار لمبا سا ہماری نمرہ احمد کی طرح۔

میری دعا اور شدت سے خواہش ہے اللہ تعالیٰ حسن کو ایک فوجی سپاہی بنائے، ابھی سے میں نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے وہ ٹریننگ کی سختیاں برداشت نہیں کر پائے گا، حذیفہ کے لیے شدت سے یہی خواہش ہے اللہ تعالیٰ اسے حافظ قرآن اور عالم دین بنائے۔

اگست کے شمارے میں ''حالم'' میں تالیہ نے جو شرائط رکھیں وہ بے حد دلچسپ تھیں۔ ایڈم کی بیماری سے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس قسط میں نجانے کیوں ایسا لگا ایڈم بچ نہیں پائے گا۔ دوا غلط بن جائے گی۔

عفت سحر کا ''رنگ ریز میرے'' اسی طرح قدم جما جما کر چل رہا ہے جیسے ''شہرزاد''۔

''تلی جیسا پیاز'' دلچسپ موڑ پر آ گیا ہے۔ سیماب بھی صائم کو پسند کرنے لگی ہے اور زوبار یہ سامنے آنے والی ہے۔ دیکھتے ہیں، آگے کیا ہوتا ہے۔ آپی ویسے کسی نے پوچھا نہیں زوبار یہ اور صائم سے، انہوں نے نکاح کیا تھا یا نہیں اور نکاح نامہ پھاڑنے سے نکاح تو نہیں ٹوٹتا۔ زوبار یہ آج بھی صائم کی منکوحہ ہے پھر اس کی شادی کسی اور سے کیسے ہوسکتی ہے؟

فرزانہ کھرل کا مکمل ناول اجنبی کون ہو تم نے اپنا سابقہ ریکارڈ توڑ دیا۔ وجہ ناول کا آسانی سے سمجھ میں آ جانا ہے۔ زیان کی نارسائی کا دکھ ہے تو آیت کے کردار نے عورت کے کردار کی مضبوطی پر فخر بڑھا دیا، بحیثیت ماں کے آیت کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔

آپی آپ نے مجھے کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیا تھا میری دوستیں اور بہنیں بھی کہتی تھیں مگر مجھے کہانیاں لکھنی نہیں آتیں۔ میری خوشی کے لیے تو یہی خط، سروے سلسلے کافی ہیں۔

حسن کہہ رہا ہے، میرے پاپا کا بھی لکھو۔ ان کا نام محمد آصف عرف اشفاق ہے۔ پان کی شاپ پر کام کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر حیدرآباد کے رہنے والے ہیں مگر پچھلے بیس سالوں سے کراچی میں ہی ہیں۔ اگر یہ مجھے پڑھنے سے روکتے تو میں شاید خط بھی نہیں لکھ پاتی۔

ج: پیاری فرزانہ! ہماری دعا ہے کہ حسن آپ کی خواہش کے مطابق فوج میں جائے۔ محنت تو ہر کام اور ہر پروفیشن میں ہی کرنا پڑتی ہے لیکن تنخواہ اور مراعات کے لحاظ سے فوج بہترین پروفیشن ہے۔ بہت ساری مراعات اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، بھاری بھرکم تنخواہ کے ساتھ پلاٹ اور اچھی رہائش ملتی ہے۔ لیکن ایک مشورہ ضرور دیں گے کہ آپ ابھی خود یہ طے نہ کریں کہ آپ کے بچوں کو کیا بننا ہے۔ فی الحال ان کی تعلیم اور انہیں اچھا انسان بنانے پر توجہ دیں پھر ان کے رجحان کے مطابق فیصلہ کریں۔ اسی طرح اگر آپ کے چھوٹے بیٹے کا حافظہ اچھا ہے تو اسے حافظ قرآن بنائیں۔ حافظہ اور ذہانت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر حافظہ اچھا نہ ہو تو قرآن پاک حفظ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ دینی تعلیم ضرور دلوائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی ضروری ہے۔

حمیرا گل ..... ملتان

پچھلے ماہ حاضری نہیں دے پائی۔ اس لیے اس بار دونوں مہینوں کی تحریروں پر تبصرہ۔ دوستوں کے خطوط پڑھنے کے بعد سب سے پہلے عندلیب زہرا کی ''پارلر والی لڑکی'' پڑھا، اچھا لکھا ویری گڈ۔ حمیرا عروش کی تحریر ''میری راج دلاری'' بھی اچھی لگی۔ نعیمہ ناز سلطان نے اظہار کیوں نہیں کرتیں، میں نفسیاتی گتھیاں سلجھائیں، اچھی لگیں۔ عنبرین ابدال کی ''شریک سفر'' سے میں پوری طرح اتفاق نہیں کر پا رہی۔ شریک حیات سے دوسروں کے سامنے یہ سوال کرنا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں وغیرہ زرا چھچھورا پنا ہے۔ مریم عزیز کا ناول ''اے دل بے خبر'' اچھا لگا۔ ثمائلہ دالعباد کی تحریر ''ہجر زادہ'' میں بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ ویلڈن۔ شازیہ جمال طارق کی ''یہ راستہ کوئی اور ہے'' اچھے موضوع پر لکھی گئی تحریر تھی۔ نعیمہ ناز سلطان کا ''ہنستے ہنستے'' ہلکے پھلکے انداز میں لکھا گیا ناول تھا اچھا لگا۔ زوبی ظفر شیخ کی ''راجدھانی'' کا ٹاپک تھوڑا عجیب لگا کیونکہ ماں بیٹی میں تیرا میری نہیں ہوتی۔

فریدہ گوہر نے ''چاندرات'' بہت اچھا لکھا۔ نائس اسٹوری۔ کفایت شعاری کا سبق دیتی شازیہ الطاف ہاشمی کی تحریر ''دھوپ'' بھی خوب رہی۔ صدف آصف کی ''بدگمان'' بھی اچھی رہی۔ حنا بشری کی ''بیل'' بھی اچھی رہی ''نفسیاتی الجھنوں'' میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھے مشورے دیے گئے۔

ج: پیاری حمیرا! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے، اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

مسز نسیم جہاں ..... راولپنڈی

اس بار بڑی عید پر مزے مزے کے کھانے کھائے ہوں گے۔ پر ہمیں کسی نے یاد نہیں کیا۔ کراچی والے بے وفا ہوتے ہیں۔ خواتین کا ہر شمارہ خوب خوب تر رنگینیاں سجائے جلوہ گر ہوتا ہے اب اس شمارے کو خوب صورت اور دلچسپ بنانے میں آپ کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ آپ سب بہنوں کا خیال رکھتی ہیں لیکن آپ نے میری خواہش پوری نہیں کی، ادب کی شہزادی پروین شاکر کی تصویر کو سرورق کی زینت بنایئے اور کوئی خاص نمبر شائع کریں جس میں۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، رضیہ بٹ کی تحریریں اور افسانے شامل ہوں۔ میری نواسی کی خواہش ہے کہ اس کو پاکستان کی پائلٹ محترمہ کیپٹن شہناز لغاری کا ایک آٹوگراف تصویر چاہیے تاکہ وہ اپنی البم میں لگائے۔

ج: بہن نسیم! کراچی والے ہرگز بے وفا نہیں ہوتے۔ آزمائش شرط ہے۔ بغیر آزمائے فیصلہ نہ کریں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ کی کہانیاں متعدد بار مختلف پرچوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے بھی دستیاب ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مصنفین کی کہانیاں ہمارے پرچے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ آٹوگراف اور تصویر کی فرمائش ہم شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

کلی چشتی ..... میاں چنوں

خواتین تب سے پڑھ رہی ہوں جب لفظوں کا مطلب بھی نہیں آتا تھا۔ اگست کا رسالہ بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر ''حالم'' تو رسالے کی جان ہے۔ ''ہنستے ہنستے'' اس طرح کا ایک ناول بہت پہلے بھی پڑھا تھا۔

افسانے بہت اچھے تھے، خاص کر بیل اور یہ راستہ کوئی اور ہے۔ عطیہ بتول کے باورچی خانے میں میٹھا بہت مزے کا لگا اور بنا بھی لیا۔

ج: پیاری کلی! بہت خوشی ہوئی آپ نے ہمیں خط لکھا۔ آپ نے ہمیں پینسل سے خط لکھا ہے۔ جس کی بنا پر ہمیں خط پڑھنے میں بہت دشواری ہوئی۔ آئندہ پین سے خط لکھیں۔ غزل کے لیے معذرت۔

حمیرا شفیع ..... صادق آباد

اگست کا خواتین ملا، دیدہ زیب پیرہن میں ملبوس خوب صورت ماڈل نہایت پیاری لگی۔ خاص طور پر انگوٹھیوں نے بہت متاثر کیا۔

مدیر صاحب نے قربانی کے فلسفے کو نہایت عمدہ طریقے سے واضح کیا۔ شاہین آپی نے اس بار سلمان سعید اور حرا نور سے ملاقات کروائی۔

''عید آئی ہے'' میں صدف ناصر کے گوشت کے پکوڑے بہت لطف دے گئے۔ ''ہمارے نام'' میں سیدہ

بخاری اینڈ بخاری سسٹرز کو میری طرف سے بھی ان کے والد محترم کی وفات پر افسوس کا پیغام پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے والد کی مغفرت فرمائے۔ آمین

''تتلی جیسا پیار'' میں راحت آپی نے صائم، زیبی اور سیماب کی ایک تکون سی بنا دی ہے۔ ''یہ راستہ کوئی اور ہے'' شازیہ جمال کا افسانہ اچھا لگا۔ نعیمہ آپی کا ناول ''ہنستے ہنستے'' گھریلو ماحول، خوب صورت منظر نگاری بہت مزا آیا پڑھ کر۔

''راج دھانی'' زوبی ظفر کی اچھی کوشش تھی۔ بچیوں کو چاہیے کہ وہ ماؤں کی روک ٹوک کا بالکل بھی برا نہ مانا کریں۔ اس میں بھی ان کا پیار ہی چھپا ہوا ہوتا ہے۔

''اجنبی کون ہو تم'' فرزانہ کھرل نے ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد انداز میں اچھا لکھا۔ ''چاند رات'' بہت اچھا تھا بشریٰ احمد کا معمولی باتیں بھی بہترین ناولٹ تھا۔ شازیہ نے دھوپ میں بچت کا اصول سمجھایا۔

حنا بشریٰ کا ''نیل'' اچھا افسانہ تھا۔ ''رنگ ریز میرے'' اور ''حالم'' بھی اپنی مخصوص رفتار سے اچھے جا رہے ہیں۔

''آپ کا باورچی خانہ'' میں عطیہ بتول کی رنگین سویوں کی ڈش اچھی لگی۔ نفسیاتی الجھنوں میں ناصرہ جہاں کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا انہوں نے کتنی بے دردی سے خود کو بدصورت کہہ دیا۔ خوب صورتی صرف رنگت اور نین نقوش تک محدود تھوڑی ہے۔ انسان کی بول چال کا انداز، چال ڈھال، پہننے اوڑھنے کا سلیقہ یہ تمام چیزیں بھی مل کر اسے دلکش بناتی ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اپنی شخصیت میں نکھار لا سکتی ہیں۔ پھر لڑکوں اور ان کی ماؤں کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اچھی شکل چار دن کی چاندنی، کام تو ساری عمر اچھی سیرت ہی آتی ہے۔

ج: پیاری حمیرا! تفصیلی تبصرے کے لیے ممنون ہیں بہت شکریہ۔ صفیہ مہر ..... نامعلوم شہر

حرامانی کو ٹائٹل پر دیکھ کر اگست میرے لیے بہار بن گیا (ویسے بھی اگست کو اک ایسی اچھوتی خوشی ملی کہ اگست حقیقتاً بہار بن گیا ہے۔) حرا سے بائے کر کے سب سے پہلے پڑھا، عفت طاہر کا رنگ ریز میرے نام کی طرح ناول بھی ونڈرفل ہے۔

حالم میں وان فاتح بیسٹ کردار ہے۔ پھر آصف کی بدگمان پڑھی، بہت ہی اصلاحی افسانہ ہے پھر سارے سلسلے بہترین تھے۔

ج: پیاری صفیہ! خواتین کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا، آئندہ خط لکھیں تو شہر کا نام ضرور لکھیں۔

اپنی اس خوشی میں ہمیں شریک نہیں کریں گی، جس سے اگست حقیقتاً بہار بن گیا ہے؟

زرتاشہ نعمان ..... ملتان

اس بار کا شمارہ بہت خوب تھا یقین مانیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ مکمل ناول، ناولٹ اور افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خاص طور پہ ذکر کرنا چاہوں گی فرزانہ کھرل صاحبہ کا ''اجنبی کون ہو تم'' اس ماہ کا بیسٹ ناول رہا، بہت دلکش انداز تحریر تھا۔ پھر نعیمہ ناز سلطان کا ناولٹ ہنستے ہنستے ہی پڑھنا شروع کیا اور ہنستے ہی ہنستے ختم کیا، بہت عمدہ تحریر تھی۔ ''ہمارے نام'' میں فرزانہ انصاری عرف گڑیا صاحبہ کا خط پڑھ کر دل بھر آیا اللہ پاک سے صدق دل سے دعا ہے کہ بہن کی تمام مشکلیں آسان ہوں۔ (آمین)

فرزانہ بہن کو ایک مشورہ دینا چاہوں گی کہ درود پاک کی کثرت کریں، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ورد جاری رکھیں۔

ج: پیاری زرتاشہ! ہم آپ کے مان کو ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ اگر آپ کی تحریر میں ذرا سی بھی گنجائش ہوئی تو ضرور شامل کریں گے۔

آپ نے شرکت کی، بہت شکریہ۔ اب باقاعدگی سے رابطہ رکھیے گا۔

ناہید اسماعیل ..... کراچی

کہنی سنی میں محترم مدیر کی باتیں ہمیشہ ہی سچی اور اچھی ہوتی ہیں۔ ''کرن کرن روشنی'' میں عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے قیمتی اور مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

پڑھے نمرہ کے لاجواب اور شاہکار ''حالم'' کی طرف جس کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ گئے ہیں۔ ''تتلی جیسا پیار'' میں وہی ہوا جس کا کچھ کچھ اندازہ ہم نے لگا لیا تھا یعنی سیماب کا صائم کو پسند کرنا۔ عفت سحر اپنی تحریروں

میں شاعری کا بڑا خوب صورت انتخاب پیش کرتی ہیں۔

''یہ راستہ کوئی اور ہے'' سبق آموز تحریر تھی۔

''راجدھانی'' روبی ظفر کی شاید پہلی تحریر ہے اور پہلی ہی تحریر میں وہ ایک باریک نکتہ سمجھانے میں کامیاب رہی ہیں شازیہ الطاف کا افسانہ ''دھوپ'' بھی اچھا لگا۔ بیل میں وقت اپنے آپ کو دہراتا نظر آیا۔ ''ہنستے ہنستے'' مزیدار اور ہلکی پھلکی تحریر تھی جس میں سارے ہی مسئلے ہنستے مسکراتے حل ہوگئے۔ ''اجنبی کون ہو تم'' آیت کے دل میں ہلکا سا سہی پر زیان کے لیے احساس تو جاگا تھا، جب اس نے ماں بن کر فیصلہ کیا تو اختتام درست لگا۔

''ہمارے نام'' میں تبسم بشیر، ہاجرہ عمران، ریحانہ چودھری اور ام انعام کی کمی محسوس ہوئی۔ فرزانہ انصاری کے خط نے اور ان کی ڈائجسٹ سے محبت نے بہت متاثر کیا بخاری سسٹرز کے والد کی وفات کا بہت دکھ ہوا، ان کے لیے دعا بھی کی ہے۔ ''نفسیاتی الجھنیں'' میں عدنان بھیا کے مشورے بہت اچھے اور مخلصانہ ہوتے ہیں۔

ج: پیاری ناہید! بہت شکریہ۔ آپ کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگتی ہے کہ آپ پرچے کی تمام تحریروں اور سلسلوں پر تبصرہ کرتی ہیں۔

ممتاز بنت حسن ..... نامعلوم شہر

مجھے ''حالم'' بہت پسند ہے کمال ہے نمرہ احمد نے کیا خوب لکھا ہے۔

''کہنی سنی'' میں عید کے تہوار کے متعلق اچھے انداز و الفاظ میں گفتگو کی گئی ہے۔ ''ہمارے نام'' میں تمام خط بہت اچھے اور آپ کے پیار بھرے جواب بہت عمدہ۔ آپ کے پیارے جواب پڑھ کر جی چاہتا ہے، آپ سے دوستی کرلوں اور آپ کو خط لکھا کروں ہمیشہ، فرزانہ انصاری صاحبہ کا خط متاثر کن تھا۔ شازیہ جمال طارق کا افسانہ ''یہ راستہ کوئی اور ہے'' بہت اچھے میسج کے ساتھ تھا۔

مکمل ناول میں نعیمہ ناز سلطان کا ناول ''ہنستے ہنستے'' بہت خوب لکھا۔ بھئی ماہ فروری میں نعیمہ ناز سلطان نے ایک ناول لکھا تھا ''لمحوں کی خطا'' اس ناول نے مجھے رلا دیا تھا۔

افسانہ ''چاند رات۔ معمولی باتیں۔ دھوپ۔ بدگمان'' اور ''بیل'' سب ہی اچھے تھے۔ نفسیاتی الجھنیں بہت اچھا سلسلہ ہے اور موسم کے پکوان سب بہت اچھا ہے۔

ج: پیاری ممتاز! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ نے صرف حالم پر رائے دینے کے لیے خط لکھا، یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ حالم کے بارے میں ہمیں قارئین کی جانب سے دو متضاد آراء ملتی رہی ہیں۔ کچھ قارئین کو یہ بے انتہا پسند ہے اور کچھ اتنی شدت سے ناپسند کرتی ہیں کہ اس کو پڑھتی بھی نہیں ہیں۔

آپ ہم سے دوستی کرنا چاہتی ہیں، ہم دوست نہیں ہیں کیا؟

ثنا تبسم ..... نامعلوم شہر

کورونا کی وجہ سے شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جن کی زندگی متاثر نہ ہوئی ہو۔ بہت سے خود دار جو نجانے کب سے اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی راشن کے بوروں کی صورت امداد لینی پڑ گئی کہ اپنی ذات سے جڑے پیٹ کو تو شاید بھوک کی نذر کر ہی دیتے مگر اپنے بچوں کو کیسے نظر انداز کرتے۔

ہماری ایک قاری بہن نے اپنے خط میں لکھا کہ ''تتلی جیسا پیار'' میں کچھ نہیں (حیرت در حیرت) یعنی کہ کچھ نہیں؟ جب سے یہ کہانی شروع ہوئی ہے میں تو تب سے راحت جی کو خراج پیش کرنے کی کوشش میں ہر ماہ الفاظ کے جوڑ توڑ میں لگی رہی کہ راحت جبیں کی تحریر کے شایان شان الفاظ اور پھر ان کی ترتیب کیا ہونی چاہیے۔ راحت جبیں کی کہانی میرے حساب سے ٹاپ پر جا رہی ہے، اب ذرا تبصرہ ہو جائے۔ ''تتلی جیسا پیار'' تو صائم آگے بڑھ رہا ہے۔ زوباریہ کے لیے کوئی اور ہیرو نکالا جائے۔ بہرحال مجھے اس بات نے اتنا افسردہ کیا کہ میں نے اس قسط کو پڑھنے کے بعد باقی سارا دن کچھ نہیں کیا۔

فرزانہ کھرل میری فیورٹ رائٹرز میں سے ہیں۔ لیکن کیا ہے ناں کہ دنیا ہماری خواہشات پر نہیں چلتی۔ اس لیے میری التجا ہے کہ پلیز پپی اینڈ نگز والی کہانیوں کے پارٹ۔ 2 بلکہ تین اور چار بھی چلیں گے لیکن دکھ میں مبتلا کر دینے والی کہانیوں کو تو مت دیں۔ بہرحال سلسلے وار تینوں کہانیوں کے ہیروز نے اس دفعہ دل بھر کے دکھی کیا ہے اور غصہ بھی دلایا ہے۔

''راجدھانی'' زوبی ظفر شیخ کی لگتا ہے کہ پہلی تحریر ہے۔ متاثر کن ہے۔ فریدہ گوہر کی ''چاندرات'' ویری ویلڈن۔ بشریٰ احمد کی معمولی باتیں بس واقعی میں معمولی ہی لگیں۔

''بدگمان'' (صدف آصف) اچھا رہا۔ ''بیل'' جنا

بشری کافی سبق آموز تھا۔

ج: پیاری ثنا! کرونا سے بڑا عذاب تو مہنگائی ہے۔ کرونا نے شاید اتنے اثرات مرتب نہ کیے ہوں جتنا مہنگائی پریشان کن ہے۔ صبح، شام کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ آٹا، چینی، چاول، دالیں، سبزیاں، دوائیں ہر چیز کی قیمتیں کئی سو گنا بڑھ چکی ہیں۔ صحیح لکھا ہے آپ نے سفید پوشی کا بھرم برقرار رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا کرم فرمائے۔ آمین

خواتین پر تفصیلی تبصرہ کے لیے شکریہ اب رابطہ رکھیے گا۔

صدف ناصر ..... گوجرانوالہ

آیئے آج آپ کی ملاقات کرواتے ہیں ''ماہ اگست'' کے خواتین سے۔ اب ''کہنی سنئی'' کی طرف لیے چلتے ہیں۔ ''مدیر صاحب سے حرف بہ حرف متفق ہیں۔ شکر الحمدللہ! ہمارے پاس عظیم ترین مذہب، رسم و رواج، عبادات اور تہذیب و تمدن ہیں۔

''کرن کرن روشنی'' میں آجائیں۔ سرتاپاؤں اور روشنیوں میں بھیگ جائیں گے۔

باتیں سلمان سعید سے اچھی لگی ہیں۔ شاہین رشید بہت بہت شکریہ! ہم حرا انور کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

سروے ''عید آئی ہے'' چھوٹا سا مگر اچھا سا ہے۔ سب کا ہر دل عزیز، بہترین سلسلہ! ہمارے نام۔ سب ہی بہنوں کے خط اچھے ہیں۔ جواب بہترین ہیں۔ ڈاکٹر انیشا نام کی طرح کام بھی پیارا۔ ناہید اسماعیل اور اقراء سرور شکریہ آپ کو ہمارے خطوط پسند آئے۔ ''معصوم لڑکی کے خط کے جواب میں آپ نے جو فرمایا، ہم حرف بہ حرف متفق ہیں۔

سب سے پہلے عرصہ دراز سے گمشدہ ہر دل عزیز رائیٹر شازیہ جمال کی کہانی ''یہ راستہ کوئی اور ہے'' بہت خوب۔ ''راجدھانی'' زوبی ظفر شیخ نے تحریر کی۔ ہم سمجھے کہ والد صاحب کہیں گے کہ یہ عورت کی راجدھانی ہے، اس کے کاموں میں کمی بیشی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مطلب کہ ہر کام بہترین ہو۔ مگر والد نے کہا! ''اس راجدھانی میں وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی۔ معذرت کے ساتھ ماؤں کے سخت رویے بیٹیوں کی اچھی تربیت کے لیے ہوتے ہیں۔ میں بھی ماں ہوں۔ بیٹی کی مداخلت بری کیوں لگے گی۔ یہ بیٹی کے ماں باپ کا گھر ہے بھئی۔ ''چاند رات'' فریدہ گوہر کو سیلوٹ کرتے ہیں۔ بہت پیاری تحریر ہے۔

نعیمہ ناز کا ناولٹ ''ہنستے ہنستے کیا کہیں گویا! پہلا صفحہ پڑھا تو بہت کہا اٹھ کر پہلے روٹیاں بنالیں، کھانا کھالیں۔ مگر نہیں جی اسٹوری اتنی شاندار، دلچسپ اور کمال تھی کہ کہاں کی روٹیاں، کہاں کا کھانا۔ وہ جو نعیمہ جی سے گلہ تھا کہ پچھلے ماہ بے رنگ سا لکھا۔ وہ تو بھک سے اڑ گیا۔ مجھے ''لوکی'' کا رائتہ نہیں بنانا آتا تھا وہ بھی آ گیا۔ زبردست نعیمہ ناز! ''اجنبی کون ہو تم فرزانہ کھرل۔ ہر ایک کردار شاندار ہر ایک جملہ کمال۔ مگر دل بہت اداس بھی ہوتا رہا۔

ج: پیاری صدف! شان دار تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ ایڈیٹ کرتے ہوئے ہمارا بہت دل دکھا لیکن کیا کریں ہماری مجبوری ہے۔ راجدھانی میں مصنفہ نے جو نکتہ دیا تھا، آپ اس تک پہنچ نہ سکیں۔

ریحانہ چوہدری.....مدو کے

بے شک خط نہیں لکھا تھا مگر بہنوں کے احوال سے تو آگاہی ضروری تھی سو سب سے پہلے پہنچے صفحہ نمبر تیس سے شروع ہونے والے ''ہمارے نام'' تک۔ بھئی حمیرا شفیع پہلے تو مبارک باد کہ ''حاجی صاحب کا بیل'' آپ کی بہت اچھی تحریر تھی۔ پھر آپ کا شکریہ کہ آپ کو محسوس ہوا کہ میری کوکنگ اچھی ہے۔ یہ صرف آپ کی اور باقی سب کی محبت ہے ورنہ مجھے تو کچھ خاص نہیں آتا۔ ہاں بھرے ہوئے پراٹھوں کے لیے پیاری حمیرا سب سے پہلے تو آٹا خوب اچھے سے گندھا ہونا چاہیے۔ جو لوگ بازار کا فائن آٹا استعمال کرتے ہیں، میرے جیسا، ان کو تو یہ مسئلہ نہیں ہوتا ہوگا مگر بعض اوقات گھر کی گندم کا آٹا مسئلہ کرتا ہے کہ اس میں لوچ ذرا کم ہوتا ہے۔ تو آٹا رات کو گوندھ کر فریج میں رکھ دیں پھر جو مواد بھرنا ہے، وہ ذرا فائن قسم کا باریک کریں۔ مولیاں باریک کدوکش کریں اور ان کا پانی اچھی طرح نچوڑ لیں اس میں پانی ہوگا۔ تو پھر بھی پراٹھا کھل جائے گا۔ اللہ کا نام لے کر پکائیے گا ان شاء اللہ نہیں پھٹے گا۔ زینب نور، بیٹا آپ کا یاور چی خانہ بہت ہی پیارا لگا۔ آپ کی سادہ دلی چھلک رہی تھی۔ حمیرا ''بوہلی'' کوئی مشکل نہیں۔ اپنے دودھ والے سے کہہ کر بھینس کے ہاں کٹی، کٹے کی ولادت کے بعد ایک دو دن کے دودھ کو بوہلی کہتے ہیں۔ یہ بہت طاقت والا دودھ ہوتا ہے بلکہ ہمارے ہاں تو پہلے دن کے دودھ میں چنے کی دال بھگو کر رکھ دی جاتی تھی پھر

صبح اس کو پیس کر دیسی گھی میں اس کے پکوڑے فرائی کیے جاتے پھر انہیں یعنی پکوڑوں کو دوبارہ کوٹا جاتا اور پھر دیسی گھی میں میوہ جات ڈال کر بھون کے سردیوں میں کھایا جاتا جو بہت ہی طاقت والی ہوتی۔ بچیوں کی کمزوری اور درد میں بھی بہت ہی مفید ہے۔ بخاری سسٹرز! آپ کی والد صاحب کا بہت افسوس ہوا، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ فرزانہ انصاری آپ کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے اور آپ کے بچوں کو بھی۔

انیلا طاہر آپ کا خط بہترین تھا مگر میں تو اسے پڑھ کے پریشان ہی ہوگئی کیونکہ اسی دن ہم گرین پاکستان پروگرام کے تحت اسکول میں نئے پودے لگا کر آئے تھے میں تو خیر اپنے گھر کی کیاریوں سے بہت سے پودے (پودوں کی پنیری) لے کر گئی تھی مگر نرسری سے زیادہ تر کونو کارپس ہی منگوائے ہوئے تھے اور اسی خصوصیت کی بنا پر ہی کہ وہ جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔

☆ پیاری ریحانہ! آپ کی ٹپس حمیرا شفیع تک پہنچا رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان ٹپس پر عمل کر کے حمیرا مزے دار پراٹھے بنا کر گھر والوں سے داد ضرور وصول کریں گی۔

کونو کارپس کے پودے آپ فوری طور پر ضائع کر دیں۔ کراچی میں بڑے پیمانے پر ان پودوں کو اکھاڑ دیا گیا ہے۔ یہ پودے نہ صرف سانس کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں بلکہ زمین کی ساری نمی بھی جذب کر لیتے ہیں۔ آپ نوٹ کیجیے گا کہ ان کے درختوں پہ پرندے بھی نہیں بیٹھتے۔

عاصمہ یامین ملک......دریا خان بھکر

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' تو ہوتی ہی پیاری ہیں۔ ''کہنی سنی'' بھی خوب رہی۔ فرزانہ کھرل آپ کا انداز سب سے مختلف ہے۔ راحت آپی میں جان گئی کہ قارئین آپ کو بلوانے کے لیے کیوں پاگل ہو رہی تھیں۔ ''حالم'' پر تنقید کرنے والے مجھے موتی چور کے لڈو جیسے لگتے ہیں۔ (مطلب انتہائی برے)۔ عفت سحر کا ناول حسب معمول چیونٹی کی اسپیڈ سے چل رہا ہے۔ اتنا سلو......اف دنیا بہت فاسٹ ہو گئی ہے یار۔ نعیمہ جی! آپ چھانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اپنا لوہا منوالیا۔ انٹرویوز مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہیں، افسانے سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ''ہمارے نام'' میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ ہم گیارہ سال سے رسالے پڑھ رہے ہیں، ابو امی کی مخالفت کے باوجود۔ بھائی علی موڈ ہو تو جاسوسی وغیرہ لا دیتا ہے، خود بھی پڑھتا ہے ناں اس لیے۔ نازیہ رزاق آپ کیوں نہیں لکھ رہیں۔ کوثر خالد اور ڈاکٹر فریال خان آپ کب آئیں گی واپس۔ ایسی بھی کیا ناراضی۔ ماہا مجھے آپ تمام تر تلخی کے باوجود بری نہیں لگتیں۔ گردش دوراں انسان کو یونہی کڑوا کر دیتا ہے۔ تبسم آپ بہت بہادر ہیں۔ ریحانہ آنٹی نائس ہیں۔ بخاری سسٹرز غیر حاضری کی وجہ جان کر بہت افسوس ہوا۔ سمیرا حمید [illegible] کچھ دھماکا دار لکھ رہی ہیں۔

☆ پیاری عاصمہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ بہت خوشی ہوئی آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ آپ کی رائے اور آپ کا پیغام متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

کائنات اصغر بلوچ......ڈہرکی

میں پہلی مرتبہ تو نہیں البتہ ایک لمبے عرصے کے بعد شرکت کر رہی ہوں۔ آپ کے ادارے کے ساتھ فاصلے (چند سالوں کی دوری پر) چلے گئے۔ ویسے اتنی مصروفیات کے باوجود آپ کے شمارے باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی رہی۔ راحت جبیں کا ناول ''تتلی جیسا پیار'' موضوع پرانا ہونے کی وجہ سے تنقید کی زد میں ہے۔ پھر بھی راحت بڑی جانفشانی سے آگے لے کر جا رہی ہیں۔ ''رنگ ریز میرے'' عفت سحر کا اچھا ناول ہے۔ پلیز عفت! ازمیر بٹ سیریز بھی لکھ ڈالیں۔ گزشتہ ماہ نگہت عبداللہ اور نگہت سیما کو پڑھ کر اچھا لگا۔ ''حالم'' مکمل پڑھ چکی مگر پھر بھی پڑھتی ہوں، کیوں ہمارا دل قدیم ملاکے میں قید ہو گیا۔ ملاکہ کے جنگلوں میں دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قہوہ خانے کی قہوہ کی پیالیوں سے نکلتی بھاپ میں...... باقی تمام سلسلے اچھے ہوتے ہیں۔ ''نفسیاتی الجھنیں'' پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔

☆ پیاری کائنات! کافی عرصہ بعد آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

زہرا ممتاز، امتیاز بی بی، شمیم عاشق، خالد عزیز

اینڈ معصوم خدیجہ.....ڈی جی خان

''کہنی سنی'' اور ''کرن کرن روشنی'' کو پڑھتے ہوئے ''ہمارے نام'' پر پہنچے۔ سیدہ بخاری سسٹرز آپ کی کمی ہم نے بھی محسوس کی۔ آپ کے والد کو اللہ جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ ''تتلی جیسا پیار'' بہت اچھا لکھتی ہیں راحت جبیں۔ ''ہنستے ہنستے'' نغمہ ناز سلطان کا ہلکا پھلکا ناول پھر بھی دل کو چھو ہی گیا۔ ''اجنبی کون ہو تم'' فرزانہ کھرل سچ کہا، کبھی کبھی بے ساختہ اٹھنے والی نگاہیں انسان کو رلا دیتی ہیں۔ ناولٹ ''معمولی باتیں'' بالکل انسان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، کسی کے خوشی کے دن ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے برباد نہیں کرنے چاہئیں۔

''حالم'' پورے رسالے کی جان ہے، پلیز نمرہ احمد! ایڈم کو مت مارنا۔ ''غزلیں'' تینوں ہی اچھی تھیں۔ ''نفسیاتی الجھنیں'' عدنان بھائی بالکل پکے ماہر نفسیات ہیں۔ اس ماہ کے مشورے بھی اچھے تھے۔ ایک سوال ہے ''جب آپ کے پاس کوئی اسٹوری یا خط آتا ہے تو آپ گروپ کی شکل میں پڑھتے ہیں اور پھر اچھی ہوئی منتخب کر لیتے ہیں؟'' بتانا ضرور۔

☆ زہرا بی بی! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ خط تو نہیں لیکن کہانیاں ہم اسی طرح منتخب کرتے ہیں۔

خواتین کی محفل میں آپ کی شرکت سے بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

گوشی جمال.....منڈی ملتان

اگست کا عید نمبر ہاتھوں میں آیا تو کچھ دیر ہم ساکت ہی ہو گئے۔ اس سال کا خوب صورت ترین ٹائٹل۔ کلر اسکیم اور ماڈل ہر چیز پرفیکٹ۔ ''کہنی سنی'' سے فیض یاب ہو کر ''کرن کرن روشنی'' سے مستفید ہوئے۔ سلمان سعید سے باتیں کیں اور پڑھیں کچھ جھلکا سا لگا۔ موصوف نے مختصراً سا حوالہ دیا کہ میرے ایک بھائی ہمایوں سعید اس فیلڈ سے وابستہ ہیں جہاں تک ہماری معلومات ہیں تو ان کا تو پورا ٹبر ہی شوبز لنس سے وابستہ ہے۔ یہ الگ بات ہے جو شہرت ہمایوں سعید کو ملی، وہ کسی اور بھائی کے حصے میں نہیں آئی۔ مستقل ناولز ''تتلی جیسا، رنگ ریز میرے'' اور ''حالم'' بہت عمدہ۔ کچھ بہنوں کے خطوط میں پڑھا ہے کہ رنگ ریز میرے اور تتلی جیسا پیار ملتے جلتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کہانیوں میں اچھا خاصا فرق ہے۔

''یہ راستہ کوئی اور ہے'' شازیہ جمال طارق کی طنز و مزاح سے بھرپور ہلکی پھلکی اور سبق آمیز تحریر۔ فرزانہ کھرل زندہ باد۔ ایک بھرپور مکمل ناول کے ساتھ۔ پڑھ کر عید کی تھکن دور ہو گئی۔ کچھ افسانے ٹائم کی قلت کی وجہ سے ابھی نہیں پڑھے، اس لیے تبصرہ سے معذرت۔ دراصل عید پہ ہمارے گھر میں ضرورت سے زیادہ اور اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی ہے۔ تینوں شادی شدہ بھائی جو الگ گھروں میں رہتے ہیں، عید پہ ان کو اماں کی محبت بہت ستاتی ہے اور پورے ٹبر سمیت چاند رات کو ہی ہمارے گھر میں ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور شامت ہماری۔ ایک پاؤں کچن میں تو دوسرا کسی بھابھی کے روم میں۔ ان کی سیوا ہم پہ تو واجب ہے اور بھابھیاں ایسے حالات پیدا کر جاتی ہیں کہ ہمیں لگتا ہے یہ سیوا ہم سے تاحیات لی جائے گی۔ مکھن کی بالٹیاں بھر بھر کر اماں کے کانوں میں ڈالتی ہیں کہ اف تو بہ۔ ہماری منی (مابدولت کو پیار سے منی پکارا جاتا ہے کچھ دنوں کے لیے) تو بے مثال ہے اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ لگتا ہے اس ذائقے سے بھابھیوں نے ہی بھرپور استفادہ حاصل کرنا ہے۔ عید کے دن کا احوال سن لیں۔ بڑی بھابھی نے کچھ گہرا رنگ پایا ہے، اوپر سے گہرے جامنی رنگ کا سوٹ پہنے، گہری لپ اسٹک لگائے بھائی کے ساتھ ٹھٹھے لگاتی جیسے شادی کا پہلا سال ہو حالانکہ بیس سال ہو گئے لیکن ان کا بانکپن نجانے کب جائے گا۔ منجھلی بھابھی جس نے شاید بھائی جان کو گود میں کھلایا ہوگا، وہ بھی الٹرا ماڈرن کپڑے پہنے کمرے سے نمودار ہوئیں۔

''گوشی! سالن تم بنانا، اتنا ذائقہ ہے تمہارے ہاتھوں میں۔ ہم تو انتظار میں رہتے ہیں کہ کب کوئی تہوار آئے اور ہم چٹ پٹے مزے دار کھانے کھا سکیں۔

اماں نے ایک دن پہلے بڑی آپا کے ساتھ مل کر ٹوکرا بھر کر لہسن چھیل کر رکھ دیا اپنے طور پر دونوں نے بہت تیر مارا تھا۔ ''ایہہ بٹیا! تمہیں سہولت رہے گی، جب تک تیرے بھائی بھابھیاں ادھر ہیں، سال کے سال تو رہنے آتے ہیں میرے پاس۔''

آٹھ دن ان کی مہمان داری کا ٹھیکہ گوشی کے سر۔ چھوٹی آپا بھی اپنے مجازی خدا اور مختصر سے بچے لے کر

آدھمکتی ہیں، اماں کے بلاوے پہ۔ بیٹا! گوشی جلدی سے سالن بنالو پھر تمہاری بڑی آپا، تمہاری ہیلپ کردیں گی روٹی بنانے میں۔ سامنے دیکھا تو چھوٹے بھائی سر پہ بڑی پرات گوشت سے بھری دھری ہلکورے کھاتا ہوا میری جانب اور میری یہ حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی۔ چھ سات کلو گوشت کی پہلے صفائی پھر پکائی، اوپر سے جس بھرا دن۔ ایک دن پہلے اماں بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھیں، بادلوں کو دیکھ کر کہ کچھ چھینٹے پڑ جائیں تو عید ٹھنڈی ہوجائے اور بادلوں کو دیکھ رہیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ کر بادلوں میں گھمادیں اور بارش ہوجائے۔

رات کو کچھ بوندا باندی ہوگئی لیکن صبح ہوار کی پڑی۔ لو جی کرلیں انجوائے، پسینے سے شرابور گوشی کی شامت لکڑی والے چولہے پہ دیگ نما پتیلا رکھے صبر کا دامن پکڑے مصروف اور دونوں بڑی آپا اماں کے پاس بیٹھی دکھ سکھ میں مصروف۔ بڑی آپا تو مستقل یہیں ہیں، چھوٹی آپا بھی شادی کے تین سال بعد بیوہ ہوکر آگئیں۔ کچھ عرصہ گھر میں سرد جنگ جاری رہی پھر اماں نے کسی کی معرفت چھوٹی آپا کو ایک ادھیڑ عمر رنڈوے کے ساتھ چلتا کیا۔ اب وہ اکثر ان سے لڑ جھگڑ کر میکے میں ڈیرے جمائے رکھتی ہیں۔ گوشی چونتیس برس میں بھی ابھی سب کو منی اور گڑیا لگتی ہے۔ اب کی بار رشتہ بہت سوچ بچار سے ہوگا تاکہ بڑی دونوں بہنوں جیسا حال نہ ہو۔ یہ اماں کے خیالات ہیں اور بھابیاں بھی کچھ ایسے نادر مشوروں سے اماں کو نواز جاتی ہیں۔ منجھلی بھابی کے بچے گوشی سے بہت اٹیچ ہیں بقول ان کے۔ اس لیے اکثر و بیشتر بھائی اپنے گھر لے جاتے ہیں، کچھ عرصہ کے لیے خود دونوں جاب کرتے ہیں اور گوشی بچوں کی ماں یا شاید آیا بن جاتی ہے۔

''عید آئی ہے'' سروے اچھا لگا۔ میرا بھی دل کیا تھا جوابات بھیجوں لیکن شومئی قسمت وقت نہیں ملا۔ باقی بہنوں کے جوابات مع مزے دار ریسپز پڑھے۔ ارے یہ کیا؟ چوتھے نمبر پر معصوم لڑکی اور اوپر سے نامعلوم۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے بھئی۔ کوئی شناخت نہیں، ایسی بھی کیا پردہ داری۔ خواتین کا جریدہ ہے۔ نام لکھنے میں کیا ہرج ہے، چاہے فرضی کیوں نہ ہو۔

☆ پیاری گوشی! اتنا مزے دار خط لکھتی ہیں آپ۔ یہ خط تو خود پورا ایک افسانہ ہے۔ ''عید'' کے عنوان سے افسانہ لکھ سکتی تھیں۔ اب بھابھی کے گھر قیام کے دوران جو کچھ بیتی، اس پر افسانہ لکھو۔

گوشی! آپ کی امی کی احتیاط اچھی ہے۔ وہ خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر آپ کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ لفظ شادی کا مطلب خوشی ہے، وہ شادی کیا جس میں انسان کا دل ہی خوش نہ ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جان نہیں پاتا کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے، کیا بہتر نہیں ہے۔ زیادہ احتیاط سے کچھ حاصل نہیں۔ اپنی امی تک یہ بات پہنچائیں کہ اب دیر نہ کریں۔ کسی مناسب رشتے کا انتخاب کرکے آپ کو رخصت کردیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بشریٰ یامین ملک.....دریا خان ضلع بھکر

حرا انور اور سلمان سعید سے ملاقات اتنی خاص نہیں تھی۔ ''ہمارے نام'' یہ کھٹا میٹھا سلسلہ بہت مزے دار ہے بالکل گول گپوں کی طرح۔ ''تتلی جیسا پیار'' پھول اور تتلی میں تو صرف محبت ہی ہوتی ہے۔ ''رنگ ریز میرے'' اچھا تھا پر زلفی.....ایک تو نام ایسا، دوسرا کرتوت سونے پہ سہاگہ والی بات ہے۔ بس نہیں چلتا کہ اس کی پگی روڑ دوں۔ ''حالم'' ہمیشہ کی طرح شان دار اور دل بہار تھا۔ عطیہ بتول کا باورچی خانہ اچھا تھا۔ ٹوٹی فروٹی سویاں کی ریسپی پڑھی، اچھی لگی لیکن کچن ٹپ پسند نہیں آئی۔ ''موسم کے پکوان، نفسیاتی الجھنیں'' اور ''بیوٹی بکس'' اچھے سلسلے ہیں۔ سباس گل کی نظم پسند آئی۔ سمیرا حمید آپ اپنی بزی لائف میں سے تھوڑا ٹائم نکالیں ناں۔ میرا بھائی محمد علی مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔ ہم اسے راہ نور، رہ نورد شوق اور دل موم کا دیا پڑھوا چکے ہیں۔ میری فرینڈ ثوبیہ منور اور اس کی سسٹرز بھی خواتین، شعاع اور کرن پڑھتی ہیں۔ میرے شعور میں (خواتین اور شعاع کی بدولت) اضافہ ہوا ہے۔ آپ لوگ پورے اسٹاف کو میری جانب سے یوم آزادی بہت بہت مبارک ہو، اب کی بار ساتھ والی آنٹی نے سب سے پہلے جھنڈا لگایا ہے پھر ہم نے۔ ویسے ہر سال ہمارا جھنڈا پورے محلے میں سب سے پہلے لہرا دیا ہوتا تھا۔ میری نانو فوت ہوگئی ہیں، چار ماہ پہلے

ہمارے ہاں رہ کر گئی تھیں اور ہم سب کو ہندوستان کی باتیں ہجرت سے متعلق اور بہت مزے کی کہانیاں سناتی تھیں (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے)۔

☆ پیاری بشریٰ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی نانی امی نے انڈیا کے کس شہر سے ہجرت کی تھی۔ ان کو ہجرت سے متعلق ساری باتیں یاد تھیں۔ اتنی عمر میں اتنا حافظہ بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔

بھائی کو رسالے پڑھوا کر بہت اچھا کام کیا ہے۔ اب آپ کو ہر ماہ رسالے باقاعدگی سے لاکر دیں گے۔

سلمیٰ مسرت.....خیابان سرسید راولپنڈی

کتنی مصروف اور پر مشقت زندگی سے کچھ لمحے چرا کر آپ سب سے ملاقات کرنے آتی ہوں۔

آنے والے وقت میں پتا نہیں یہ فرصت، یہ موقع ملے نہ ملے بہرحال جب تک زندگی ہے، تحریروں کے ساتھ رابطہ ان شاءاللہ رہے گا۔ خواتین کے سلسلہ وار ناول ہمیشہ سب سے بیسٹ ہوتے ہیں، ان کرداروں کے ساتھ ایک جذباتی انوالومنٹ ہوتی ہے۔ راحت جبیں نے بہت عرصے بعد ''تتلی جیسا پیار'' ناول لکھ کر سارے شکوے دور کردیے۔ نئی رائٹرز لڑکیاں بھی چھوٹے چھوٹے افسانے بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔ ان کی رہنمائی سمیرا حمید، سائرہ رضا، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، عنیزہ سید، نعیمہ ناز اور دیگر رائٹرز نے کی ہے۔

''حالم'' کی کیا بات ہے۔ ہر بار ڈر لگا ہوتا ہے کہ کہیں آخری قسط نہ آجائے۔ خواتین کے تمام سلسلے احادیث سے لے کر نفسیاتی الجھنوں تک سب کا معیار ماشاءاللہ بہت اعلا ہے۔

☆ پیاری سلمیٰ! بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری محفل کو رونق بخشی۔ آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ نمرہ احمد نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

صبا راجپوت.....نامعلوم شہر

اس بار ٹائٹل پسند آیا ورنہ ہر بار وہی لڑکیاں اور وہی میک اپ اور جیولری جسے دیکھ کر گھبراہٹ ہو۔ مدیر سر نے صحیح کیا کہ مسلمانوں کا معاملہ مختلف ہے۔ ہمارا مذہب بھی امن والا اور تہوار بھی۔

پھر آئیں ''کرن کرن روشنی'' میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ ''تتلی جیسا پیار'' زبردست قسط تھی۔

''رنگ ریز میرے'' اب کچھ اسپیڈ پکڑی ہے ورنہ بور کررہا تھا۔ باقی ''چاندرات'' تو پڑھ کر یوں لگا جیسے پرائمری کی اردو کی کتاب کا کوئی سبق پڑھ رہے ہیں، اس انداز سے لکھا تھا۔ ''معمولی باتیں'' ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔

''حالم'' جب پہلی بار نام سنا تو اچھا لگا لیکن جب پڑھا اف۔ کیا ہے یہ، ایسا لگتا ہے جیسے ہالی ووڈ اور انڈین ڈراموں کا مکسچر ہے۔ خواتین ڈائجسٹ ایک دم پیسہ وصول ہے پر جب حالم کو دیکھتی ہوں، لگتا ہے پیسہ ڈوب گیا۔ خیر ختم کیجیے اور سمیرا حمید کو لے آئیں۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔

''عید آئی ہے'' سروے میں بھی مزا نہیں، پھیکا پھیکا تھا۔ فہد مصطفیٰ کا ٹک ٹاک بند کرنے کے لیے بولنے پر ہانیہ عامر کا ایسا کرنا ذہنی مریضہ لگی۔

اور یاد آیا، بھائی نے بتایا کہ بک اسٹال والا بول رہا تھا کہ جب سے کورونا پھیلا ہے تب سے ڈائجسٹ بکنا بند ہوگئے ہیں۔ اب بس نہیں لاؤں گا۔ ہمیں ٹینشن ہوگئی ہے۔

☆ پیاری صبا! ہم نے ڈائجسٹ میں واٹس ایپ نمبر دیا ہے، آپ اس نمبر پہ اپنا نام اور ایڈریس میسج کردیں، آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل جائے گا۔ آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا اور خط بھی لائن چھوڑ کر نہیں لکھا۔ آئندہ اپنے شہر کا نام ضرور لکھیں اور لائن چھوڑ کر خط لکھیں۔ ہمیں تصحیح کرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

☆☆

اعتذار

خواتین ڈائجسٹ اگست کے شمارے میں نمرہ احمد کے ناول کی 31 ویں قسط شائع ہوئی تھی۔ سہواً اس پر 24 ویں قسط لکھا گیا۔ اس شمارے میں 32 ویں قسط شامل اشاعت ہے۔

اس سہو کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

ماہنامہ کرن

ستمبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

❁ اداکار ''عرفان کھوسٹ'' سے شاہین رشید کی ملاقات،

❁ اداکارہ ''ماہ نور خان'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''،

❁ اس ماہ '' شکیلہ سہیل حسن'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،

❁ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،

❁ ''کنارِ خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،

❁ ''ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے'' قرۃ العین سکندر کا مکمل ناول،

❁ ''الٹی ہو گئی سب تدبیریں'' فوزیہ احسان رانا کا مکمل ناول،

❁ ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کا ناولٹ،

❁ ''جاہل'' میمونہ صدف کا ناولٹ،

❁ عائشہ تنویر، صدف آصف، صبا بہار اور ثانیہ چوہدری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

''کرن کتاب''

تلسی بڑھائے بیوٹی، افغان جیولری زیورات کا نیا اسٹائل، کچن کو صاف رکھیں مگر کیسے؟
ہمیشہ ساس کیوں غلط ہوتی ہے؟ کچن اور آپ، کرن کا دسترخوان۔

ستمبر 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

سیدہ امبر اختر بخاری..... چندی پور

ہم چھ بہن بھائی ہیں، میں سب سے بڑی ہوں۔ میری مما بہت گریٹ ہیں۔ صبر، وفا، محبت کی عمدہ مثال، میں نے ان جیسا حوصلہ کسی میں نہیں دیکھا۔

1) رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے، جنون کی حد تک۔ شاعری مجھے بہت پسند ہے، اچھی شاعری دل میں، روح میں اتر جاتی ہے۔ ویسے میں تھوڑی بہت بونگیاں مار کر خود بھی شاعری لکھ لیتی تھی پھر چھوڑ دی۔ نازیہ کنول نازی اور نمرہ احمد نے متاثر کیا۔ وصی شاہ، محسن نقوی فیورٹ ہیں۔

2) راز کی بات بتاؤں۔ خوبیاں مجھ میں ہیں ہی نہیں، چلیں آپ اتنا مجبور کر رہی ہیں تو کوئی بڑا سا چراغ لے کر اپنی ذات میں کچھ خوبیاں ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ بہت زیادہ صاف دل رکھتی ہوں۔ ہمیشہ صاف، سیدھی اور حق پہ بات کرتی ہوں۔ منافقت دل میں نہیں رکھتی۔ خامیاں اف نہ پوچھیں جی! غصہ بہت آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں کا آجانا، اعتبار جلدی کر لیتی ہوں۔ رونا تو جیسے میرا مشغلہ ہے، غم میں رونا، خوشی میں رونا، بات بے بات رونا، کہانیاں پڑھ کر رونا، سیڈ موویز دیکھ کر رونا، بس بس بس..... جناب رونا رونا پڑھ کر آپ ہی نہ رونے لگ جائیں۔ حساس حد سے زیادہ ہوں، میرے خیال میں یہ بھی ایک خامی ہی ہے۔

کچھ پرانے ڈائجسٹ پڑھے تو خواتین اچھا لگا اور اب ان شاء اللہ ریگولر پڑھا کروں گی اور اس میں لکھا بھی کروں گی اگر آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہو تو۔ شوق، خواہشات کچھ نہیں بس مجھے آرمی پسند ہے۔ جب چھوٹی تھی تب ہمارے گاؤں میں آرمی والے آئے تھے۔

میں بھاگ بھاگ کر ان کے پاس جاتی تھی، انہیں پانی بھر دینا اور کوئی ضرورت کی چیز انہیں چاہیے ہوتی امی سے لے کر دینا۔ ان کی یونیفارم مجھے اتنی اچھی لگی تھی کہ بس میں پہلے آرمی کو لائک کرنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ میرا یہ جنون بڑھ گیا، بس آرمی پاگل پن کی حد تک پسند ہے۔ وہ بہادر جوان جو اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے آرام کی پروا کیے بنا اس پاک سرزمین کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جن کو نہ موت کا ڈر، نہ دشمن کا خوف، نہ کسی گولی کی پروا۔ سلیوٹ ان بہادر جوانوں کو۔ آئی لو پاک آرمی اینڈ آئی ریسپکٹ پاک آرمی۔ بہت خواہش تھی کہ بھائی یا کوئی کزن ہی چلا جائے، آہ! بھلا ایسا کب ممکن.....

3) نہ جی بالکل سالگرہ نہیں مناتی، ہاں لائف میں ایک بار میری فیملی نے مجھے سرپرائز دیا تھا۔ سیلیبریٹ کی تھی، میری سالگرہ کے بعد باقی دیکھا دیکھی بھی شروع ہو گئے لیکن میں نہیں مناتی۔ ہاں فرینڈز کو وش ضرور کرتی ہوں۔

4 :۔ مجھے میری سالگرہ ہر بار یاد رہتی ہے لیکن مناتی نہیں ہوں۔ ایک بار جب میں 10th میں تھی تو فرینڈز کے ساتھ دھوم دھام سے منائی تھی۔ ویسے ہمارے ہاں سالگرہ کو منانا زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا۔

5 :۔ شاعری سے مجھے بہت لگاؤ ہے۔ مجھے جو شعر اچھا لگے فٹافٹ اپنی ڈائری میں لکھ لیتی ہوں۔ میرا من پسند شعر

ہم سمندر کی طرح ظرف "وصی" رکھتے ہیں
دل میں ہو طوفان تو چہرے پر ہنسی رکھتے ہیں

حفصہ اسلم نیازی..... دریا خان بھکر

حفصہ اسلم ہمارا نام، ہنسنا، ہنسانا ہمارا کام۔ ہمارے یعنی میرے چار چھوٹے بھائی ہیں۔ بہن سے اللہ نے محروم رکھا۔ (دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے) بھائیوں کے علاوہ میرے فیملی ممبرز میں ماما، پاپا اور دادی شامل ہیں۔

(1) میں اس وقت فرسٹ ایئر میں ہوں یعنی کالج میں۔ میری دو بہت قریبی دوستیں عائشہ اور حمیرا

ہیں۔ باقی سارے کالج سے نہ ہم بناتے ہیں نہ کالج ہم سے۔ (آہم) پڑھائی سے مجھے دلچسپی نہیں ہے صرف پاس ہونے کے لیے پڑھتی ہوں لیکن میں ذہین ہوں اس لیے واجبی پڑھنے کے باوجود میرے ہمیشہ ''اے'' اور ''اے پلس'' گریڈ آتے ہیں۔ (ہے نا کمال کی بات)۔ مجھے ہنسنے اور بولنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

ماما کہتی ہیں ''تم کب سنجیدہ ہوگی؟''

اب کیا سڑیل اور کھڑوس بن کر بندہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ میرے خاندان میں پانچ عدد پھوپھیاں ان کے کل ملا کے 20'25 بچے۔ ایک چاچا جو کے خالو بھی ہیں ان کے 5 بچے۔ ایک خالہ اسلام آباد میں ہوتی ہیں ان کی تین بیٹیاں۔ جب بھی عید، بقر عید پر سب اکھٹے ہوتے ہیں تو میلے کا سماں لگتا ہے۔ مجھے کھانا پکانے اور کھانے کا بہت شوق ہے۔

گھر میں جب دعوت ہوتی ہے تو ماما مہمانوں کو کمپنی دیتی ہیں اور میں چار، پانچ ڈشیں اکیلے بنا لیتی ہوں۔ ہاتھ میں ذائقہ بھی ہے۔ ایک دن میں پاکستان کی سب سے بڑی شیف بنوں گی۔ (ہائے اللہ خیر کرے)۔

(2) پہلے خامیاں بتاؤں گی پھر خوبیاں۔ پہلی خامی (ماما کی نظر میں) کھانا بنا کے کچن کی صفائی نہیں کرتی، بہت لاپرواہ ہوں۔ کالج میں لڑکیاں میک اپ کر کے آتی ہیں اور میں منہ بھی صابن سے ہفتے میں ایک بار دھوتی ہوں۔ ہاہاہا (ہائے میری خامیاں)

اور ہاں پین کا سرچباتی ہوں۔ اب بات آئے خوبیوں کی تو وہ ڈھیروں ڈھیر ہیں۔ (آہم)

بہت فرینڈلی، سمجھ دار، حقیقت پسند ہوں۔ کسی سے حسد نہیں کرتی۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔ لوگ میری کمپنی کو انجوائے کرتے ہیں۔ میری خوش اخلاقی کی حد دیکھیں کمرہ امتحان میں سب کے منہ پہ بارہ بجے ہیں اور ہمارا گروپ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہا ہوتا ہے۔ اور پیپر بہت اچھا ہوتا ہے۔ (ٹوٹکا)

غصہ نہیں آتا۔ (کاش آتا) کھانا اچھا بنالی ہوں مہمان نواز ہوں، مشورے اچھے دیتی ہوں اور میرا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔ اف مجھ میں کتنی خوبیاں ہیں (الحمدللہ) ہی ہی ہی۔

(3) شادی سے پہلے ماما پڑھتی تھیں۔ اب دو سال سے ہم دونوں خواتین، کرن اور شعاع پڑھتے ہیں۔ ان رسالوں سے سیکھنے کو بہت کچھ ملا ہے۔ خواتین کے تمام ماہنامے استاد سے کم نہیں ہیں۔ اس کا ثبوت ماما کے الفاظ ہیں ''ہر وقت ڈائجسٹ پڑھتی ہو مگر سیکھتی نہیں ہو کچن کی صفائی کیوں نہیں کرتیں پکانے کے بعد (ہائے ماما)

پسندیدہ مصنفین وہی ہیں جو ہر قاری کی ہوتی ہیں۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سائرہ رضا، تنزیلہ ریاض، نعیمہ ناز، منشاء محسن علی، صائمہ اکرم چودھری وغیرہ۔

(4) جب تک دس سال کی تھی۔ ہر سال برتھ ڈے صرف گھر والے اور چچا زاد وغیرہ مل کے منا لیتے۔ پھر ماما نے اعلان کیا کہ ''اب بڑے ہو گئے ہو بس اب نہیں منائیں گے''۔ پچھلے سال دوستوں نے سرپرائز پارٹی دی حالانکہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا ان کی حرکتوں سے (ہی ہی ہی)۔!

(5) شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں لیکن پڑھتی ضرور ہوں۔ حمیرا بہت اچھی شاعری کرتی ہے ویسے میرا پسندیدہ شعر وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آج کل ایک شعر وصی شاہ کا بہت پسند آیا ہے۔

ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے میرے دل پہ وصی
میں جب بھی ہنستا ہوں آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

پسندیدہ اقتباس ہر دل عزیز سمیرا حمید کے ناول ''رہ نوردِ شوق'' سے.....

''جس جگہ آپ نے اپنے نام کا جھنڈا لگانا ہو وہ جگہ پتھر کی ہوتی ہے۔ جس جگہ اپنے قدموں کے نشان ثبت کرنے ہوں وہ جگہ دلدل ہوتی ہے۔

☆☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

خراج تحسین

برطانیہ میں سرکاری طور پر ''سات کلوگرام کا سونے'' کا سکہ جاری کیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق مقبول زمانہ فلم سیریز جیمز بانڈ کی سلور جوبلی کے موقع پر برطانیہ کے سرکاری ادارے ''دی رائل منٹ'' کی جانب سے 7 کلو وزنی سونے سے بنایادگاری سکہ جاری کیا گیا ہے۔ دی رائل منٹ کی جانب سے گیارہ سو برس کی تاریخ میں پہلی بار اس قدر وزنی اور مہنگا ترین سونے کا سکہ تیار کیا گیا ہے۔ یہ سکہ فروخت کے لیے نہیں بنایا گیا۔

اس کی مالیت سات ہزار پاؤنڈ (یعنی کم و بیش 13 لاکھ 73 ہزار 363 پاکستانی روپے) بتائی گئی ہے۔

سکے پر بندوق کی نال کی طرح کا ڈیزائن بنایا گیا ہے۔ جس میں بانڈ کی مشہور گاڑی ڈی بی فائیو نمایاں ہے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی واضح ہے۔ گاڑی کے نیچے 007 کا ٹریڈ مارک بھی کندہ ہے۔ اس سکے کو تیار کر کے سرکاری طور پر دی رائل منٹ کی جانب سے جیمز بانڈ کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس سکے کو فریم کر کے دی رائل منٹ میں ہی رکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ دی رائل منٹ کی جانب سے چھوٹے سونے اور چاندی کے سکے بھی تیار کیے گئے جن پر جیمز بانڈ کی تمام 25 فلموں کے حوالے سے نشانیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ سکے فروخت کے لیے پیش کیے جائیں گے۔

اعزاز

پاکستانی کرکٹر ثنا میر نے ایک اعزاز اپنے نام کرلیا ہے وہ اس دہائی کی بہترین خواتین کرکٹر کی فہرست میں شامل ہوگئی ہیں۔ وزڈن نے دہائی کی بہترین خواتین کرکٹر کا جو اعلان کیا ہے۔ اس میں ون ڈے کرکٹ میں 100 وکٹیں لینے والی ثنا میر کا نام بھی شامل کرلیا ہے۔ وزڈن کی بہترین کھلاڑیوں میں بھارت، انگلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ویسٹ انڈیز کی کرکٹر شامل

ہیں۔

ثنا میر کا کہنا ہے کہ وزڈن میں بہترین کھلاڑیوں کے ساتھ ان کا نام شامل ہونا ان کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ ہمیشہ ٹیم کے لیے کھیلا اور بہترین پرفارمنس دینے کی کوشش کی۔ قومی ٹیم مستقبل میں فتوحات سمیٹے گی۔

(کس کے مستقبل میں؟)

ثنا میر تجربہ کار آل راؤنڈر ہیں اور اس سے قبل بھی کئی اعزاز اپنے نام کر چکی ہیں (ٹیم کے نام کیوں نہیں؟) اور خواتین کرکٹ کی دنیا میں پاکستان کا پرچم بلند کر چکی ہیں۔

ثنا میر ون ڈے کرکٹ میں نئی تاریخ رقم کر چکی ہیں انہیں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والی دیمن اسپنر کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

معیار

کیف غزنوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ کیف اقرا یونی ورسٹی میں میڈیا سائنس کے شعبے کی سربراہ ہیں۔ ٹیلی وژن اور تھیٹر پر اداکاری بھی کرتی ہیں ان کی ایک دو سال کی بیٹی بھی ہے۔ کیف نے نیشنل کالج آف آرٹس سے گریجویشن کیا اور ماسٹر آف فائن آرٹس کیلیفورنیا سے لیا۔ کیف ٹی وی ڈراموں میں کم کم نظر آتی ہیں۔

کیف نے اب تک ساجی گل، بی گل، فصیح باری خان اور مصطفیٰ آفریدی کے ڈراموں میں کام کیا ہے۔

اس بارے میں کیف غزنوی کا کہنا ہے کہ یہ لوگ بہتر انداز کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کا کونٹینٹ سماجی رویوں اور مسائل کی بھرپور انداز میں تصویر کشی کرتا ہے۔ (جی باتی تو بہنوئی سالی یا ایک لڑکا دو لڑکیوں، ساس بہو یا اسی قسم کے موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔) یہ لوگ ڈرائنگ روم کی کہانیاں بہت کم لکھتے ہیں بلکہ اکثریت نہیں لکھتی اور اگر کسی کو سمجھوتہ کرنا پڑ جائے تو بھی اس میں سطحیت کہیں نظر نہیں آتی۔ باقی کئی لکھنے والے تو کمرشلائزڈ ہو گئے ہیں (کیوں کہ ان کو بھی زندہ رہنا ہے) کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں سے فلم اور کہاں سے ڈرامہ شروع ہو رہا ہے۔ زیادہ تعداد میں ڈرامے لکھنا بھی ڈراموں کا معیار متاثر کر رہا ہے۔ کچھ تو دال میں اتنا پانی ڈال رہے ہی کہ دال تو ریشہ ریشہ ہو جاتی ہے اور پانی ہی پانی نظر آتا ہے (جیسے بارش کی وجہ سے آج کل کراچی میں نظر آ رہا ہے۔)

اداکاری بڑا ہی چیلنجنگ کام ہے کسی کردار کو جو آپ نہیں مگر اسکرین پر ایسا لگے کہ آپ اصل میں وہی ہیں میں سیریل کے ختم ہونے کے بعد کئی ہفتوں اس کردار کی گرفت میں رہتی ہوں۔

ظلم

حالیہ بارشوں نے کراچی میں بہت تباہی مچائی جہاں لوگوں کا ساز و سامان بہہ گیا وہیں بہت سی لڑکیوں کا جہیز بھی اس بارش کی نظر ہو گیا۔ جہیز ہمارے معاشرے کی ایسی لعنت ہے جسے کوئی بھی ترک نہیں کرنا چاہتا۔ باتیں بہت کی جاتی ہیں لیکن عمل بہت کم لوگ کر پاتے ہیں لیکن اگر نامور اور لوگوں کے پسندیدہ افراد یہ عمل کریں تو شاید اس میں کچھ کمی آ جائے بہرحال ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

اداکار و گلوکار علی ظفر نے جہیز لینے کے مطالبے کو ایک انتہائی ظالمانہ عمل قرار دیا ہے۔ جہیز لینے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے علی ظفر نے کہا کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ لڑکیوں کے والدین سے جہیز لینے سے گریز کریں۔ انہوں نے اپنی شادی پر اپنے سسرالیوں سے صرف ایک سوٹ لیا جہیز اور کسی بھی صورت میں نقدی لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ علی ظفر

نے مزید کہا کہ جہیز لینا ہماری نہیں بلکہ ہندوؤں کی رسم ہے جو ان کے نزدیک ایک ظلم ہے۔" (ایسا ظلم جو ہر انسان کرتا ہے ہنسی خوشی، اور جو نہ کرے اسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔)

وجہ

شوبز سے عارضی کنارہ کشی (یہ عارضی کنارہ کشی کیا ہوتی ہے۔ مطلب آپ کو کوئی سائن نہیں کرتا؟) اختیار کرنے والے حمزہ علی عباسی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اداکاری کو خیرباد نہیں کیا۔ بس وقفہ لیا ہے (کہ کوئی انہیں سائن کر لے۔) جیسا کہ میں اپنی وڈیو میں کہہ چکا ہوں کہ میں اداکاری چھوڑ نہیں رہا۔ حمزہ نے مزید کہا کہ وہ ایسے پروجیکٹس میں اداکاری بھی کریں گے جو اللہ کی طرف سے انسانوں کے لیے طے کردہ حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے جائیں گے۔

حمزہ علی عباسی نے کچھ عرصہ قبل خواتین ڈائجسٹ میں لکھے عمیرہ احمد کے ناول الف پر مبنی ڈرامے میں قلب مومن کا کردار ادا کیا تھا جو ناظرین میں کافی مقبول ہوا تھا۔

(اب یقیناً عباسی کو کسی ایسے ڈرامے کی تلاش ہے جو اسی طرح کا ہو۔ درپردہ حمزہ نے ڈرامہ رائٹر کو ایسے ڈرامے لکھنے کا کہا ہے جس میں وہ کام کر سکیں۔ دیکھیں اب کون سا رائٹر یہ کارنامہ انجام دیتا ہے۔)

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

عطیہ بتول

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت؟

ج: پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے
کیوں کہ ہر کام کرنا ہے

جہاں تک ہمارا معاملہ ہے۔ اللہ کی بنائی ہر چیز کھالیتے ہیں۔ سادہ، تازہ باسی جو ملے ہضم۔ یہی ہماری صحت کا راز ہے۔ غذائیت تو سادہ کھانے میں ہوتی ہے اور ذائقہ منہ میں ہوتا ہے اللہ کے کرم سے۔ لیکن میرے گھر والوں کے منہ میں ذائقہ نیست۔ پھر بھی ہم لذیذ ڈش نہیں بناتے۔ سادہ کھلانے کی دھن میں مگن سادہ ہنڈیا ہی پکاتے ہیں مگر جو سبزیاں وہ کہیں وہی پکاتے ہیں۔ مگر ''سب کھاؤ'' کی تبلیغ جاری ہے اور ڈاکٹر نے گھیا کدو اور ٹنڈے تجویز کیے ہیں مگر ابھی سب مان نہیں رہے۔ بہو رانی تو ساگ، پھلیاں، بھنڈی کے علاوہ صرف کڑھی چاول، دالیں اور گوشت کھاتی ہے، البتہ کھیرے بہت کھاتی ہے۔ بچوں کی خوراک بھی کم ہے اور ہاضمہ بھی کمزور ہے۔ پوتے نانو کے گھر گئے تو ہم نے دودھ بند نہیں کیا۔ روزانہ کا کلو پیتے رہے۔ بچپن میں روزانہ نو روٹیاں کھاتے۔ اب چار پانچ کھالیتے ہیں۔

س: اچانک مہمان آگئے۔ کھانے کا وقت ہے، کسی ایسی ڈش کا نام جو فوری تیار کر کے مہمانوں کو کھلا سکیں؟

ج: جو گھر میں پکا ہوگا وہیں کھلائیں گے۔ مہمان نخریلا ہوگا تو سادہ گوشت روٹی کھلا دیں گے۔ ترکیب کی ضرورت نہیں ناں سسرالی رشتے گلی میں ہیں۔ چائے، پھل، آئس کریم، دہی بھلے یا جو اگر میٹھا بنا ہو تو چھوٹا دیور کھالے گا۔ چاول ہوں تو بھتیجا کھالے گا۔ بس سال بعد بھابھیاں آتی ہیں تو وہیں وہی ہانڈی پکاتے ہیں۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج: کچن کھلے صحن میں تین عدد شیلف سے مشروط ہے۔ اول ہم اسے گندا نہیں ہونے دیتے۔ گندے یعنی آٹے سے تھڑے ہاتھوں سے کوئی چیز نہیں پکڑتے۔ ذرا سی چیز گرے فوراً اٹھاؤ۔ چاہے ہاتھ جل جائے، پھیلاوا نہیں ہوسکتا۔

سادہ ہنڈیا پکانے میں، نمک مرچ، ہلدی اور صرف مسالا کا ڈبہ، چینی اور اچار کا ڈبہ ٹوکری میں رکھ کر اوپر کشن ڈال رکھا ہے تاکہ روز روز دھونے نہ پڑیں۔

بیٹی اور بہو پکاتی ہیں اگر تکے بریانی وغیرہ کبھی کبھار تو پیکٹ ہوں گے جو ڈبے پھینک کر میں ایک ڈبے میں رکھ دیتی ہوں۔ برتن بھی بہت کم رکھے ہیں گھر میں۔ میرا بس چلے تو سارا گھر خالی کردوں۔ صرف تھوڑا سا بنیادی سامان ہو۔ کاش ابوبکر صدیقؓ کی کٹھڑی جتنا.....

س: گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جارہا ہے، آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانے جاتی ہیں؟

ج: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے چھوٹے بیٹے کو گھر سے باہر کام سے بھی عورت کا جانا پسند نہیں۔ سوائے ضروری کام کے۔ ایک بار بیٹی ضد کر کے اسے اور مجھے لے گئی تھی، گرم گرم پزا کھایا تھا۔

س: کھانا پکاتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج: گرمیوں میں ظاہر ہے گرمی کی سبزی اور سردی میں سردی کی۔ سردیوں میں ایک بار صبح چائے رس، گاجر کا حلوہ موسم میں دو چار بار۔

کبھی کبھار شکر قندی بھی اچھی بناتی ہوں۔ کھیر بھی عید پر بنا لیتی ہوں۔

گرمیوں میں لچھن (بہت مزے کی بناتی ہوں) لسی، دہی، ملک شیک آم کا بھی کیلے کا۔ شربت تازہ پھلوں، فالسے، آڑو، آلو بخارے، امرود، انگور کا لیموں یا سیون اپ ڈال کر اکثر سادہ بناتی ہوں رمضان میں تو پھل شربت روزانہ ہی آتے ہیں۔ پکوڑے سموسے کم ہی بناتے ہیں۔

میں تو پہلے روٹی کھاتی ہوں۔ باقی روٹی کم کم یا نہیں۔ روزے میں دہی سے روٹی کھاتی ہوں۔ چھوٹا انڈے یا بھی سالن سے۔ بڑا اچار اکثر کھاتا ہے کیونکہ سبزی اسے ایک ہی پسند ہے گھیا، توری اور مسور کی دال۔

س: اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: سادہ ہنڈیا میں کون سی محنت لگتی ہے بھئی۔ البتہ کریلے وغیرہ بھر کے پکانے ہوں قیمہ یا بیسن والے تو آدھا دن لگ جاتا ہے اور پنجیری اور مٹھائی بنانے کا شوق ہے مگر خاص دعوت، خاص فرمائش پر بناتی ہوں۔ اپنی فرمائش پر کچھ بھی نہیں بناتی کیونکہ ہمیں خدائی کلام پڑھنے اور کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ لکھنے کے لیے تو رات جاگنا پڑتا ہے اور روز نہیں جاگ سکتے۔ بھئی اللہ نے منع کیا ہے۔ آگے ہی فجر کی نماز قضا پڑھتے ہیں کیونکہ کپڑے استری، دھلائی اور صفائی (بار بار) ہمیں اب تھکا دیتی ہے۔

س: کچن کی کوئی ٹپ؟

ج: لبیک اللھم لبیک۔ درود پاک سے زبان تر رکھیں۔ ٹونے ٹوٹکوں کی ضرورت نشتہ۔ ہانڈی جل بھی جائے تو ذائقہ موجود رہے گا۔ سادہ کھانا صحت اچھی۔

☆☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

منگوانے کا پتہ: ملتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چنیوٹی اسٹفڈ چکن

اجزاء:۔

ثابت چکن	ایک کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
پسی ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک چوتھائی کپ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پیسٹ بنانے کے لیے	
ٹماٹر (چھوٹا)	ایک عدد
پیاز	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پودینے کے پتے	آٹھ سے دس عدد
ہری مرچ	چھ عدد
دہی	چار کھانے کے چمچے
اسٹفنگ کے لیے	
انڈے ابلے ہوئے	دو عدد
آلو بخارے	چھ عدد
پیاز	ایک عدد
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	تین عدد

ترکیب:۔

ٹماٹر، تلی پیاز، ہرا دھنیا، پودینے کے پتے، ہری مرچ اور دہی کو گرائنڈر میں پیس لیں۔ اب چکن پر پسا ہوا آمیزہ، نمک، پسی لال مرچ، لیموں کا رس، ادرک لہسن اور گرم مسالا لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب چکن میں اسٹفنگ کی چیزیں بھر کر دھاگے سے باندھ دیں۔ پھر تیل گرم کر کے چکن کو ہلکی آنچ پر دونوں طرف سے پکائیں، یہاں تک کہ وہ سنہری ہو جائے۔ اس کے بعد بچے ہوئے مسالے کو آدھا کپ پانی کے ساتھ شامل کریں اور ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیں، پھر اسے فرائز کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری پلاؤ

اجزاء:۔

چکن (سولہ ٹکڑے)	ایک کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں پسی ہوئی	بیس عدد
پیاز پسی ہوئی	دو عدد
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری الائچی	چار عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
لونگ	چھ عدد
تیز پات	ایک عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
چاول	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

ادرک لہسن، ہری مرچ، پیاز، خشخاش اور دہی کو گرائنڈر میں پیس لیں پھر چکن پر لگا کر ایک گھنٹے کے

لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کرکے اس میں پسی پیاز، کٹی کالی مرچ، ہری الائچی، لونگ، تیزپات اور زیرہ ڈال کر پانچ سے سات منٹ پکائیں کہ پیاز کا کچا پن ختم ہوجائے۔ پھر آمیزہ لگی چکن ڈال کر دو سے تین منٹ پکا کر ڈھک دیں۔ جب چکن گل جائے اور تیل اوپر آجائے تو دو کپ پانی ڈالیں جب ابال آنے لگے تو چاول اور نمک ڈال دیں۔ پانی خشک ہوجائے اور چاول ایک کنی رہ جائے تو ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے دم دیں، چاول مکمل تیار ہوجائیں گے۔ رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

سوجی کی ٹکڑیاں

سوجی	ایک کلو
مکھانے	سو گرام
گوند	سو گرام
بادام کی گری	ایک چھٹانک
کشمش	سو گرام
ناریل پسا ہوا	ایک چھٹانک
پستہ	پچاس گرام
گھی	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ

ترکیب:

ایک کڑاہی میں تھوڑا سا گھی ڈالیے اور اس میں گوند اور مکھانے سرخ کرکے نکال لیں اور ٹھنڈا ہونے پر موٹا موٹا کوٹ لیں۔ بادام، ناریل اور پستہ کو الگ الگ صاف کرکے کوٹ لیں اور پھر انہیں گوند اور مکھانے میں ملا کر ایک جانب رکھ دیں۔ ایک کڑاہی یا بڑی دیگچی میں چینی اور ایک گلاس پانی ڈال کر دو تار کا شیرہ بنالیں۔ پھر اس میں کشمش ڈال دیں۔ جب کشمش پھول جائے تو سوجی اور دیگر تمام اشیاء چاشنی میں ڈال دیجیے اور چمچہ اچھی طرح ہلاتے رہیے تاکہ ساری چیزیں یک جان ہوجائیں۔ جب پانی خشک ہوکر صرف ہی رہ جائے تو چولہا بند کریں اور دس سے پندرہ منٹ بعد چمچہ اچھی طرح ہلا کر برابر کردیجیے تاکہ گٹھلیاں وغیرہ نہ بننے پائیں۔ اب ایک تھال میں ڈال کر ٹکڑیوں کی شکل میں کاٹ لیں۔ گرم گرم یا حسب پسند ٹھنڈا کرکے تناول فرمایئے۔

چکن وائٹ کڑاہی

اجزاء:

مرغی	آدھا کلو
دہی	ایک پاؤ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کریم	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
ادرک	ایک درمیانہ ٹکڑا
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی

ترکیب:

ایک پتیلے میں تیل گرم کرکے اس میں مرغی بھون لیں یہاں تک کہ ہلکی سنہری رنگت آجائے۔ پھر اس میں لہسن ادرک ڈال کر ایک سے دو منٹ کے لیے پکائیں۔ پھر زیرہ، خشک دھنیا، کالی مرچ، نمک دہی اور حسب ضرورت پانی ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں کہ مرغی گل جائے۔ اس کے بعد اس میں کریم شامل کردیں اور کچھ دیر پکا کر اچھی طرح ملا کر چولہے سے اتار لیں۔ ہرا دھنیا اور ادرک سے سجا کر پیش کریں۔

عنوان

نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں

نوشین رضا.....کوئٹہ

س: میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میری کوئی بہن یا بھائی نہیں ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا گھر میں عجیب و غریب ماحول دیکھا۔ امی بہت طرح دار اور خوش لباس تھیں۔ جبکہ ابو بہت خاموش اور سیدھے سادے تھے۔ ابو امی سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن امی ہمیشہ ناراض رہتی تھیں۔ ان کے رویے میں، ان کی نظروں میں ابو کے لیے واضح نفرت ہوتی تھی۔ امی کے سر میں بھی درد ہو جاتا تو ابو بے چین ہو جاتے۔ خود سر دباتے جبکہ میں نے امی کو کبھی ابو کا خیال رکھتے نہیں دیکھا۔ ابو صبح اٹھ کر اپنے اور میرے لیے ناشتا بناتے۔ اسکول کی تیاری میں مدد دیتے اور مجھے اسکول چھوڑتے ہوئے آفس جاتے۔ امی اطمینان سے سوئی رہتیں۔

امی کے ایک کزن بڑی باقاعدگی سے روزانہ ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ شام کی چائے ہمارے گھر ہی پیتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ شادی شدہ بچوں والے تھے۔ اس کے باوجود وہ آفس سے سیدھے ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ واحد وقت ہوتا تھا جب امی خوش نظر آتیں۔ وہ بنی سنوری، ہلکا ہلکا میک اپ کیے بہت اچھی لگتیں اور انہیں خوش دیکھ کر ہی ہم خوش ہو جاتے۔ میں تھوڑی بڑی ہوئی تو مجھے نظروں کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا۔ ان انکل کی آمد ناگوار گزرنے لگی۔ وہ مجھے مخاطب کرتے تو میں ان کو جواب نہ دیتی۔ امی نے یہ محسوس کر لیا۔ ایک دن انہوں نے میری بہت کلاس لی۔ میں نے بھی جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ ہمارے گھر روز کیوں آتے ہیں، اپنے گھر کیوں نہیں جاتے۔ میں نے ان کے لیے شدید نفرت کا اظہار کیا تو امی نے غصہ سے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ میں بھی آپے سے باہر ہو گئی اور غصہ میں ابو سے جا کر شکایت کی۔ میں نے ابو سے کہا کہ وہ ان انکل کو منع کریں۔ وہ ہمارے گھر نہ آیا کریں۔ ابو کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ابو بہت کچھ جانتے ہیں۔ ابو نے امی سے کہا ''وہ اپنے کزن کو منع کر دیں۔ وہ روز ہمارے گھر نہ آئیں۔ میری بیٹی بڑی ہو رہی ہے، میں نہیں چاہتا اس کے ذہن پر برا اثر پڑے۔''

امی کہاں سننے والی تھیں۔ دونوں کے درمیان سخت جھگڑا ہوا۔ ابو اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے امی سے صاف لفظوں میں سے کہا۔

''تمہیں اپنے کزن اور اس گھر میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر وہ اس گھر میں آیا تو تم اس گھر میں نہیں رہ سکو گی۔''

امی نے کزن کا انتخاب کیا۔ چند دن بعد انہوں نے اپنا سامان زیور وغیرہ سمیٹا اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ وہ رات ابو اور میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ میں فرسٹ ایر کی طالبہ تھی۔ ابو اور میں شرم سے کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ کچھ دن بعد امی نے خلع کا نوٹس بھیجا لیکن اس سے پہلے ہی ابو طلاق کے کاغذات تیار کرا چکے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے طلاق نامہ بھجوا دیا۔ اس کے بعد ابو نے اپنا ٹرانسفر کوئٹہ کرا لیا۔ ہم نے کراچی چھوڑ دیا اور کوئٹہ آ گئے اور یہاں گھر کرائے پر لے لیا۔

ابو کو شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ میں اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔ گھر کا کام بھی مجھے کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے ابو کو زیادہ وقت نہیں دے پاتی تھی۔ ہم نے جن سے گھر کرائے پر لیا تھا۔ وہ بیوہ خاتون تھیں۔ چالیس سال کے لگ بھگ عمر تھی۔ اچھی قبول صورت تھیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی زریں، جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ میری اس سے بہت جلد اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

آنٹی اکثر کھانا پکا کر بھیج دیتیں۔ ابو کی طبیعت خراب ہوتی تو وہی دیکھ بھال کرتیں۔ پرہیزی کھانا پکواتیں۔ ایک بار ابو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ وہ آفس بھی نہیں جا سکے۔ میں ان کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی لیکن اس دن میرا پیپر تھا۔

اگر نہ جاتی تو سال ضائع ہو جاتا۔ میرے جانے کے بعد ابو کے دل میں شدید درد اٹھا۔ انہوں نے فون کر کے آنٹی کو بلایا۔ وہ فوراً انہیں گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئیں۔ پتا چلا کہ انہیں سیویئر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو ان کی زندگی کو خطرہ تھا۔ میں بری طرح ڈر گئی۔ ابو کے سوا میرا دنیا میں کون تھا۔ ننھیال والے تو چھوڑ ہی چکے تھے۔ ددھیال میں ایک چچا تھے، جو خود بھی بیمار رہتے تھے۔ اس دن میں نے پہلی بار سنجیدگی سے ابو کی تنہائی اور ویران زندگی کے متعلق سوچا۔ امی رضوان انکل سے شادی کر چکی تھیں۔ ان کی بیوی نے امی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے انکل نے انہیں علیحدہ گھر میں رکھا تھا۔

میں نے ابو سے بات کی۔ شاید وہ بھی تنہائی سے گھبرا گئے تھے اور ایسا ہی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے آنٹی سے بات کی اور خاموشی کے ساتھ ان کا آنٹی سے نکاح ہو گیا۔ ابو کی زندگی میں بہار آ گئی۔ دنوں میں ان کی صحت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ پہلی بار پتا چلا کس طرح ایک وفادار محبت کرنے والی عورت کا وجود مرد کی زندگی کو جنت بنا دیتا ہے۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ میرا میڈیکل میں داخلہ ہو گیا تھا۔ اب یکسوئی سے پڑھائی کر رہی تھی۔

دو سال گزر گئے۔ ایک دن کالج سے باہر نکلی تو امی کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چار سال بعد میں نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ انتہائی خستہ حالت تھی۔ سستا سا سوٹ پہنے جو اپنا رنگ کھو چکا تھا۔ چہرے پر چھائیاں، آنکھیں ویران..... انہوں نے کہا وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں ان سے باہر نہیں ملنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے کہا، وہ گھر آ جائیں۔

دوسرے ہی دن وہ گھر آ گئیں۔ آنٹی کو میں نے بتا دیا تھا، انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے رسمی دعا سلام کی۔ چائے بسکٹ وغیرہ پیش کیے۔

امی نے بتایا کہ رضوان انکل انہیں چھوڑ چکے ہیں۔ اب نہ ان کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ ہے نہ سر چھپانے کا ٹھکانا ہے۔ وہ کچھ دن اپنے بھائیوں کے گھر رہیں لیکن بھاوجوں کو ان کا وجود گوارا نہیں ہے۔ مجبوراً ایدھی سینٹر میں پناہ لی ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ابو ان سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں دو وقت کی روٹی اور دو جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنا ہو کہ کوئی رشتہ ان کی زندگی میں ہو۔

ابو کو میں نے امی کے آنے کا بتایا تھا تو ان کے چہرے پر دکھ اور نفرت کی جو کیفیت ابھری تھی، اسے دیکھ کر مجھے پتا تھا کہ وہ اس بات کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ ابو کی زندگی ڈسٹرب ہو۔ آنٹی جس طرح ان کا خیال رکھتی تھیں، ان سے محبت کرتی تھیں۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ پھر بھی میں نے ان سے پوچھا، جواب حسب توقع تھا۔ ابو نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا ”جب کسی مرد کی بیوی اس سے بے وفائی کرتی ہے تو اس کی غیرت کو جو دھکا لگتا ہے، وہ اسے اپنی نظروں میں بھی بے وقعت کر دیتا ہے۔ میں نے بہت خاموشی سے بہت کچھ سہا ہے۔ اب جو مجھے حاصل ہے، میں اسے نہیں کھو سکتا۔“

میں نے امی کو ابو کا جواب بتا دیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اس دن کے بعد سے میں شدید پریشان ہوں۔ امی کی آنسو بھری آنکھیں میری نظروں میں گھومتی رہتی ہیں۔ میری بھوک پیاس ختم ہو گئی ہے۔ پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ دو مرتبہ نروس بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر ابو بھی بہت پریشان ہیں۔

ج: اچھی بہن! آپ کے ساتھ جو ہوا، وہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔ آپ کے والد اتنا عرصہ خاموشی سے اپنی بیوی کی بے وفائی دیکھتے رہے، برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی والدہ انہیں خود چھوڑ گئیں۔ اب ان کی زندگی میں محبت اور سکون آیا ہے۔ آپ کی والدہ کی دوبارہ آمد ان کو ایک بار پھر اسی جگہ کھڑا کر دے گی۔

آپ کا اپنی ماں سے خون کا رشتہ ہے۔ ماں کی بربادی پر آپ کا دکھی ہونا فطری ہے۔ اب آپ کو چاہیے خود کو سنبھالیں اور اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ تین سال کی بات ہے آپ ڈاکٹر بن جائیں گی تو اپنی امی کو مالی سہارا دے سکتی ہیں۔ فی الحال آپ اپنے والد سے درخواست کریں اگر ان کی آمدنی میں گنجائش ہو تو وہ آپ کی والدہ کے لیے کچھ ماہانہ مقرر کر دیں۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

درخشاں.....پتوکی

س: میری جلد کھردری اور بے رونق ہے، رنگ صاف ہے لیکن چہرے میں کوئی کشش نہیں ہے۔ میری عمر پینتیس سال ہے لیکن چہرے سے پچاس سال کی نظر آتی ہوں۔ کتنا ہی رگڑ رگڑ کر منہ دھولوں، چہرہ میلا میلا لگتا ہے۔

ج: جلد کو خوب صورت اور شفاف رکھنے کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ آپ ایک صحت مند طرز زندگی اختیار کریں۔ تازہ پھل، سبزیاں اور دودھ دہی کا استعمال جلد کو صحت مند رکھتا ہے۔ شہد کھائیں یا چہرے پر لگائیں۔ یکساں فائدہ مند ہے۔

آج کل سیب کا موسم ہے۔ اپنی غذا میں سیب کا استعمال بڑھا دیں۔ اس کے علاوہ ایک چوتھائی سیب لے کر چھیلیں اور اسے کدوکش کرلیں۔ پھر فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ اب چہرے پر لگا کر پندرہ منٹ کے لیے آنکھیں بند کرکے لیٹ جائیں پھر سادہ پانی سے دھولیں۔ سیب جلد کو سکون بخشتا ہے۔

کینو میں وٹامن سی پایا جاتا ہے جو جلد کے لیے بہترین ہے۔

اسکرب بھی چہرے کے لیے بہت مفید ہے۔ اس سے جلد کے مردہ خلیے صاف ہوجاتے ہیں۔ ایک صحت مند جلد میں ہر اٹھائیس دن بعد نئے خلیے بنتے ہیں اور پرانے ختم ہوجاتے ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ پرانے خلیے جھڑنے کے عمل کی رفتار سست ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے مردہ خلیے جھڑنے کے بجائے جلد پر ہی رہ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے جلد کی رنگت پھیکی پڑجاتی ہے۔ جلد کی رونق ختم ہوجاتی ہے اور وہ کھردری ہوجاتی ہے۔ اسکرب سے جلد کے مردہ خلیے ختم ہوجاتے ہیں اور جلد ہموار، تروتازہ اور پررونق ہوجاتی ہے۔ بازار میں تیار اسکرب ملتے ہیں لیکن ایک اچھا ابٹن بھی اسکرب کا کام کرتا ہے۔

اگر آپ بازار سے اسکرب یا ابٹن نہیں خرید سکتیں تو گھر پر بھی اسکرب تیار کرسکتی ہیں۔

بادام	پانچ عدد
دودھ	پانچ چمچے

باداموں کو دودھ میں اچھی طرح پیس کر پیسٹ بنالیں اور اسے ماسک کی طرح چہرے پر لگا کر نرمی سے گول دائروں کی صورت میں مساج کریں۔ چہرے پر پندرہ منٹ سے زیادہ مساج نہ کریں۔

جو کا آٹا، شہد، لیموں اور بالائی ملا کر بھی اسکرب بنایا جاسکتا ہے۔

ایک ضروری بات۔ دن میں کم از کم بارہ گلاس پانی ضرور پئیں تاکہ آپ کی جلد کو نمی ملتی رہے۔

دھوپ سے بچیں اور زیادہ سے زیادہ تازہ ہوا میں سانس لیں۔ آپ کی جلد شگفتہ اور شاداب رہے گی۔

☆☆